دلّی والے

جلد چہارم

مرتب

اظہار عثمانی

اردو اکادمی دہلی

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

Marfat.com

Marfat.com

دلّی والے

(جلد چہارم)

(دلّی والے سمینار میں پڑھے گئے خاکوں/ مضامین پر مشتمل)

مرتّب

اظہار عثمانی

اردو اکادمی دہلی

Marfat.com

سلسلہ مطبوعات اردو اکادمی، دہلی نمبر ۱۴۰

129532

DILLI WALEY

(Vol. IV)

Edited by

Izhar Usmani

Published by

URDU ACADEMY, DELHI

Print

2007

Rs.120/-

ضابطہ

سنِ اشاعت

۲۰۰۷ء

ایک سوبیس روپے

اے۔آر۔انٹرپرائزز، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اردو اکادمی، دہلی۔سی۔پی۔او۔بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ISBN :81-7121-144-5

Marfat.com

فہرست

۱۔	حرف آغاز	سکریٹری اردو اکادمی	5
۲۔	پیش لفظ	اظہار عثمانی	7
۳۔	صدارتی خطبہ	ریوتی سرن شرما	15
۴۔	کلیدی خطبہ	جی ڈی چندن	18
	شخصیات	**مقالہ / مضمون نگار**	
۵۔	پروفیسر علی محمد خسرو	اختر الواسع (پروفیسر)	21
۶۔	پروفیسر نثار احمد فاروقی	ڈاکٹر اسلم پرویز	25
۷۔	مقیم الدین فاروقی	اسلم جاوید (ڈاکٹر)	36
۸۔	سراج انور	اظہار اثر	42
۹۔	حافظ کریم الدین (کریم ہوٹل والے)	اظہار عثمانی	50
۱۰۔	قاضی سجاد حسین	انجم عثمانی	58
۱۱۔	آنجہانی لالہ شام ناتھ	انور علی دہلوی	63
۱۲۔	حکیم محمد یوسف عرف حکیم کلن	تمیز الدین دہلوی ؒ	69
۱۳۔	حکیم عبدالحمید	تنویر احمد علوی (ڈاکٹر)	76
۱۴۔	پنڈت امرناتھ ساحر	دھرمیندر ناتھ (ڈاکٹر)	84
۱۵۔	محمد مستحسن فاروقی	رضی بدایونی	96
۱۶۔	خواجہ محمد شفیع	رفعت سروش	105
۱۷۔	حاجی محمد فاروق آئیل کلاتھ والے	ریاض عمر (ڈاکٹر)	112
۱۸۔	نیاز حیدر	زبیر رضوی	119
۱۹۔	سکندر بخت	سراج پراچہ	125

Marfat.com

۲۰۔	نواب شبیر میاں (کبوتر باز)	سید ضمیر حسن دہلوی	136
۲۱۔	بیگم حمیدہ سلطان	شاہد ماہلی	143
۲۲۔	مغیث الدین فریدی	شریف احمد (ڈاکٹر)	149
۲۳۔	ارونا آصف علی	شمیمہ بیگم	160
۲۴۔	سعید خاں	صلاح الدین (ڈاکٹر)	176
۲۵۔	پروفیسر محمد مجیب	صدیق الرحمٰن قدوائی (پروفیسر)	180
۲۶۔	نازش انصاری	ظفر انور	186
۲۷۔	شیر سنگھ جین ناز دہلوی	عبدالحق خاں	194
۲۸۔	اشرف صبوحی	عبدالعزیز (ڈاکٹر)	197
۲۹۔	حاجی انیس دہلوی	عبدالغنی	220
۳۰۔	مشیر جھنجھانوی	عفت زرّیں (ڈاکٹر)	230
۳۱۔	مولانا محمد سلمان صابر	غفران احمد	239
۳۲۔	فیاض علی ہاشمی	محمود فیاض (ڈاکٹر)	244
۳۳۔	خار دہلوی	محمد فیروز دہلوی (ڈاکٹر)	255
۳۴۔	جسٹس ویاس دیو مصرا	محمود نقوی	264
۳۵۔	امیر قزلباش	مخمور سعیدی	269
۳۶۔	شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن	مسلم احمد نظامی	282
۳۷۔	بابو پالش والے	مظہر احمد (ڈاکٹر)	291
۳۸۔	سہد راجوشی	معصوم مرادآبادی	302
۳۹۔	میر مشتاق احمد	مودود صدیقی	309
۴۰۔	بادشاہ پہلوان	حاجی میاں فیاض الدین	318
۴۱۔	دیویندر ستیارتھی	نند کشور وکرم	324
۴۲۔	بیگم ممتاز میرزا	نور جہاں ثروت	330
۴۳۔	علامہ راشد الخیری	یونس جعفری (ڈاکٹر)	335

Marfat.com

حرفِ آغاز

دلّی ہمیشہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے عالم میں انتخاب اس شہرِ بے نظیر کی تاریخ و تہذیب، علم و فن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان و ادب کی راجدھانی بھی کہی جا سکتی ہے۔ اسی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کے بطن سے زبانِ دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زیرِ سایہ نشو و نما پا کر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

دلّی کے ساتھ اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیشِ نظر ۱۹۸۱ء میں دہلی اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آج دہلی اردو اکادمی کا شمار اردو کے فعّال ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کوششیں کر رہی ہے، انھیں نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک نیز بیرونی ممالک کے اردو حلقوں میں بھی کافی سراہا گیا ہے۔

اکادمی کے دستورالعمل کی رو سے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئرمین ہوتے تھے، دہلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئرمین دہلی کے وزیرِ اعلیٰ ہو گئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین کا انتخاب دہلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی اور انھیں روبہ عمل لاتی ہے۔ اکادمی اپنی سرگرمیوں میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے دیگر اردو

Marfat.com

اداروں سے بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی اپنی جن گوناگوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کر چکی ہے، ان میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے ایک معیاری ادبی رسالے ماہنامہ ''ایوانِ اردو'' اور ''بچوں کا ماہنامہ امنگ'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

اکادمی عام طور پر اپنی جانب سے منعقدہ سمیناروں میں پڑھے گئے مقالات کو کتابی صورت میں شائع کرتی ہے۔ دلّی والے (جلد چہارم) اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ''دلّی والے (سلسلہ ۴) سمینار کے کنوینر جناب اظہار عثمانی نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اُن دلّی والوں پر خاکے/مضامین تیار کرائے جو اس شہر کی ادبی، سیاسی، سماجی، کاروباری اور تہذیبی زندگی کا ایک اہم حصہ رہے تھے۔ ان مقالات کی ترتیب میں بھی انھوں نے خصوصی دلچسپی لی اور بڑے سلیقے سے قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کے آغاز میں وہ صدارتی خطبہ اور کلیدی خطبہ بھی شامل کیا گیا ہے جو سمینار کے افتتاحی اجلاس میں جناب ریوتی سرن شرما اور جناب جی۔ ڈی۔ چندن نے پیش کیا تھا تاکہ سمینار کی غرض و غایت پر پوری روشنی ڈالی جاسکے۔

ہم جناب اظہار عثمانی کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اکادمی کے اشاعتی ذخیرہ میں بیش قیمتی اضافہ کیا ہے۔

ہم اردو اکادمی دہلی کی چیئرپرسن محترمہ شیلا دکشت کے ممنون ہیں جن کی سرپرستی اکادمی کی کارکردگی میں معاون ہوتی ہے۔ اکادمی کے وائس چیئرمین اور دیگر ممبران کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں جس کا اعتراف ضروری ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ زیرِ نظر کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

مرغوب حیدر عابدی
سکریٹری

Marfat.com

پیش لفظ

''دلّی والے'' سمینار میں تذکرہ وتحریر کے لیے زندگی کے مختلف شعبوں سے ایسی شخصیات کا انتخاب کیا جاتا ہے جو دہلی کی تاریخ میں نہ صرف نمایاں اور اعلیٰ مقام رکھتی ہوں بلکہ سنگِ میل ثابت ہوئی ہوں۔ یہ سمینار اس سلسلے کی چوتھی کڑی ہے۔ اس سے قبل تین سمینار ۱۹۸۶ء، ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۶ء میں منعقد ہوئے۔ جن میں بالترتیب ۳۴، ۴۶ اور ۳۰ خاکے پڑھے گئے۔ اس سمینار میں ۴۰ خاکے پڑھے گئے ہیں۔ سمینار اور خاکوں کی یہ تعداد بہت کم ہے۔ ''دلّی والے'' سمینار ہر سال یا ایک سال چھوڑ کر ہونا چاہیے تاکہ جو اہم شخصیات اس درمیان رحلت کر جائیں ان پر زیادہ معلوماتی اور جامع خاکے پیش کیے جاسکیں۔ اس طرح اگر سب نہیں تو کچھ لوگوں کی خدمات اور احوال قلم بند کر کے آنے والی نسلوں تک پہنچائے جاسکیں گے۔ بقول حالی دلّی میں گوہرِ یکتا کی کمی نہیں ہے جسے انھوں نے اس طرح کہا ہے:

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

خاکہ نگاری دوسری اصناف کی طرح ایک صنف ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں، کیا مشرق اور کیا مغرب، زندگی بھی اب خطِ مستقیم میں چلتی نظر نہیں آتی۔ نئے علوم وفنون نے زندگی کا قماش بھی بدل کر رکھ دیا ہے۔ نئے نظریات، نئے افکار وتصورات نے زندگی کی نت نئی تعبیریں پیش کی ہیں۔ زندگی اور انسان کا تعلق چولی اور دامن جیسا ہے۔ اب انسان کو محض خلاصۂ کائنات نہیں سمجھا جاتا۔ انسان کو انسان کے طور پر جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ نہ محض ''رحمان'' اور نہ محض ''شیطان'' وہ تو روشنی اور تاریکی اور بدی کا مرکب بن کر رہ گیا ہے۔

Marfat.com

صنعتی انقلاب نے جہاں اور بہت سے ادارے پیدا کیے، وہاں آزادی، جمہوریت کا تصور اور متوسط طبقے کو بھی پیدا کیا۔ عام آدمی نے ادب میں مناسب جگہ پائی۔ ناول، افسانہ اور ڈراما اب محض طبقۂ امرا کی جاگیر نہیں رہ گیا۔

خاکہ نگاری اصل میں تاریخ، سوانح اور فکشن ہی کی ایک شاخ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس شاخ کو مغربی ادبیات ہی سے سو فیصدی لے لیا گیا ہو۔ اگر آپ پرانے فارسی اور اردو شعراء کے تذکروں کا بغور مطالعہ کریں تو بعض تذکروں میں خاکہ نگاری کے کچھ عناصر مل جائیں گے۔ مثلاً میر کا تذکرہ، مصحفی کے تذکرے وغیرہ۔ محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' نے تو اس پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ ''آبِ حیات'' تذکرہ کیا ہے، شعرا کی چلتی پھرتی اور جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ آبِ حیات کے تحریر میں آنے تک انگریزی کے وسیلے سے مغربی ادبی اثرات اردو ادب پر واضح طور پر پڑنے شروع ہو گئے تھے۔

بابائے اردو کی ''چند ہم عصر'' خاکہ نگاری کے سلسلے میں ایک اہم سنگِ میل ہے۔ پھر کچھ سال بعد ہی ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی'' فرحت اللہ بیگ نے محض اتفاقاً نہیں لکھی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے خاکے، اردو خاکہ نگاری میں رہنما کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی کے پاس دہلی کی مخصوص البیلی زبان ہی نہیں، بلکہ وہ فن بھی ہے جس میں Inspiration اور Perspiration دونوں کا امتزاج ہے۔ پھر ''نئے ادب کے معمار'' کے عنوان سے بیسویں صدی کے وسط میں جو ترقی پسند شاعروں اور نثر نگاروں نے ایک دوسرے کے خاکے لکھے، اردو خاکہ نگاری کی مقبولیت اور ارتقا کے سلسلے میں ان کا ذکر بے حد ضروری ہے۔ عصمت چغتائی کے ''دوزخی'' اور منٹو کے ''گنجے فرشتے'' نے خاکہ نگاری کو ایک نئی بلندی پر پہنچا دیا۔

ان خاکوں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اچھا، کامیاب اور بڑا خاکہ انسان کو بطور انسان پیش کرنے کا ایک فن ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان گوشت اور پوست کا انسان تو ہوتا ہی ہے مگر اس کی شخصیت کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ خارجی اور داخلی۔ بیرون اور اندرون۔ شخصیت میں لباس و اعضا تو آتے ہی ہیں لیکن اس کا عمل اور ردِ عمل، پسند اور ناپسند، افکار، تصورات، خیالات، احساسات اور جذبات بھی اتنے ہی بلکہ اکثر و بیشتر ''بیرون'' سے زیادہ

Marfat.com

''اندرون'' اہم ہوتا ہے۔

اس ''بیرون'' و ''اندرون'' کو سماج، زندگی اور زمانے کے فریم میں پیش کرتا ہے۔

اکثر خاکہ نگار صاحبِ خاکہ کی شخصیت کے اس پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں، جسے Idosyncrasy کہا جاتا ہے، یعنی شخصیت کا کوئی عجیب تر پہلو۔

اعلیٰ درجے کے خاکے کی شاید یہ سب سے بڑی پہچان ہے کہ اسے پڑھ کر، پڑھنے والے کا دل بے اختیار اس سے ملنے کو چاہنے لگے اور اگر صاحبِ خاکہ اللہ کو پیارا ہو چکا ہے، تو ملنے کی حسرت دل میں پیدا ہو جائے۔

پھر، کیا یہ کہنا ضروری ہے کہ لکھنے والے کے قلم میں زندگی، جولانی اور شادابی ضروری ہے۔ ان خصوصیات کو حسنِ مزاج سے دور نہیں ہونا چاہیے۔ مزاج جو زندگی کی ہر ناہمواری کو ہموار کر دیتا ہے۔ ''دلّی والے'' سمینار میں ان شخصیات پر خاکے لکھے اور پڑھے جاتے ہیں جو دنیا سے کوچ کر گئے ہیں۔ ایسے خاکے جنھیں پڑھ کر یا سن کر بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ وہ خاکے جو دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خاکہ نگار نے شخصیت میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اور وہ شخص جس پر خاکہ لکھا گیا ہے کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔

دہلی کی شخصیات پر خاکوں کی تفصیل میں جانے سے پہلے مناسب ہے کہ دہلی کی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے۔ آیئے دیکھیں کہ دہلی کس طرح اس بلندی کو پہنچی۔

آج دہلی کا شمار دنیا کی خوبصورت ترین دارالحکومتوں میں ہوتا ہے۔ یہ ایک گلدستہ کے مانند ہے جس میں گلشن کے کونے کونے کے خوبصورت پھول چنے ہوئے ہیں۔ یہاں ہندوستان کے ہر خطہ کے افراد ہر مذہب و ملت کے لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔ یہاں دوست ملکوں کے خیر سگالی مشن ہیں۔ مسجد، مندر، گرجا اور گردوارے ہیں۔ پیر و مرشد کی خانقاہیں اور اولیاء اللہ کے مزارات ہیں۔ جدید طرز کی فلک بوس بلڈنگیں ہیں تو اپنے دامن میں قدیمی تہذیب و تمدن سموئے ہوئے تاریخی عمارات بھی ہیں جو آج بھی اپنے دور کی انگنت داستانیں خاموشی کی زبانی بیان کرتی ہیں۔ ان میں قطب مینار، ہمایوں کا مقبرہ، جامع مسجد، لال قلعہ اور جنتر منتر قابلِ ذکر ہیں۔ فنِ تعمیر کے یہ نادر نمونے اس دور سے تعلق

Marfat.com

رکھتے ہیں جب وسائل بہت محدود تھے لیکن جن کے ارادے مستحکم ہوں، جن میں قوتِ پرواز ہو وہ بال و پر نہیں دیکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ قدما کے کارنامے دیکھ کر ہم حیران رہ جاتے ہیں۔ یہ وہ دلّی ہے جسے شاہوں نے سجایا سنوارا اور حسن بخشا۔ یہی وہ دلّی ہے جس کے در و دیوار نے سلاطین کا جاہ و جلال دیکھا ہے۔ دلّی جو شاہوں کے عدل و انصاف کی گواہ ہے۔ اس عظیم دلّی کو نادر شاہ کی لوٹ کھسوٹ بھی پامال نہ کر سکی۔ یہ وہی دہلی ہے جسے انگریز غلامی کی بیڑیاں پہنا کر بھی زیر نہ کر سکے۔ دلّی کتنی ہی بار بسی اور اجڑی تب کہیں اپنی اس لازوال عظمت کو پہنچی ہے۔ دلّی کے بسنے اور اجڑنے کی داستان طویل ہے جو صدیوں سے بار بار دہرائی گئی ہے۔ یہ حسین اور خوبصورت شہر سات بار بسایا گیا۔ آج یہ شہر اتنا بڑا اور وسیع ہے کہ وہ سات شہر اس میں ضم ہو کر رہ گئے ہیں۔ صرف اپنا نام اور نشانیاں چھوڑ گئے ہیں جو قوس و قزح کے ساتھ رنگوں کی طرح دہلی کی روح میں گھل مل گئے ہیں۔ میر نے جس دہلی کے اجڑنے کا ذکر کیا ہے وہ ساتواں شہر تھا۔ اس سے پہلے کے چھ شہروں کا تعارف بھی ضروری ہے۔ تبھی دہلی کے پہلے شہر سے جو نویں صدی میں بسایا گیا تھا آج ۲۰۰۵ء تک کے سفر کا اندازہ ہو سکے گا۔

پہلا شہر:

پہلی دہلی نویں صدی میں تومیر راجپوتوں نے بسائی تھی۔ انھوں نے جنوبی دہلی میں اراولی کی پہاڑیوں پر اپنی حکومت قائم کی۔ اس حکومت کو پرتھوی راج چوہان نے فتح کیا اور یہاں ایک قلعہ تعمیر کرایا جو قلعہ رائے پتھورا کے نام سے مشہور ہوا۔ یہی پہلا شہر تھا جو دہلی کہلایا۔ اس شہر کا رقبہ مہرولی اور بدر پور تک پھیلا ہوا تھا۔

دوسرا شہر:

سلطان علاء الدین خلجی نے ۱۳۰۳ء میں حوض خاص کے علاقے میں ایک شہر آباد کیا جس کا نام شیریں رکھا۔ یہ دوسرا شہر یا دوسری دہلی کہلائی گئی۔ آج بھی حوض خاص کے علاقے میں اس زمانے کی عیدگاہ، نیلی مسجد اور چور مینار موجود ہے۔

تیسرا شہر:

تیسری دہلی تغلق آباد کے نام سے آباد ہوئی اسے ۱۳۲۱ء اور ۱۳۲۵ء کے درمیان

Marfat.com

غیاث الدین تغلق نے آباد کیا۔ یہ علاقہ پہاڑی تھا جو قطب مینار سے آٹھ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ یہ شہر ایک بہت بڑے قلعہ کے اندر بسایا گیا تھا۔ جس کی دیواریں ۱۵ میٹر اونچی تھیں۔ شہر کے جنوب میں پہاڑیوں کو ملاتے ہوئے پانی پر ایک پل بنایا گیا تھا، جہاں بعد میں پانی کے درمیان غیاث الدین تغلق کا مقبرہ بنایا گیا۔ آج بھی تغلق آباد میں اس شہر کے ٹوٹے کھنڈرات موجود ہیں۔

چوتھا شہر:

دہلی کا چوتھا شہر جہاں پناہ کے نام سے محمد بن تغلق نے ۱۳۲۵ء اور ۱۳۵۱ء کے درمیان آباد کیا۔ یہ شہر پہلے اور دوسرے شہر یعنی قلعہ رائے پتھورا اور شیریں کے درمیان بسایا گیا تھا۔ اس شہر کا احاطہ مہرولی کو چھوتا تھا۔ آج بھی اس شہر کی دیوار کے کچھ حصے موجود ہیں جو آئی آئی ٹی، بیگم پوری، کھڑکی مسجد اور چراغ دلی علاقوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

پانچواں شہر:

دہلی کا پانچواں شہر فیروز شاہ تغلق نے ۱۳۵۱ء اور ۱۳۸۸ء کے درمیان بسایا۔ اس شہر کا نام فیروز آباد رکھا گیا۔ جسے کوٹلہ فیروز شاہ بھی کہتے تھے۔ یہ شہر اب تک بسائے شہروں میں سب سے بڑا تھا جو جمنا کنارے بسایا گیا تھا۔ اس شہر میں بڑے بڑے محل، مسجدیں، مینار، سرائے اور باؤلیاں شامل تھیں۔ فیروز شاہ کو شکار کا بہت شوق تھا اس لیے اس نے شہر کے چاروں طرف بہت سی قیام گاہیں بنوائی تھیں جس میں ملچا محل، بھوری بھٹیاری کا محل اور پیر غیب شامل ہیں۔ فیروز شاہ کے وزیر خان جہاں جونو مسلم تھے، انھوں نے سات مسجدیں بنوائی تھیں جن میں ایک مسجد ترکمان گیٹ کے پاس تعمیر کرائی تھی جو آج بھی موجود ہے۔

چھٹا شہر:

یہ شہر شیر شاہ سوری نے بسایا تھا۔ جب شیر شاہ نے دہلی فتح کی تو اس نے ہمایوں کے تعمیر کردہ شہر دین پناہ کو مسمار کردیا اور دین پناہ کے قریب ایک بہت بڑا قلعہ تعمیر کرایا، جو آج بھی پرانے قلعے کے نام سے مشہور ہے۔ اس شہر کے دو بڑے دروازے شیر شاہ دروازہ اور کابلی دروازہ تھے۔ کابلی دروازہ بعد میں خونی دروازے کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کا نام

Marfat.com

خونی دروازہ اس لیے پڑا چوں کہ بہادر شاہ ظفر کے دو بیٹوں کو انگریزوں نے اسی دروازے پر لٹکا کر پھانسی دی تھی۔ یہ دروازہ آج بھی دلّی گیٹ کے پاس مولانا آزاد میڈیکل کالج کے سامنے موجود ہے۔

ساتواں شہر:

دہلی کا ساتواں شہر شاہ جہاں نے بسایا تھا۔ جو شاہجہاں آباد کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی تعمیر ۱۶۴۹ء میں مکمل ہوئی۔ اس سے قبل جتنے بھی شہر بسائے گئے، ان میں اس طرح کا پلان نظر نہیں آتا۔ اس دہلی میں لال قلعہ اور جامع مسجد قابلِ ذکر ہیں۔ اس شہر کی تعمیر گیارہ سال میں مکمل ہوئی تھی۔

دہلی ہمیشہ سے صاحبِ کمال فن کاروں کا خیر مقدم کرتی رہی ہے۔ مغل شہنشاہ و امرا فنکاروں کو انعام و اکرام سے نوازتے تھے۔ دہلی میں جب کوئی فنکار یا صاحبِ کمال آتا تو وہ اپنے فن کا مظاہرہ لال قلعہ میں کرتا، جسے دیکھنے خلقت اُمڈ آتی۔ شہنشاہ اور بیگمات دیوانِ خاص سے نظارہ کرتے۔ اس طرح کے فنکار دہلی آ کر کہیں بھی قیام کرتے، ان کے لیے کھانے کی ایک بینگی صبح اور ایک شام لال قلعہ کے مطبخ سے پہنچ جاتی۔ وہ زمانہ رقص و موسیقی، میلوں، ٹھیلوں اور تہواروں کا دور تھا۔ مذہبی تعصب نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ سیدھی سادی زندگی تھی۔ فنکاروں کی بہت عزت اور قدر و منزلت ہوتی تھی۔ اس دور کے دو واقعات بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ فن کار اپنے فن میں کتنے ماہر استاد ہوتے تھے اور ان کی کتنی قدر ہوتی تھی۔

شاہجہاں آباد میں ایک محفل موسیقی میں کوئی استاد پکھاوج بجا رہے تھے۔ ایک کوہلی ننگ دھڑنگ انگوچھا پہنے جوتیوں میں بیٹھا تھا۔ وہ بار بار پکھاوج کی طرف اشارہ کرتا اور ہاتھ جوڑ لیتا۔ استاد کو یہ بات ناگوار لگ رہی تھی۔ مگر صاحبِ خانہ نے جب کوہلی کی بے چینی حد سے بڑھتی ہوئی دیکھی تو استاد کو اشارہ کیا۔ استاد نے پکھاوج کوہلی کو دے دی۔ کوہلی نے پکھاوج بجانی شروع کی، سازندوں نے الٹ پلٹ کر ساز بجائے تاکہ کوہلی غلط ہو جائے۔ لیکن وہ اپنے فن میں یکتا تھا۔ سازندے ہار گئے مگر کوہلی کو غلط نہ کر سکے۔ آخرکار استاد نے بڑھ کر کوہلی کو گلے سے لگا لیا۔

Marfat.com

ایک صاحب فن شکار پور ضلع بلند شہر کے رہنے والے میر الفت علی تھے۔ وہ بارہ دری میں قیام کرتے تھے۔ ماہر غلیلچی تھے۔ ان کا غلہ کبھی خطا نہ کرتا تھا۔ لال قلعہ کے کئی شہزادے ان کے شاگرد تھے۔ وہ روڑ میں مٹی ملا کر غلہ بناتے تھے۔ جو بہت مضبوط ہوتا تھا۔ اس غلہ سے وہ لوہے کے توے کو توڑ دیتے تھے۔ میر صاحب کو یہ کمال حاصل تھا کہ وہ ایک غلہ آسمان میں پھینکتے جب وہ غلہ بہت اونچا چلا جاتا تو دوسرا غلہ پہلے پر اس طرح مارتے کہ پہلا ٹوٹ جاتا پھر اسی طرح بہت سے غلے، غلوں سے توڑتے چلے جاتے۔ ایک بھی غلہ خطا نہ کرتا یہاں تک کہ آسمان پر مٹی کے بادل چھا جاتے۔

یہ تھے دلّی والے، اب وہ لوگ نہیں رہے۔ وہ شوق بھی باقی نہیں ہیں۔ صرف ان کی یادیں رہ گئی ہیں۔ دلّی والے اس سمینار میں کچھ خاکے/مضامین اسی طرح کے ماحول کا احاطہ کرتے ہیں جو اس دور کی یاد تازہ تو کرتے ہی ہیں ایک سوالیہ نشان بھی چھوڑ جاتے ہیں...کیا حال کی دلّی میں انسانی قدریں زوال پذیر ہیں؟

میں بہت ادب کے ساتھ اردو اکادمی کی چیئرپرسن محترمہ شیلا دکشت کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے نہ صرف اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا بلکہ اردو اور اردو اکادمی کی ترقی کے لیے بھرپور تعاون دیا، جو آج بھی جاری ہے اور انشاء اللہ مستقبل میں بھی جاری رہے گا۔

خاکسار اردو اکادمی کے قیام سے دلّی والے سمینار ۴ تک اکادمی کے انگنت پروگرامس میں شریک رہا ہے...عرض ہے جہاں جناب شریف الحسن نقوی نے اکادمی میں روح پھونکی تھی، وہاں ایک عرصہ سے اکادمی کو ایک ایسے قائد، ناخدا کی ضرورت تھی جو اکادمی میں ایک نیا ولولہ، ایک نئی روح پھونک دے۔ یہ کمی پوری کی اکادمی کے وائس چیئرمین جناب م۔ افضل نے جو ایک زمانے سے اردو کی کاز کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ انھوں نے اکادمی کو اس مقام سے کہیں آگے پہنچا دیا ہے جہاں نقوی صاحب نے اسے چھوڑا تھا۔ میں انتہائی خلوص کے ساتھ ان کا شکر گزار ہوں کہ دلّی والے سمینار کی ذمہ داری انھوں نے مجھے سونپی۔

''دلّی والے'' سمینار کے لیے جو مفید مشورے مجھے ڈاکٹر شریف احمد، ڈاکٹر محمد فیروز

Marfat.com

دہلوی، ڈاکٹر صلاح الدین، جناب سید ضمیر حسن دہلوی اور جناب عظیم اختر نے دیے میں ان کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

''دلّی والے'' اس سمینار کو کامیاب بنانے کے لیے جو تعاون اردو اکادمی کے سکریٹری جناب مرغوب حیدر عابدی اور اکادمی کے دیگر اراکین خصوصاً جناب راغب الدین نے دیا اس کے لیے میں ان سب کا مشکور ہوں۔

جن افراد نے دلّی والے سمینار کے لیے خاکے اور مضامین لکھے اور پڑھے، سامعین جنھوں نے انتہائی سردی میں سمینار میں شرکت فرمائی ان سب کا شکر گزار ہوں۔ خاکوں کی ترتیب خاکہ نگاروں کے نام کے حرفِ تہجی کے حساب سے کی گئی ہے۔

اظہار عثمانی

صدارتی خطبہ

کوئی اچھا موقع ہوتا تھا تو ہمارے گھر میں کتھا کرانے کے لیے پنڈت جی بلائے جاتے۔ عام طور پر ستیہ نارائن کی کتھا ہوتی تھی، جس کے آخر میں پنڈت جی کہتے تھے۔ کتھا سماپت ہوئی۔ دیوتا گن اپنے اپنے استھان کو پدھاریں۔

مجھے پتہ نہیں تھا کہ ایک دن بلایا جاؤں گا اور کہا جائے گا۔ جنھوں نے تین روزہ سمینار میں دلّی کے ستیہ نارائنوں کی کتھا سنائی، ان کا دھنیہ واد کرو اور وداع کرو۔

کچھ بیمار سا تھا اس لیے سب تو نہیں سنیں، آج جن کی باری تھی، ان کی سنی۔ اس لیے سب کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتا لیکن ایک بات کہہ سکتا ہوں۔ شہر عمارتیں نہیں ہوتے، ان میں جو بستے ہیں، وہ، شہر کو وہ ہونے سے بچا لیتے ہیں جو شہر دلّی تب ہوا، جب محمد بن تغلق نے دلّی کو عاق دیا اور جنوب کا رُخ کیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ شہر موجود تھا پر وہ لوگ نہیں تھے جو عمارتوں کو شہر اور شہر کو قابلِ ذکر بناتے ہیں۔

کہتے ہیں پُرش کی مایا اور ورکش کی چھایا اس کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ اس لیے جنھیں ہم شہر کہتے ہیں، ان میں ایسے لوگ اور ورکش ہونے چاہئیں جن کی مایا نظر کو خیرہ کردے اور تمازت کے ماروں کو ٹھنڈک اور ہریالی کی برکت سے معمور کردے۔ تبھی مکان سے زیادہ مکینوں کی اہمیت ہے۔ وہ ہوں تو شہر شہر رہتا ہے ورنہ سڑکوں پر کتے روتے ہیں اور گلی گلیاروں میں بھوت لوٹتے ہیں۔

شہر کے نصیب میں بس ایک نام ہوتا ہے۔ لیکن جو اسے بہت سے نام دیتے ہیں۔ اس کے گلی کوچوں کو ہندسوں کی معرفت جانے جانے سے بچاتے ہیں، وہ اس کے وہ لوگ

Marfat.com

ہوتے ہیں جنھیں لوگ جانتے ہیں، پہچانتے ہیں، ادب سے پرنام اور سلام کرتے ہیں اور وہ جاتے ہوئے وصیت میں اس کے کوچوں کو اپنا نام دے جاتے ہیں۔ تب وہ کوچہ پنڈت بن جاتے ہیں، پھاٹک حبش خاں بن جاتے ہیں، نہر، سعادت خاں بن جاتی ہے اور تراہا بہرام خاں بن جاتے ہیں۔

شہروں کے نصیب میں ایسے نام ہونے چاہئیں، جن سے وہ بھوتوں کا بسیرا نہ لگے۔ اور کچھ انسان ہونے چاہئیں جو رہیں تو مانے جائیں اور نہ رہیں تو یاد کیے جائیں۔ وہ قومیں اور بستیاں بدنصیب ہوتی ہیں جن کے پاس ایسے لوگ نہیں ہوتے یا جو ایسے لوگوں کو یاد نہیں رکھتیں۔ وہ کند ذہن کہلاتے ہیں جو نام یاد نہیں رکھ پاتے۔ اور وہ بے زبان، بے تالو ہوتے ہیں جو ان کی کتھائیں کہہ نہیں سکتے۔ جنھیں دیوی دیوتا، ولی پیمبر، عقل اور فراست کی مورت کہتے ہیں وہ ایسی ہی ہستیاں ہوسکتی ہیں، جنھوں نے ایسا کہایا کیا کہ ان سے قصہ کہانیاں بن گئیں جنھیں جھٹ سے حافظوں نے یاد کرلیا اور بھوج پتر اور کاغذ پر قلم نے تحریر کردیا۔

قلم جن کے پاس نہیں ہوتی، ان کو بہت کچھ یاد نہیں رہتا۔ علم کا بیشتر حصہ ان کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لیے جاتا رہتا ہے۔ جو زبانی ورثہ میں ملتا ہے وہ وقت کے ساتھ مبالغہ، مصلحت، کوتاہ بیانی اور تعصب کا شکار ہوتا چلتا ہے۔

اس لیے قلم سے لکھنا، کندہ کرنا اور جسے دستاویزیت کہتے ہیں، اس کا وقت سے کرنا بے حد ضروری ہے۔ لیکن داخلی تحریک، وحی کی طرح ہوتی ہے۔ کبھی ہوتی ہے، کبھی نہیں ہوتی اور جب ہوتی ہے تو بہت تو ہوتی ہے لیکن قلم بند کرنے کا سامان اور سہولت نہیں ہوتے اور جب یہ میسر ہوتے ہیں تو اکثر بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ چشم دید نہیں رہتے اور شنیدن در شنیدن پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

اس ضمن میں توقع کی سوئی ان اکادمیوں کی طرف جاتی ہے جو تقریباً ہر زبان کے لیے قائم ہو چکی ہیں۔ ان کے پاس وسائل ہیں ان کا Mandate وسیع ہے۔ اگر وسیع النظری ہو، بیدار مغز اراکین ہوں اور شہروں کی آبرو کا پاس ہو تو وہ ان ہستیوں کی دستاویزیت کو اپنے پروگراموں کا حصہ بنا سکتی ہیں، جو ان کے شہروں کی وہ قندیلیں تھے، جو

Marfat.com

بجھ گئیں یا بجھنے والی ہیں یا جن کا کارواں سے ساتھ چھوٹ گیا یا کارواں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ جس انسان نے قبر پر پہلے پہل کتبہ لگایا تھا، اس نے عقلمند کو محض اشارہ دیا تھا کہ ناموروں کو بے نام ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔

خوشی کا مقام ہے کہ اردو اکادمی کے اراکین نے اسے اپنے لیے بھی اشارہ سمجھا اور دستاویزیت کا وہ کام ہاتھ میں لیا جو فرد سے زیادہ اداروں کا کام ہے۔ شکریہ آپ کا جنھوں نے مقالے لکھے اور شکریہ آپ کا جنھوں نے اس کا اہتمام کیا۔

ریوتی سرن شرما

Marfat.com

کلیدی خطبہ

دہلی ایک نہایت قدیم شہر ہے۔ شہر ہی نہیں بلکہ صوبہ اور پردیش ہے۔ اس کا پہلا دیدار ہمیں مہابھارت کے کلاسیک گرنتھ میں ہوتا ہے جس کی اصل تاریخِ تصنیف صرف ان بزرگوں کو معلوم ہے جو اب آسمانوں میں رہتے ہیں۔ اسکولی تاریخ کی جس کا آج ہم اپنے سابق برطانوی حکمراں کی جدت یا علت سے عیسوی کلینڈر دیکھ کرناپ اور شمار کرتے ہیں۔ گزشتہ تمام ۲۰ صدیوں میں اس کا اہم ذکر اور کردار ملتا ہے۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور انشاءاللہ جاری رہے گا۔

اس کا ایک روشن ثبوت دہلی اردو اکادمی کا یہ سمینار بھی ہے جو ایک سلسلے کی کڑی ہے۔

کوئی زمانہ تھا کہ ہمارے کئی اشراف پدرم سلطان بود کے حوالوں سے اپنی صفات بیان کیا کرتے تھے۔ آج وہ انداز بے وقت کی راگنی ہے۔ آج آپ کی پہچان آپ کے اپنے اوصاف اور اعمال ہیں۔ اگر آپ دلّی میں رہتے ہیں تو پھر ایک معیار یہ بھی ہے کہ آپ کتنے دلّی والوں کو جانتے ہیں؟

ہمارے شاعر علامہ اقبال نے آج سے قریب نوے سال قبل، جب ہم غلام تھے، کہا تھا۔

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑادو

انھوں نے اس جدوجہد کی تلقین اس لیے کی تھی کہ ان کے مستقبل کے نقشۂ حیات میں ''سلطانیٔ جمہور'' کا زمانہ آرہا تھا۔

ہماری تحریک آزادی سے واقف سب لوگ جانتے ہیں کہ اقبال کے اس تصور سے

Marfat.com

بہت پہلے ہماری سیاسی قیادت کے ترجمان از خود اسی تصور کے بال و پر گوندھ رہے تھے۔ ان کی قرار دادیں سلطانیِ جمہور ہی کی راہوں کو ہموار کر رہی تھیں۔ غیب کے کسی اشارے اور حریت کے فرشتے کی آواز پر اقبال نے ان موجود اور ان کی ہم رشتہ آئندہ قرار دادوں کے دریا کو اپنے ایک شعر کے کوزے میں پیش کر دیا تھا جو یوں تھا:

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹادو

انھوں نے اس پیغام کو ''فرشتوں کے لیے فرمانِ خدا'' قرار دیا تھا۔

یہ وہ اقبال تھا جو اپنی شاعری کے آغاز ہی میں ''ترانۂ ہندی'' لکھ چکا تھا۔ اسے سن کر اس دور کی نئی نسل ولولۂ وطن سے دیوانی ہوگئی تھی۔ اسے روحِ عصر کا طلسم ہی کہیے کہ اقبال کے تخیل کے اظہار سے قبل ہندوستان اپنی سیاسی قیادت کی کمان میں اسی راہ پر گامزن ہو چکا تھا اور حریت کی اپنی پیاس بجھانے پر آمادہ تھا۔ پنگھٹ کی ڈگر کٹھن تھی لیکن ہندوستان کے رہبران ہمت و جرأت سے ڈگ بھرتے رہے اور آخر ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کی منزل سر کر لی۔

وہ مجاہد رہبران اپنے جہاد کا ثمرہ نئی قیادت کو منتقل کر گئے جو جدوجہد کے دوسرے حصے یعنی سلطانیِ جمہور کے قیام میں جٹ گئی۔ نسلیں بدل رہی ہیں لیکن مضبوط وراثت کے صدقے وہ مشن رواں دواں ہے۔

دہلی اردو اکادمی کا یہ سمینار بھی اسی قافلے کا ایک طائفہ ہے جس میں اردو کا عوام دوست کلچر نمایاں ہے۔ ایسا سمینار ملک کے دانشوروں کو نہ صرف بظاہر گمنام لیکن بباطن کسی سماج پرور مسلک کے لیے وقف افراد پر اپنی نگارشات پیش کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے، بلکہ معاشرے اور وطن کی تعمیر کے اس سلیقے کو بھی فروغ دیتا ہے جو اس تاریخی شہر دہلی کا شعار رہا ہے۔

تعمیرِ وطن کے لیے بنیادی ضرورت ایک جمہوری ذہن کی ہوتی ہے۔ اس ذہن کی تہذیب کے لیے ایسے سمینار بڑے سازگار ہوتے ہیں۔ اکادمی کی رہنمائی کے بعد مقصد کو سر کرنے کا اصل کام خاکہ نگار کو منتقل ہو جاتا ہے۔ اسے قلم کاری کے ساتھ ساتھ دقیقہ سنجی

Marfat.com

اور نکتہ رسی سے بھی کام لینا ہوتا ہے۔ وہ اپنے شخص کی صرف قلمی تصویر ہی نہیں پیش کرتا بلکہ اپنے گمبھیر اور سادہ مزاج جیالے کے اسرار بھی کھولتا ہے۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ اکادمی کی یہ خیال افروز تدبیر ملک کی دیگر اردو اکادمیوں کے لیے چراغِ راہ بن سکتی ہے جو اپنے خطے کے گمنام اور مسلک وقف افراد کے تذکروں کی اس روایت کو ملک گیر اور اردو ادب کے سرمایے کو امیر تر کر سکتی ہے۔

جی۔ ڈی۔ چندن

Marfat.com

پروفیسر علی محمد خسرو

دلّی، دل والوں کی دلّی۔ وہ دلّی کہ جو بھی یہاں آیا، پھر کہیں کا نہ رہا، اسی کو دل دے بیٹھا، اسی لیے شاید اس کا نام 'دل لی' ہے۔ پھر ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے میں دلّی کا کوئی ایک روپ نہیں رہا بلکہ اس نے آٹھ چولے بدلے ہیں اور اپنے زندوں پر تو کبھی کو فخر ہوتا ہے اسے تو ان پر بھی ناز ہے جو اسی کی مٹی کا حصہ بن گئے اور کیوں نہ ہو:

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

دلّی، اہلِ کمال کو ہمیشہ سے اپنی طرف کھینچتی رہی ہے، ان ہی باکمالوں کی طویل فہرست میں ایک نام پروفیسر علی محمد خسرو کا بھی ہے۔ خسرو صاحب جو حیدرآباد، فرخندہ بنیاد کے ایک متوسط جاگیردار گھرانے میں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی شخصیت میں دین و دنیا، خبر و نظر، قال و حال اور فکر و عمل کی جو ہمہ جہتی اور تہذیبی تنوع نظر آتا ہے اس کی تشکیل میں ان کی وراثت نے، جو گھر کے ماحول اور خون میں شامل لاشعوری اثرات سے حاصل ہوتی ہے اور خود ان کے شعوری اکتسابات نے تقریباً مساوی حصہ لیا تھا۔ خسرو صاحب کے آباء صوفی منش اور ان کا خاندان تصوف اور صوفیوں کے ایک طویل سلسلے سے سیراب رہا ہے۔ ان کے نسب نامے میں سرفہرست خواجہ میراں جی شمس العشاق، خواجہ برہان الدین جانم اور خواجہ امین الدین علی اعلیٰ کے نام آج بھی تصوف اور ادب دونوں میں عزت و احترام کے ساتھ لیے جاتے ہیں۔ اس طرح تصوف اور زبان و ادب سے شغف خسرو صاحب کے لاشعور کا حصہ اور ان کے خون میں شامل تھا۔ ان اثرات کے پس منظر میں

Marfat.com

خسرو صاحب نے ایک ایسے خاندان میں آنکھیں کھولیں جو نظام حیدر آباد کے دربار سے وابستہ تھا اور جس کے افراد اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز تھے۔ اس ماحول میں خسرو صاحب کا ذہن جہاں ایک طرف روایتی مستحکم تہذیب و معاشرت کے اثرات جذب کر رہا تھا تو دوسری طرف آنے والی نئی زندگی کے عکس بھی اس پر نمایاں ہو رہے تھے۔ ایک نے ان کے فکر و عمل میں شائستگی اور باضابطگی پیدا کی تو دوسرے نے ان کے فہم و نگاہ کو وسعت آشنا کیا۔ اسی دوران ہی خسرو صاحب کی شخصیت سازی میں شریک اہم ترین عنصر اردو تہذیب، اپنی تمام تر شگفتگی اور شیرینی کے ساتھ کارفرما ہوئی اور اس طرح وہ سنگِ بنیاد نصیب ہوا، جس پر ان کی آئندہ زندگی، طرزِ فکر و عمل اور رویوں کی تعمیر ہوئی۔

خسرو صاحب جب اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ کی لیڈس یونیورسٹی گئے تو وہاں ان کے ذہن و مزاج کو مزید وسعت حاصل ہوئی اور انھیں ہم عصر زندگی کے مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کا ایک نیا تناظر میسر آیا۔ اپنے علم و فن میں یہ ان کا غیر معمولی اختصاص ہی تھا جس کی بنا پر صرف ۳۱ سال کی عمر میں ۱۹۵۷ء میں انھیں عثمانیہ یونیورسٹی کے لیکچرر سے دہلی یونیورسٹی کے اسکول آف اکنامکس میں براہِ راست پروفیسر بنایا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں جب انسٹی ٹیوٹ آف اکنامک گروتھ قائم ہوا تو پہلے وہ اس کے فیلو اور پھر ڈائرکٹر نامزد کیے گئے۔ ۱۹۷۴ء میں وہ ایک بڑے بحرانی دور میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر نامزد کیے گئے۔

تدریس و تحقیق ہو یا حکومت کے زیر اہتمام اقتصادی منصوبہ بندی کے عمل میں سرگرم شرکت جو چیز خسرو صاحب کو دوسروں سے ممتاز کرتی تھی وہ انسانوں اور انسانی معاملات سے ان کی گہری دلچسپی۔ اسی انسانی سروکار کے سبب اقتصادیات کا علم بھی ان کے لیے انسانوں کو سمجھنے اور انسانی حقیقت سے ہم کلام ہونے کا وسیلہ بن گیا تھا۔ انسانوں سے یہی گہری دلچسپی اور انسانی معاملات کو سمجھنے کی یہی طلب تھی جس نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے خسرو صاحب کے دورانِ کار کو حیرت انگیز حد تک رنگا رنگ اور بامعنی بنا دیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے یونیورسٹی برادری کے مختلف طبقوں کے معاملات میں جس گہری ذاتی وابستگی اور شرکت کا مظاہرہ کیا اور جو جمہوری ماحول قائم کیا وہ

129532

یونیورسٹیوں کے انتظام و انصرام کی تاریخ میں ایک علاحدہ باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خسرو صاحب کی مثبت کوششوں کا نتیجہ ہی تھا کہ ایک طویل عرصے سے چلے آرہے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو ان کی سربراہی میں بنی ایک کمیٹی کی سفارشات پر آنجہانی اندرا گاندھی کی حکومت نے تسلیم کرلیا۔ ان کی علی گڑھ میں کی گئی کوششوں کے نتیجے میں مسلم یونیورسٹی کے طلباء کی ایک بڑی تعداد ان کے دورِ سربراہی میں ملازمتوں کے مقابلوں کے امتحانات میں برابر کامیاب ہوتی رہی۔

پروفیسر خسرو مغربی جرمنی میں ہندوستان کے سفیر، وزیر اعظم کی اقتصادی معاملات میں مشاورتی کونسل کے رکن، پلاننگ کمیشن کے ممبر، ریزرو بینک کے ڈائرکٹر، قومی زرعی کمیشن کے پی ایل ۴۸۰ کمیٹی کے چیئرمین، انکٹاڈ اور اقوام متحدہ کے حقوقِ انسانی کمیشن کے ہندوستانی وفود کے متبادل قائد، امریکہ، جرمنی، برطانیہ اور ان گنت قومی و بین الاقوامی دانش گاہوں میں وزیٹنگ فیلو اور پروفیسر رہے۔ آغا خاں فاؤنڈیشن کے ہندوستان میں چیئرمین، قومی مالیاتی کمیشن کے چیئرمین، فائنانشیل ایکسپریس کے ایڈیٹر، ایک درجن کتابوں اور سینکڑوں مقالوں کے مصنف رہے لیکن ہر جگہ خسرو صاحب نے اپنے مثبت و معروضی طرزِ فکر اور رویے کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک ایسے ہندوستانی مسلمان کا ماڈل پیش کیا جسے تمام تر جذباتیت سے پاک ہو کر عقل وفہم کی واضح روشنی میں اپنے مسائل کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کر کے ان کا ٹھوس اور ممکنہ حل تلاش کرنا ہے اور اپنے ملک کے وسیع تر سماجی وتہذیبی تناظر سے وابستہ رہتے ہوئے ملک کی تعمیر وترقی میں حصہ لینا ہے۔

خسرو صاحب کو جو اپنے آپ کو امیر خسرو کی نسبت سے غریب خسرو کہتے تھے، طوطیٔ ہند کی شیریں سخنی کا ایک بڑا حصہ ودیعت کیا گیا تھا۔ یہ شیریں سخنی ان کی ساری شخصیت میں اس طرح سرایت کر گئی تھی کہ ان کے الفاظ کے ساتھ ساتھ ان کی تمام تر حرکات وسکنات اور فکر وخیال میں ایک خاص طرح کی مٹھاس پیدا ہو گئی تھی۔ خسرو صاحب کو دیکھ اور سن کر محسوس و معلوم ہوتا تھا کہ ہند اسلامی اور اردو تہذیب کو انسانی قالب میں ڈھلنا ہو تو وہ یقیناً پروفیسر علی محمد خسرو کی شخصیت ہو گی۔

خسرو صاحب کا نسبتی رشتہ جس روحانی سلسلے سے تھا وہ چشتیہ نظامیہ سلسلہ تھا، انھوں

Marfat.com

نے ارادت وعقیدت کے اس ربط و تعلق کو باقاعدہ و باضابطہ بنایا۔ وہ حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی سے نہ صرف بیعت تھے بلکہ خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی کے صدر بھی تھے۔ انھیں حضرت نظام الدین اولیا، حضرت شاہ نصیرالدین چراغ دہلی اور حضرت امیر خسرو سے غیر معمولی عقیدت تھی۔ اسی لیے انھوں نے اپنا مکان چراغ انکلیو میں بنایا اور اپنی زندگی ہی میں حضرت محبوب الٰہی کے جوار میں باغِ خسرو میں اپنی اور اپنی بیگم مرحومہ زینب خسرو کی قبروں کے لیے جگہ کا انتخاب و انتظام کرلیا تھا اور پھر تقریباً ۴۶ سال کی بھرپور رفاقت کے بعد ۲۴/ اگست ۲۰۰۳ء کو اس لعلِ دکن کے لیے دلّی کے اسی قطعۂ زمین نے اپنا سینہ شق کر کے ان کے جسدِ خاکی کو قیامت تک کے لیے اپنے پاس محفوظ کرلیا اور حضرت نظام الدین اولیا کے دربار میں پہلی دفعہ حاضری پر خسرو صاحب نے حضرت امیر خسرو کا جو شعر نذر کیا تھا کہ:

خسرو غریب است گدا افتادہ در شہر شما
باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

اس کا جواب سلطان جی کی دلّی نے اس طرح دیا کہ اب وہ دکن کے ہو کر بھی سدا دلّی والے ہی رہیں گے۔

□□

Marfat.com

نثار احمد فاروقی

کل کی سی بات ہے نثار احمد فاروقی ہمارے درمیان تھے آج وہ ہم میں نہیں ہیں۔ جس وقت اردو اکادمی، دہلی نے دلّی والے (سلسلہ۔ ۴) کے سہ روزہ سمینار کا منصوبہ بنایا اس وقت یہ بات ہم میں سے کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھی کہ اس سمینار کے ہوتے ہوتے نثار احمد فاروقی بھی اس سمینار کا ایک موضوع بن چکے ہوں گے اور اب ایک اندوہناک صورت حال یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ بھی اس سمینار میں کسی پر اپنا مضمون یا خاکہ پیش کرتے خود ان پر اس سمینار میں خاکہ پڑھا جا رہا ہے۔ نثار احمد فاروقی اردو، فارسی، عربی کے عالم، ہندی اور انگریزی کے ماہر، تصوف کے شناور اور مجلسی زندگی کی جان تھے۔ سینکڑوں حکایات اور لطائف ان کی نوکِ زبان پر، اردو اور فارسی کے ہزار ہا اشعار انھیں اس طرح ازبر کہ ہر موقع و محل کا شعر ہر وقت حاضر۔ غرض یہ توفیق بھی ہر شخص کو کہاں کہ نثار احمد فاروقی کے کمالات فن پر بات ہی کر سکے۔ اس لیے نثار پر بات کرنے کا آسان راستہ یہی ہے کہ ان کے کمالاتِ فن کو ایک طرف رکھ کر صرف ان کی شخصیت اور ذات کے بارے میں دو چار باتیں کر لی جائیں۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے میں نے نثار احمد فاروقی سے بہت کچھ سیکھا ہے لیکن وہ کتنا اور کچھ مجھے یا دوسروں کو سکھا سکتے تھے اس کا اندازہ ان کے ساتھ پچاس برس کی رفاقت کے باوجود آج تک میں نہیں لگا سکا۔

میر تقی میرؔ ابتدا ہی سے نثار کے محبوب شاعر تھے۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ میرؔ اور نثار دونوں میں چند صفات مشترک تھیں یعنی دونوں بے دماغ، آشفتہ سر اور پراگندہ طبع۔ چنانچہ جواں سالی ہی میں میرؔ کے سینکڑوں اشعار ان کے وردِ زبان تھے۔ میں نے میرؔ کے بیشتر اشعار پہلے پہل نثار ہی کی زبانی سنے اور انھیں براہِ راست پڑھنے کا موقع بعد میں ملا۔ ایسے

Marfat.com

ہی اشعار میں میرؔ کا یہ مشہور قطعہ بند بھی ہے اور شاید اسی کے ساتھ نثار کی زبانی میرؔ کے اشعار سننے کا سلسلہ شروع ہوا تھا وہ قطعہ بند یہ ہے:

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسی کا سرِ پُرغرور تھا

کیا یہ قطعہ بند والا معاملہ محض ایک اتفاق تھا یا کچھ اور، اس بات کا سلسلہ میں نے مضمون کے آخر میں ملانے کی کوشش کی ہے۔

دسمبر ۱۹۵۴ء کی بات ہے میں اور ڈاکٹر خلیق انجم علی گڑھ سے تازہ تازہ بی۔اے پاس کر کے دلّی لوٹے تھے۔ دلّی یونیورسٹی میں داخلوں کا موسم جولائی میں شروع ہوتا ہے اس میں ابھی پورے آٹھ مہینے باقی تھے اس دوران اس آزمائش اور تجربے سے گزرنے کا اچھا موقع تھا کہ زندگی گزارنے کے لیے کیا کیا کیا جا سکتا ہے۔ انھی دنوں مشہور فلمی رسالے ماہنامہ ''شمع'' کے دفاتر میں ایک نئے پرچے ہفت روزہ ''آئینہ'' کے اجراء کی تیاریوں کے ساتھ ایک نئی فصلِ گل آئی تو ایک اور قیدی کی صورت میں میں بھی یہاں آ پہنچا۔ نثار احمد فاروقی پہلے ہی اس زنداں کو آباد کیے بیٹھے تھے اور ان کے یہاں سے چھوٹ نکلنے کا فی الحال کوئی امکان نہیں تھا۔ بہر حال ''آئینہ'' کے اجراء کی تیاریوں کا سلسلہ دفتر میں زور و شور سے جاری تھا۔ اس دوران دفتر کے لوگوں میں سے جس شخص نے سب سے زیادہ مجھے اپنی طرف متوجہ کیا وہ یہی نثار احمد فاروقی تھے۔ دفتر کے اس کلرکستان میں مجھے ان کا وجود صحرا میں نخلستان جیسا لگتا تھا۔ انتہائی شائستہ مذاق، پُر لطف گفتگو اور رچا رچایا ادبی ذوق اور اس پر طرفہ تماشا ان کا گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ مزاج۔ غرض ان کی شخصیت کی یہ رنگا رنگ خصوصیات میرے اندر ایک لطیف قسم کا ہیجان اور ولولہ پیدا کرنے کا سامان ثابت ہوئیں۔ میں چوں کہ ابھی خود کو طفلِ مکتب ہی سمجھتا تھا اس لیے اپنی حیثیت کے تناظر میں نثار کو ادبی مذاق کے اعتبار سے ایک مکمل شخصیت کے روپ میں دیکھا تھا لیکن یہ مکمل شخصیت خود اپنے آپ کو کتنا تشنہ اور نا آسودہ سمجھتی تھی میں نے یہ تماشا بھی بار ہا دیکھا

Marfat.com

ہے۔ نثار صاحب کی شیروانی کی جیب میں ایک ڈائری ہوا کرتی تھی۔ اور باتوں کے علاوہ اس ڈائری کا ایک اہم مصرف یہ بھی تھا کہ دوسروں سے سنے ہوئے ایسے اشعار جو انھیں اچھے لگتے تھے فوراً ڈائری میں نوٹ کرلیا کرتے تھے اور اس میں کوئی عرفیؔ، نظیریؔ اور خاقانیؔ کی قید نہیں تھی ایک آدھ بار تو انھوں نے اسلم پرویز تک کا شعر اپنی ڈائری میں نوٹ کر ڈالا تھا۔ بہرحال ادبی مذاق کے اعتبار سے میرا وجود ابھی گندھی ہوئی مٹی کے اس لوندے جیسا تھا جو کمہار کے چاک پر اس انتظار میں گھوم رہا ہوتا ہے کہ کب کمہار کی انگلیوں کا مس اس کے اندر سوئے ہوئے سنگیت کو جگاتا ہے اور اسے گھڑ کر کچھ سے کچھ بناتا ہے۔ یوں تو جیسا تیسا شعر کہنا مجھے چار پانچ برس پہلے ہی اسکول کے زمانے میں آچکا تھا اور بعد میں علی گڑھ کی ہاسٹل کی زندگی میں مزاج کی شوخی اور شرارت کو بھی خاصی دھار لگ چکی تھی لیکن ان کیفیات کے شعری مذاق اور بذلہ سنجی میں ڈھل جانے کے لیے ابھی ایک آنچ کی کسر باقی تھی۔ زندگی کا یہی وہ موڑ تھا جہاں میری مڈبھیڑ اس کیمیا گرِ بذلہ سنجی سے ہوئی جس کا نام نثار احمد فاروقی ہے۔ دراصل جس چیز کو ہم بذلہ سنجی کہتے ہیں اس میں بہت بڑا دخل تربیت اور ریاض کا بھی ہے۔ تربیت انسان کی تقدیر ہے اور ریاض اس کی تدبیر۔ تقدیر اگر چوکھی ہو تو کبھی کبھی تدبیر کے معاملے میں آدمی غفلت بھی برت جاتا ہے۔ میرا معاملہ کچھ ایسا ہی رہا ہے۔ اینگلو عربک اسکول کے زمانے میں میرے فارسی کے استاد سید وزیرالحسن عابدی اور اردو کے استاد مولانا رہبر پرتاپ گڑھی کی شفقتیں یا 'شمع' کے دفتر میں نثار احمد فاروقی، ظ۔ انصاری اور بسمل سعیدی جیسے لوگوں کی وہ قربتیں اور صحبتیں جو آگے چل کر دائمی تعلق کی شکل اختیار کر گئیں اور انجمن تعمیرِ اردو کی مستقل نشستیں گویا میرے لیے تربیت کا سامان فراہم کرتی رہیں۔ آگے چل کر صدیق الرحمٰن قدوائی اور رشید حسن خاں جیسے صلاح کار ہاتھ آئے اور انھی کے ساتھ ساتھ چابک بردار کی حیثیت سے جناب خلیق انجم بھی برابر دوڑانے میں لگے رہے۔ اب جہاں تک ریاض کا معاملہ ہے تو جس طرح اسکول سے بھاگنے والے بچوں کے لیے آج تک کوئی گولی ایسی ایجاد نہیں ہوئی جو پڑھائی میں ان کا جی لگا سکے ٹھیک وہی معاملہ ریاض کا بھی ہے جو ہمیشہ سے انسان کی افتادِ طبع کے رحم و کرم پر رہا ہے۔ مگر بھلا ہو تربیت کے معاملے میں اس بھلی تقدیر کا کہ اس نے مار پیٹ کر آج اس قابل

Marfat.com

تو بنا ہی دیا کہ اکثر 'خط کا مضموں بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر'... معاف کیجیے میں یہاں سطور میں بین السطور کا بکھیڑا لے بیٹھا تو چلیے واپس چلتا ہوں اس ترکیب بند سے ترجیع بند کی طرف یعنی نثار احمد فاروقی۔

''آئینہ'' کی رسم اجراء کے سلسلے میں ایک شاندار جلسہ اور مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس دور کی ادب کی تمام قدآور شخصیتیں، اور وہ دور تھا بھی زیادہ تر قدآور شخصیتوں ہی کا، اس جلسے میں موجود تھیں۔ ان میں کون ایسا تھا جس سے نثار احمد فاروقی واقف نہ ہوں یا نثار احمد فاروقی کو وہ نہ جانتے ہوں۔ نام تو میں نے بھی بہت سوں کے سن رکھے تھے لیکن ہر شخصیت پر اس کے متعلقہ نام کو چسپاں کرنے کا دلچسپ مشغلہ اس محفل میں مجھے نثار احمد فاروقی ہی کے ذریعہ ہاتھ آیا۔ نوکری کرتے فی الواقع ابھی 'جما جما آٹھ دن' ہوئے تھے اس لیے میرے اندر کا وہ 'لڑکا آوارہ منش آزاد سیلانی' ابھی تک زندہ تھا چنانچہ میں اس ادارے کا ادنیٰ درجے کا ملازم ہونے کے باوجود ایک منچلے نوجوان کی طرح اس جلسے میں آٹوگراف بک لیے گھوم رہا تھا۔ اگلی نشست کی ایک کرسی پر ایک صاحب شیروانی پہنے اور اسی کے ساتھ کی ٹوپی لگائے تشریف فرما تھے۔ نثار صاحب نے اشارہ کیا کہ وہ مالک رام صاحب ہیں، ماہرِ غالبیات۔ یہ نام میرے لیے انجانا تھا اور ماہرِ غالبیات کے نام پر تو میں نے علیگڑھ کی پارٹ ون کی اردو کلاس میں اپنے استاد ظہیر الدین علوی صاحب کی زبان سے صرف حالی، بجنوری اور غلام رسول مہر کے نام سنے تھے۔ بہرحال میں اشتیاق اور حیرت کے ملے جلے جذبے کے ساتھ اپنی آٹوگراف بک لے کر مالک رام صاحب کی طرف بڑھا۔ ان سے آٹوگراف کی فرمائش کا ابھی آدھا ہی جملہ میں ادا کر پایا تھا کہ مالک رام صاحب نے ترخ کر جواب دیا 'معاف کیجیے میں اس گوں کا آدمی نہیں ہوں'۔ اس طرح مالک رام صاحب کی دوٹوک شخصیت سے متعارف ہوا۔ میں نے بعد میں نثار صاحب سے پوچھا بھی کہ کیا آپ ان کے مزاج سے واقف نہیں تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہ بات تو میں ان کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ جو بات انھیں گوارا نہیں ہوتی اس کا وہ دوٹوک جواب دیتے ہیں لیکن یہ ان کے بارے میں میں کیا کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کب کس بات کا دوٹوک جواب دے بیٹھیں گے۔ نثار احمد فاروقی کے 'ذکرِ میر' کے اردو ترجمے ''میر

کی آپ بیتی'' کی پہلی اشاعت میں جو ۱۹۵۷ء میں منظر عام پر آئی تھی مالک رام صاحب کا مقدمہ شامل ہے۔ اس بات کو آج اڑتالیس برس ہو گئے۔ ان اڑتالیس برسوں میں نثار احمد فاروقی نے علم کے کوہ گراں کی اور کتنی چوٹیاں سر کر لی ہوں گی اس کا اندازہ کوئی بھی لگا سکتا ہے۔ میں نثار کو دیکھ کر ایک ایسے پرندے کا تصور کرتا ہوں جو انڈے کے خول ہی سے پرواز کرتا ہوا باہر آیا ہو اور یہ تو ہم سب ہی جانتے ہیں کہ نثار احمد فاروقی کوئی اسطور نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت تھے۔

نثار احمد فاروقی کا تعلق امروہہ کے جس گھرانے سے تھا وہ علمی اعتبار سے متمول اور اقتصادی طور پر خود کفیل ہے۔ چنانچہ وہ جب اپنی بقچی بغل میں داب کر دلّی جیسے بڑے شہر کی طرف روانہ ہوئے تو اس سفر کا تمام تر مقصد دیہات اور قصبات سے آنے والے عام لوگوں کی طرح حصولِ تعلیم و معاش ہی نہیں تھا۔ دراصل امروہہ سے تو انھیں بھگا کر لائی ان کی آشفتہ سری۔ ویسے علم اور روزگار کے میدان میں خوب سے خوب تر کی جستجو ایک دانشورانہ نا آسودگی کا خاصہ بھی ہے۔ چنانچہ نثار کی زندگی میں یہ عمل اسی نہج پر جاری رہا۔ میر کی جانب نثار کا جھکاؤ کچھ خواہ مخواہ ہی نہیں ہے۔ دونوں کے مزاج میں کسی درجہ ہم آہنگی ہے۔ میر کی سی بے دماغی اور میر کی سی شورشِ جنوں کے آثار کبھی کبھی اس پراگندہ طبع کے ہاں بھی دکھائی دیتے تھے، لیکن معتقدِ میر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شاید پیروِ غالب بھی تھے اسی لیے ان کی نگاہوں میں دلّی سے آگے جادہ راہ فنا کے علاوہ کوئی افق نہیں، کوئی لکھنؤ نہیں، کوئی حیدرآباد نہیں تھا۔

قلندری کی شان صرف ملنگ بنے رہنے میں نہیں ہے ورنہ یہ بات کیوں کہی جاتی ''اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند'' شاید اپنے مزاج کی فرماں برداری اور فرماں روائی سے بڑی قلندری کوئی نہیں ہے اور نثار نے اپنی ذات کی تمام تر خوبیوں اور کمزوریوں کے ساتھ اسی طرح زندگی گزاری ہے بقول سید انشاء:

کاٹے ہیں ہم نے یوں ہی ایامِ زندگی کے
سیدھے سے سیدھے سادے اور کج سے کج رہے ہیں

مشہور کمیونسٹ لیڈر رگھ دت شرما کمرشل ایمپلائز یونین کے صدر تھے، ان کا دفتر

آصف علی روڈ پر دفاتر ''شمع'' کی بغل ہی میں تھا۔ تو ہوا یوں کہ آخر ایک دن ٹریڈ یونین دفاتر ''شمع'' میں بھی پہنچ ہی گئی۔ اس کے فوری ردِعمل کے طور پر ملازموں کی برطرفی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اسی ریلے میں نثار صاحب بھی معطل کر دیے گئے اور اس طرح کہ ادارہ انھیں کسی صورت واپس لینے کو تیار نہ تھا۔ اس پر لیبر کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ مقدمے کا فیصلہ ہونے تک نثار صاحب مع تنخواہ معطل رہیں گے۔ اسی دوران انھیں دہلی یونیورسٹی لائبریری میں ایک ملازمت مل گئی جو نثار صاحب کے مرتبے کے لائق نہ سہی ''شمع'' کی نوکری سے بہر حال بہتر تھی۔ اب گویا یہ کتابوں کی کھان میں جا بیٹھے۔ لائبریری کو مستفید کرنے والے تو ان سے بہتر اور درجنوں کلرک تھے لیکن خود لائبریری سے حد درجہ مستفید ہونے والے شاید یہ تنہا اسٹاف ممبر تھے۔ نثار احمد فاروقی کبھی لائبریری وقت پر نہیں پہنچتے تھے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ دیر گئے رات تک لالٹین کی روشنی میں بیڑیاں پھونک کر مطالعے میں غرق رہتے، صبح دیر سے سو کر اٹھتے، نہا دھو کر گلی قاسم جان سے بلی ماران کا رُخ کرتے، حویلی حسام الدین حیدر سے تھوڑا آگے چل کر اسی ہاتھ پر حافظ ہوٹل تھا جس میں نثار صاحب ماہانہ ادھار پر کھانا کھاتے تھے۔ کھانا کھا کر چلتے ہوئے کاؤنٹر پر حافظ جی سے تقاضا ہوتا ''لاؤ بھئی حافظ جی دو روپے دینا''۔ حافظ جی یہ دو روپے بھی ان کے ادھار کھاتے میں درج کر دیتے۔ یہ دو روپے نثار صاحب کا دن بھر کا جیب خرچ تھا یعنی بس کا آنے جانے کا کرایہ، بیڑی کا بنڈل اور ماچس اور ایک دوبار کی چائے۔ لائبریری میں نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر خلیق انجم اور میں ہم تینوں کا زیادہ تر وقت ساتھ ہی گزرتا تھا۔ خلیق انجم، نثار صاحب کو اکثر یہ کہہ کر چھیڑا کرتے تھے کہ ''یار امروہے سے جو آتا ہے وہ مصحفی پر ہی کام کرتا ہوا آتا ہے''۔ لائبریری کی بغل میں وینگرز ریستوراں ہوا کرتا تھا جہاں ہم لوگوں کا ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ اس ریستوراں میں امروہہ کے ایک ویٹر تھے شہباز خاں، وہی ہماری خدمت کرتے تھے۔ ایک روز جب ہم چائے پینے گئے تو شہباز خاں نے نثار صاحب سے دریافت کیا ''میاں آپ کے پاس مصحفی کا دیوان ہے کیا''۔ نثار صاحب کی طبیعت ہی اس سوال سے منغض ہوگئی۔ خلیق صاحب نے مزے لیتے ہوئے برجستہ پوچھا ''خاں صاحب آپ کو مصحفی کا دیوان کس لیے چاہیے''۔ خاں صاحب کا جواب تھا ''جی

Marfat.com

مجھے مصحفی پر کچھ کام کرنا ہے"۔ اس بات کا لطف ہم لوگوں نے کس قدر لیا ہوگا اور خاں صاحب کا یہ جواب سن کر نثار کس درجہ بے کیف ہوئے ہوں گے آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔

دلّی یونیورسٹی لائبریری میں نثار صاحب کے ایک سیکشن انچارج تھے سود صاحب۔ دیر سے آنے پر نثار صاحب کے ساتھ ان کی روز کی جھک جھک تھی۔ بڑھتے بڑھتے یہ معاملہ ایک روز یونیورسٹی لائبریری کے لائبریرین پروفیسر داس گپتا صاحب تک پہنچ گیا۔ داس گپتا صاحب انتہائی علم دوست قسم کے انسان تھے۔ وہ نثار صاحب کے علمی مرتبے سے واقف تھے۔ انھوں نے نثار صاحب کو اپنے کمرے سے رخصت کیا اور سود صاحب سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ جب نثار صاحب چلے گئے تو داس گپتا صاحب نے سود صاحب کو سمجھایا کہ اگر ہمارے اسٹاف میں کوئی صاحبِ علم آدمی آ پھنسا ہے تو ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نظم وضبط اور ڈسپلن کے لیے یہ سب کرتے ہیں۔ ڈسپلن کی لکڑی سے ہانکنے کو آپ کے اور بہت سے ماتحت ہیں، نثار صاحب ان سب سے الگ ہیں۔ آپ ان کے لگام نہ کسا کریں۔ سود صاحب اپنا سا منہ لے کر واپس آ گئے اگر ان میں شئے لطیف کا ذرا بھی شائبہ ہوتا تو برجستہ کہہ سکتے تھے "گویا میں انھیں بے لگام چھوڑ دوں"۔ اس دن کے بعد سے سود صاحب نثار صاحب کے دیر سے آنے پر اندر ہی اندر کڑھتے رہتے تھے لیکن منہ سے کچھ نہ بولتے۔ پھر یوں ہوا کہ ایک روز نثار صاحب کچھ زیادہ ہی دیر سے لائبریری پہنچے۔ سود صاحب نے ان سے تو کچھ نہیں کہا انھیں دیکھ کر متواتر دیوار پر ٹنگے گھنٹے کو دیکھتے رہے۔ نثار صاحب نے ان کی اس حرکت پر جھلا کر اپنے امروہوی لہجے میں گھنٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "دیکھ کیا را! گلے میں ٹانگ لے اس کو"۔ دلّی یونیورسٹی لائبریری کے مقابل فیکلٹی آف آرٹس میں شعبۂ اردو کے مسندِ صدارت پر پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اورنگ زیب بنے بیٹھے تھے اور لائبریری کی ایک خستہ حال سی میز کرسی پر نثار احمد فاروقی سرمد صفت براجمان تھے۔ چنانچہ بعض لوگ اسی دہلی یونیورسٹی سے ایسے بھی نکلے جو اورنگ زیب کے سکھائے اور سرمد کے پڑھائے ہوئے تھے۔ یہ لوگ آج بھی ہرے بھرے ہیں اور خوب پھل پھول رہے ہیں۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں "نقل کفر کفر نہ باشد" خواجہ احمد فاروقی یا نثار احمد فاروقی کے دستخط سے دستخط ملا لینا شعبدہ تو ہو سکتا ہے کمال نہیں۔

Marfat.com

جن لوگوں کا علم گہرا ہوتا ہے وہ اپنی علمی معلومات کو ٹریڈ سیکرٹ کی طرح چھپائے نہیں پھرتے بلکہ سورج کی طرح اپنی کبھی نہ ختم ہونے والی روشنی کو برابر تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ دراصل علم پر سوار ہونے اور علم کو اپنے اوپر سوار کرنے کا معاملہ ایک دوسرے سے بالکل جدا ہے۔ جن لوگوں پر علم سوار رہتا ہے وہ اس کے بوجھ تلے دبے آس پاس والوں پر دولتیاں ہی جھاڑتے رہتے ہیں اور جو لوگ شہ سواروں کی طرح علم پر سوار ہو کر چلتے ہیں تو ان کے تو راستے کی گرد بھی طالبانِ علم کی آنکھوں کا سرمہ بن جاتی ہے۔

بسمل سعیدی صاحب کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ بلا کے سخن شناس تھے۔ دلّی میں بے شمار لوگوں نے تو ان سے اس طرح فیض اٹھایا کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔ کچھ اسی قسم کے تجربات سے نثار صاحب بھی گزرتے رہے ہیں۔ نثار احمد فاروقی اور بسمل صاحب کی خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ جوش جیسا شاعر بھی بسمل صاحب کی سخن دانی کا معترف و مداح تھا۔ اب اگر بسمل صاحب جیسا آدمی بھی نثار احمد فاروقی کو علامہ کہے تو کوئی بات تو ہے۔ جب جامع مسجد کے ادبی ٹھکانے، خصوصاً ''چنڈو خانہ'' ایک ایک کر کے ختم ہو گئے تو بسمل صاحب باڑہ ہندوراؤ سے بلاناغہ شام دلّی کالج ہاسٹل علامہ نثار احمد فاروقی کے کمرے پر پہنچتے تھے۔ کچھ اپنی باتوں سے نثار صاحب کو سیراب کرنے اور کچھ ان کی باتوں سے اپنی پیاس بجھانے۔ جب دوستوں کے بے حد اصرار پر نثار احمد فاروقی نے اپنی رسمی تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھایا تو آناً فاناً تمام منزلیں طے کرتے ہوئے پروفیسر اور صدر شعبۂ عربی بن بیٹھے۔ جی ہاں اسی آرٹس فیکلٹی میں خواجہ احمد فاروقی کے بغل والے کمرے میں۔ یہ ویسی ہی صورتِ حال تھی جہاں نادر شاہ کے حملۂ دہلی کے بعد ایک رات ایسی گزری جب نادر شاہ اور محمد شاہ دونوں لال قلعے میں قیام پذیر تھے۔ بقول آنند رام مخلص:

چہ عجب بازیِ شطرنج بچید ست فلک
یک مملکتِ ہند دو خسرو دارد

ایک دوسرے سے متصل یہ شریعت و طریقت کا عجیب سنگم تھا۔ ایک طرف تو خواجہ احمد فاروقی کی شریعت تھی جہاں اس دیارِ رنگ و چمن میں تیمم بھی خلاف شرع تھا اور دوسری طرف نثار احمد فاروقی کی طریقت تھی جہاں لباس برہنگی میں بھی نمازِ عشق ادا ہو سکتی تھی۔

Marfat.com

نثار احمد فاروقی کھانے پینے کے بھی بہت شوقین تھے اور دلّی کے کھانوں کے تو خاص طور پر۔ اور جب وہ دلّی کے ان کھانوں کی بُری گت ہوتے ہوئے دیکھتے تھے تو ان سے نہیں رہا جاتا تھا۔ کچھ دن پہلے کا ذکر ہے دلّی کی نہاری کی بات ہو رہی تھی۔ نثار صاحب نے ایک دم بدمزہ ہوتے ہوئے کہا اب دلّی میں نہاری پکانے والے کہاں رہے، پرانی دلّی میں ہر چوتھی دوکان اب نہاری کی ہے، صبح نہاری، شام نہاری اور نہاری کسی کو پکانی آوے نا۔ ڈھیر مرچیں جھونک دے ویں ہیں کھانے والا سی سی کر کے کھاجاوے ہے پتہ ہی نہ چلتا کہ کیا کھا گیا۔ ایک مرتبہ خلیق انجم اور نثار احمد فاروقی حیدر آباد میں تھے۔ معلوم ہوا یہاں فلاں دوکان پر بڑی عمدہ نہاری ملتی ہے۔ چنانچہ صبح ہی صبح یہ دونوں حضرات وہاں پہنچے اور نہاری کا آرڈر دیا۔ کچھ ہی دیر میں بیرا نہاری لے کر آیا تو ڈھیر سارا شوربہ اور بڑے کا ایک سالم پایہ پلیٹ میں رکھا تھا۔ ان دونوں کو نہیں معلوم تھا کہ حیدر آباد میں اسی کو نہاری کہتے ہیں۔ نثار صاحب نے بیرے کو جو نہاری رکھ چلا گیا تھا آواز دے کر واپس بلایا اور کہا کہ ''دیکھ بھئی اب ہم پھنس گئے ہیں تو اسے کھا لیتے ہیں مگر آئندہ کسی دلّی والے سے نا کہہ دیجیو کہ یہ نہاری ہے''۔

جب سے نثار احمد فاروقی دلّی کے پرانے شہر کو خیر باد کہہ کر اوکھلا میں بٹلہ ہاؤس جا بسے تھے ان سے ملنا بس کبھی کبھار کا رہ گیا تھا لیکن اگر کبھی وہ خاص دوستوں کی دعوت کرتے تھے یا ان کے گھر میں کوئی تقریب ہوتی تھی تو مجھے مدعو کرنا کبھی نہ بھولتے تھے اور یہی دستور میرا بھی تھا۔ دس بارہ سال پہلے میری بیٹی کی شادی ہوئی تو میں نے نثار صاحب کا دعوت نامہ شعبۂ عربی کے پتے پر دلّی یونیورسٹی بھیج دیا۔ ان دنوں وہ شعبۂ عربی سے کچھ غیر حاضر تھے، دعوت نامہ انھیں نہیں ملا اور وہ شادی میں نہیں آسکے۔ مجھے ان کی غیر حاضری کا سخت رنج رہا کہ دیکھیے بلانے پر بھی نہیں آئے۔ ادھر نثار کو کسی سے پتہ چلا کہ اسلم کی بیٹی کی شادی تھی تو انھیں یہ قلق ہوا کہ دیکھو اسلم کی بیٹی کی شادی ہوئی اور مجھے یاد نہیں کیا، حالاں کہ شادی کا دعوت نامہ ان کے شعبے کی ڈاک میں پڑا دھول چاٹ رہا تھا۔ تو ایسے تھے ہمارے تعلقات۔

''بزرگی بہ عقل است نہ کہ بہ عمر'' فارسی کا یہ مقولہ نثار صاحب کے ساتھ رہ کر سمجھ میں

Marfat.com

آیا۔ میں، خلیق انجم، نثار احمد فاروقی، صدیق الرحمٰن قدوائی اور ایسے ہی کئی اور احباب ہم سب عمر کے اعتبار سے لگ بھگ ایک ہی جھول کے ہیں لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ نثار کی مثال تو ایک ایسے پرندے کی سی تھی جو انڈے کے خول ہی سے پرواز کرتا ہوا باہر آیا ہو۔ یہاں شاہ نصیر دہلوی کا ایک قطعہ یاد آتا ہے۔ روایت ہے کہ یہ قطعہ شاہ نصیر نے اس وقت فی البدیہہ کہا تھا جب انھوں نے ایک حسینہ کو اپنے سجے سجائے رتھ پر کہیں جاتے دیکھا تھا۔ رتھ پر بیضوی شکل اور رنگ کا ایک کاٹھ کا گنبد تھا اور اس گنبد پر ایک سنہری کلس جگمگا رہا تھا۔ قطعہ یہ ہے:

اُس کے رتھ کا کلس سنہری دیکھ
شب کہا ماہ سے یہ پروین نے
بہرِ پرواز کیا نکالی ہے
چونچ بیضے سے مرغِ زرّیں نے

اس اعتبار سے نثار ہم میں سے بہتوں سے کافی آگے ہیں اس لیے کہ ہم نے انڈے کے خول سے باہر آ کر جتنا عرصہ پَر پُرزے نکالنے میں لگایا اتنے میں تو یہ طائرِ لاہوتی بن چکے تھے۔

'وقت کوتاہ قصہ طولانی'۔ آخر میں صرف ایک بات اور عرض کر دوں۔ ایک دوست اپنا شعری مجموعہ ترتیب دے رہے تھے۔ نثار صاحب سے گزارش کی کہ اشاعت کے لیے دینے سے پہلے چاہتا ہوں کہ آپ ایک نظر اس مسودے پر ڈال لیتے۔ نثار صاحب نے فرمایا کہ بھائی اب میں شہر چھوڑ کر دور بٹلہ ہاؤس میں جا بسا ہوں کچھ مصروفیت بھی بڑھ گئی ہے اگر یہ ذمہ آپ مجھ پر چھوڑیں گے تو معاملہ لیت و لعل میں پڑ سکتا ہے آپ ایسا کریں کہ اسلم پرویز آپ کے گھر سے بہت نزدیک ہیں وہ بسملؔ سعیدی کے صحبت یافتہ ہیں آپ میری ذمہ داری پر یہ مسودہ ان کو دکھا لیں۔ یہاں صاحب مسودہ کے اطمینانِ خاطر کے لیے نثار صاحب بجا طور پر یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ وہ میرے اور بسملؔ سعیدی کے صحبت یافتہ ہیں مگر نثار کو بھلا اس اعزاز کی کیا ضرورت تھی۔

ہم سب جانتے ہیں کہ نثار احمد فاروقی کی جان ہڈیوں کے کینسر کے موذی مرض نے

Marfat.com

لی۔ میں نے اس گفتگو کے آغاز میں عرض کیا تھا کہ میں نے نثار کی زبانی میرؔ کا جو کلام سنا اس میں شاید سب سے پہلے میرؔ کا یہ قطعہ بند تھا:

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسی کا سرِ پُر غرور تھا

اب ان کے مرض الموت کے کچھ دن پہلے کا ایک واقعہ سن لیجیے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے دفتر اردو گھر میں خلیق انجم، نثار احمد فاروقی اور میں محو گفتگو تھے کہ اچانک ایک نوجوان وارد ہوئے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں اور حیدر دہلوی پر کچھ کام کرنا چاہتا ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ حیدر دہلوی کا کلام دستیاب نہیں ہے۔ حیدر دہلوی کا ایک مقطع میرے حافظے میں کبھی کا پڑا ہوا تھا میں نے کہا کہ سرِ دست حیدر دہلوی کا ایک مقطع سن لیجیے جو مجھے یاد ہے۔ اور یہ کہہ کر میں نے حیدر دہلوی کا وہ مقطع سنا ڈالا۔ یہ مقطع سن کر ان صاحب پر، جو ایم۔ فل، پی ایچ ڈی قسم کے کوئی اسکالر تھے تو کچھ اثر نہ ہوا لیکن نثار احمد فاروقی کے منہ سے بے ساختہ واہ واہ نکل پڑی۔ آج ان کے انتقال کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کیا اس شعر پر ان کے منہ سے نکلی ہوئی یہ بے ساختہ واہ واہ کوئی صدائے غیب تو نہیں تھی۔ حیدر دہلوی کا مقطع یہ ہے:

پسِ صحرا نوردی، ہڈیوں کا ڈھیر ہیں حیدرؔ
کہ میلا ہو گیا تھا جامۂ ہستی اتار آئے

جن لوگوں نے نثار احمد فاروقی کو قریب سے نہیں دیکھا ان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے:

افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

○○

مقیم الدین فاروقی

مقیم الدین فاروقی صاحب سہارنپور ضلع کے ایک چھوٹے سے قصبے ام بہٹہ میں مارچ ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد عربی فارسی کے ایک بڑے عالم تھے۔ فاروقی صاحب کی والدہ کے دادا بہادر شاہ ظفر کے سیاسی مشیر تھے۔ انھیں انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد دلّی میں پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔ آزادی کے لیے جدوجہد کا جذبہ فاروقی صاحب کو نہ صرف اپنی والدہ کی طرف سے ورثے میں ملا تھا بلکہ ان کی دادی کے والد جو دلّی میں کوتوال تھے، ان سے بھی انگریز ناراض رہتے تھے۔ انھیں بھی ۱۸۵۷ء کے بعد دلّی چھوڑنی پڑی اور سہارنپور جانا پڑا۔ فاروقی صاحب کے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ بڑے بھائی کانگریس کے سرگرم رکن تھے۔ وہ بھی ستیہ گرہ کر کے جیل جا چکے تھے۔ وہ خواتین کا ایک ماہنامہ ''خاتونِ مشرق'' بھی نکالتے تھے۔ ان کے بارے میں پولیس کی رائے تھی کہ ''وہ کانگریس کی نقاب میں دراصل کمیونسٹ ہیں''۔

فاروقی صاحب کے والد کا انتقال ۳۵ سال کی عمر میں ۱۹۲۳ء میں ہوگیا تھا۔ فاروقی صاحب نے ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء میں وہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے دلّی آئے اور 'دلّی والے' ہوکر رہ گئے۔ وہ اس وقت درگاہ صابریہ میں رہتے تھے۔ انھوں نے دسویں جماعت کا امتحان اینگلو عربک اسکول (جو اس وقت پٹودی ہاؤس میں ہوا کرتا تھا) سے پاس کیا۔ اس وقت ان کے اسکول کے ساتھی سکندر بخت اور شیخ مختار تھے۔

۱۹۳۴ء میں انھوں نے دلّی یونیورسٹی کے سینٹ اسٹیفن کالج میں داخلہ لیا۔ اس

Marfat.com

وقت یونیورسٹی کے صرف چھ کالج تھے۔ سینٹ اسٹیفن کالج، ہندو کالج، رام جس کالج، کمرشیل کالج جو آج سری رام کالج آف کامرس کہلاتا ہے۔ اینگلو عربک اور لڑکیوں کا اندر پرستھ کالج۔ اس وقت کل طالب علم ۳۰۰۰ کے قریب تھے۔ سینٹ اسٹیفن اور ہندو کشمیری گیٹ، کمرشیل اور رام جس دریا گنج، اینگلو عربک اجمیری گیٹ اور اندر پرستھ کالج مال روڈ جو اب شام ناتھ مارگ کہلاتا ہے پر تھے۔ سینٹ اسٹیفن اور ہندو کو ایجوکیشنل کالج تھے مگر ان میں آدھی درجن ہی طالبات تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ فاروقی صاحب کے اس دور کے دوستوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ نرمل مکھر جی بنگال کے گورنر بنے، ڈاکٹر سروپ سنگھ دلّی یونیورسٹی کے وائس چانسلر، چودھری برہم پرکاش دلّی کے پہلے وزیر اعلیٰ، میر مشتاق احمد چیف ایگزیکٹیو کونسلر، اندر جیت گپتا مرکزی وزیر داخلہ اور لالہ بھرت رام ایک مشہور صنعت کار بن گئے۔ لالہ بھرت رام کو چھوڑ باقی تمام حضرات ترقی پسند تحریک کے ساتھ جڑے رہے تھے۔

سینٹ اسٹیفن کالج میں اس وقت اعلیٰ طبقات کے بچے ہی تعلیم حاصل کرنے آتے تھے، مگر اس وقت فاروقی واحد طالب علم تھے جو کھدر کا لباس زیب تن کر کے تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ مگر کوئی ان کے لباس کو تضحیک کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ کھدر کا لباس اور گاندھی ٹوپی وہ ملک کے آزاد ہو جانے کے بعد بھی ۱۹۶۰ء تک پہنتے رہے۔ فاروقی صاحب ایک مقبول طالب علم تھے۔ کالج کی طالب علموں کی یونین جو اس وقت Criterion Club کہلاتی تھی کے وہ دو بار صدر منتخب ہوئے۔ اس کلب کا قاعدہ تھا کوئی بھی طالب علم دوسری بار نہیں چنا جاتا تھا، مگر وہ اتنے مقبول تھے کہ انھیں دوسری بار بھی صدر چن لیا گیا۔ اس بات پر پرنسپل ایس۔ این۔ مکھر جی بہت چراغ پا ہوئے، مگر جب طالب علموں نے چن لیا تو چن لیا۔

سینٹ اسٹیفن کالج سے انھوں نے ایم۔ اے پاس کیا اور اس کے بعد قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخلہ لیا۔ ۱۹۵۵ء میں انھوں نے کمیونسٹ پارٹی کی ممبر اور خواتین تحریک کی سرگرم کارکن وملا فاروقی سے شادی کی۔ شروع شروع میں وملا جی کی والدہ جو آریہ سماجی تھیں کو شادی پر اعتراض تھا، مگر بعد میں حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ ۱۹۵۷ء میں

Marfat.com

ان کے لڑکے امر فاروقی پیدا ہوئے جو آج کل دلّی یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کے استاد ہیں۔ امر اور ان کی بیگم صحبہ ایک سرگرم سماجی کارکن بھی ہیں۔

فاروقی صاحب کے خیالات اور افکار پر اگر ہم نظر ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی زندگی پر تین تحاریک اثر انداز ہوئیں۔ تحریکِ آزادی اور مہاتما گاندھی، دیوبند اسکول کے اثرات اور مارکسزم۔ گاندھی جی کی سادہ زندگی کے فلسفے پر وہ تاعمر قائم رہے۔ وہ اپنے تمام کام اپنے ہاتھوں سے کرنا پسند کرتے تھے۔ چاہے گھر کی صفائی ہو یا دفتر کی۔ دوستوں کو اپنے ہاتھ سے بنی چائے پلا کر بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ سادگی، خلوص اور محبت کا پیکر تھے۔

فاروقی صاحب نے اپنی پوری زندگی ملک کی آزادی کے حصول اور معاشرے سے استحصال کو ختم کرنے میں لگا دی۔ تحریکِ آزادی کے لیے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں 'تامرپتر' بھی دیا گیا تھا۔ وہ ایک ایسے معاشرے کو تعمیر کرنے کی کوششوں میں اپنی طالب علمی کے زمانے سے لگے رہے جہاں انسان انسان کا استحصال نہ کرتا ہو۔ فاروقی صاحب نے اپنی پوری زندگی اس مقصد کے حصول کے لیے صرف کردی۔ انھوں نے ۱۹۳۶ء سے ہی سیاست میں سرگرم حصہ لینا شروع کردیا تھا۔ اس سال آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم ہوئی جس کی پہلی کانفرنس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے۔ اس کی صدارت محمد علی جناح نے کی تھی جو مسلم لیگ کے صدر تھے۔ فاروقی بھی اس کے سرگرم رکن بن گئے۔ لکھنؤ کی کانفرنس کے بعد دلّی میں بھی اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی گئی۔ اس کی پہلی کانفرنس اینگلو عربک کالج، اجمیری گیٹ میں ہوئی تھی۔ اس میں فاروقی صاحب نے سرگرم حصہ لیا۔ ملک کی سیاست کا یہ وہ وقت تھا جب بائیں بازو کے افکار زور پکڑ رہے تھے۔ دلّی میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی بن چکی تھی اور فاروقی اس سے جڑ چکے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں دلّی کی فیڈریشن کی اکائی کے صدر مقیم الدین فاروقی اور نائب صدر ڈاکٹر سروپ سنگھ منتخب کیے گئے۔

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی۔ انگریزوں کے خلاف عوامی جدوجہد زور پکڑنے لگی۔ سرکار جنگ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے لوگوں سے زبردستی

Marfat.com

چندہ وصول کرنے لگی۔ لوگوں پر اجتماعی جرمانے تھوپنے لگی۔ ملک کے چاروں طرف یہ نعرہ لگنے لگا'' نہ پائی دو، نہ بھائی دو''۔ گاندھی جی نے عوام کے غصے کے پیشِ نظر انفرادی ستیہ گرہ کرنے کا اعلان کیا، جس میں سرکار کو پہلے مطلع کردیا جاتا تھا کہ فلاں شخص فلاں مقام پر سرکار کے خلاف نعرے لگائے گا۔ سرکار آکر اسے گرفتار کرلے۔ ونوبا بھاوے پہلے ستیہ گرہی طے کیے گئے، مگر سرکار نے ستیہ گرہ شروع ہونے سے پہلے ہی ونوبا بھاوے اور جواہر لال نہرو کو گرفتار کرلیا۔ ان گرفتاریوں کے خلاف پورے ملک میں ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

نومبر ۱۹۴۰ء میں اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے انگریز حکمرانوں کی بربریت اور جواہر لال نہرو کی گرفتاری کے خلاف دلّی یونیورسٹی اور اس کے کالجوں میں ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہڑتال بے حد کامیاب رہی۔ سر مارس گائر جو اس وقت دلّی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے نے ہڑتال کے لیڈروں کے خلاف کارروائی کا فیصلہ لیا۔ فاروقی جو ان لیڈروں میں سے ایک تھے انھیں یونیورسٹی سے نکال دیا گیا اور ان کی ایم۔ اے کی ڈگری ضبط کرلی گئی۔ مارس گائر کو یہ کارروائی بہت مہنگی پڑی اس کے بعد وہ جس یونیورسٹی میں گئے وہاں ان کا استقبال کالی جھنڈیوں سے کیا جاتا تھا اور انھیں 'واپس جاؤ' کے نعرے سننے پڑتے تھے۔

فاروقی صاحب ۱۹۴۰ء سے ہی کمیونسٹ تحریک کے ساتھ جڑ گئے تھے۔ وہ دلّی میں کمیونسٹ پارٹی کے بانیوں میں سے تھے۔ وہ ۱۹۴۰ء میں پارٹی کے ہمہ وقتی کارکن بنے اور تازندگی بنے رہے۔ وہ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری چنے گئے۔ تحریک آزادی کے دوران وہ تین بار جیل کی سلاخوں میں بند کیے گئے۔ وہ پچیس سال دلّی کی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری رہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد دلّی پارٹی کا دفتر دریا گنج سے اردو بازار میں آگیا۔ اس دفتر میں فاروقی صاحب نے اپنی زندگی کے تمام روز وشب گزارے۔ آزادی کے بعد بھی انھیں کئی بار قید وبند کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۷۲ء کے بعد انھیں کمیونسٹ پارٹی میں قومی سطح کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ ۱۹۸۱ء میں وہ پارٹی کے مرکزی سکریٹریٹ کے ممبر چنے گئے۔ کئی سالوں تک وہ پارٹی کا تنظیمی جرنل'' پارٹی لائف''

Marfat.com

ایڈٹ کرتے رہے۔ پارٹی کے ہفت روزہ ''حیات'' سے بھی جڑے رہے۔ انھوں نے لاتعداد مضامین، پرچے اور کتابچے تحریر کیے۔ ایک اہم کتابچہ میں اس بات کا تجزیہ ہے کہ کن پالیسیوں کی وجہ سے پاکستان ٹوٹ گیا۔

مقیم الدین فاروقی تاریخ کے طالب علم تھے، مگر انھوں نے تاریخ بنادی۔ وہی دلّی یونیورسٹی جس نے ان کی ڈگری ضبط کرلی تھی اس نے ایک اسپیشل کانووکیشن میں فاروقی صاحب کی ڈگری کو ۴۵ سال بعد ۱۹۸۹ء میں بحال کردی۔ ڈگری کی بحالی ملک کے نائب صدر اور دلّی یونیورسٹی کے چانسلر جناب شنکر دیال شرما کی ایماء پر ہوئی تھی۔ اس خصوصی کانووکیشن میں وائس چانسلر مونس رضا صاحب نے بتایا کہ جب فاروقی صاحب اور دوسرے اسٹوڈنٹس لیڈر ساندھی صاحب کی ڈگریاں ضبط ہوئی تھیں وہ اس وقت علی گڑھ میں پڑھ رہے تھے اور طالب علموں کے ملک گیر احتجاج میں وہ بھی شامل ہوئے تھے۔ انھیں اس بات کی خوشی تھی کہ ڈگریاں ان کی وائس چانسلری کے زمانے میں دی جارہی ہیں۔

فاروقی صاحب نہ صرف ایک انتھک سیاسی کارکن اور اعلیٰ اقدار کے مالک انسان تھے بلکہ ایک بے حد ملنسار شخص بھی تھے۔ اردو بازار میں ان کا دفتر اور رہائش دونوں ہی ایک جا تھے۔ ۱۹۶۲ء میں جب ہند چین سرحدی تنازعے کے بعد آر ایس ایس کے کارکنوں نے پارٹی دفتر پر حملہ کیا اور توڑ پھوڑ کی تب پڑوس کے رضا ٹیلرز نے ان کی بیوی وملا جی اور بیٹے امر فاروقی کو اپنے گھر میں پناہ دی۔

فاروقی نہ صرف اپنی سیاسی ذمہ داریوں کو پورا کرتے تھے، وہ گھریلو اور خاندان کی ذمہ داریوں کو بھی پوری طرح نبھاتے تھے۔ زندگی کے آخری لمحوں تک وہ ایک سرگرم قائد رہے۔ موت سے چند منٹ قبل راجیو گاندھی فاؤنڈیشن میں انھوں نے تقریر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ کمیونسٹ بننے سے قبل نہرو کے مداحوں میں سے تھے۔ جواہر لال نہرو آزادی کے بعد بھی تحریکِ آزادی کی اقدار پر عمل پیرا رہے۔ تحریکِ آزادی کا کلچر تھا ''وطن کو دینا ہے وطن سے لینا کچھ نہیں''۔ ملک کے لیے ہر قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے، مگر آج ملک کا کلچر ہے۔ ''وطن سے لینا ہے۔ وطن کو دینا کچھ نہیں''۔ گاندھی جی نے کہا تھا کہ میرے

Marfat.com

لیے آزادی کا مقصد ہوگا ہر گاؤں اور ہر ایک کے لیے پینے کا پانی مگر آج کے حکمراں گاؤں کے لوگوں کو پانی دینے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ ہماری دلچسپی اس میں ہے کہ لوگوں تک کوکا کولا پہنچایا جائے۔ فاروقی صاحب جب تقریر کر کے منچ سے اترے تو زبردست قلب پر حملہ ہوا۔ انھیں رام منوہر لوہیا اسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹروں نے بڑی کوشش کی کہ قلب کی حرکت پھر شروع ہو جائے مگر ناکام رہے اور فاروقی صاحب ایک نئے معاشرے کی تعمیر کا خواب اپنی آنکھوں میں لیے اس جہاں سے رخصت ہو گئے۔

□□

سراج انور

متناسب قد، چھریرہ بدن، چہرہ گول، آنکھوں میں شوخی ملی ذہانت کی چمک، ہونٹوں پر مسکراہٹ جمائے اور دانتوں میں قلم دبائے ایک نوجوان کی طرف اشارہ کر کے میرے دوست مشہور آرٹسٹ اور فوٹو گرافر نثار بھارتی نے کہا۔

''یہ سراج انور ہیں۔ بچوں کے ادیب کہلاتے ہیں لیکن خود بھی ابھی تک بچے ہیں''۔

میں نے نثار بھارتی کے کچھ کہنے سے قبل ہی اپنا تعارف خود کرایا۔

''میں اظہار اثر ہوں۔ دہلی آئے مجھے ابھی صرف ڈیڑھ مہینہ ہوا ہے۔ رسالہ ''چلمن'' کا ایڈیٹر ہوں۔ اسی کے ساتھ رسالہ ''بانو'' کے ادارتی کاموں میں بھی ہاتھ بٹاتا ہوں''۔

''مجھے آپ سے مل کر رسمی طور پر بے حد خوشی ہوئی''۔ سراج انور نے اپنی شرارت بھری آنکھیں میرے چہرے پر جماتے ہوئے کہا۔ ''کیوں کہ یہ الفاظ کہنا ہماری تہذیب میں شامل ہے چاہے آپ کو کسی سے مل کر خوشی ہو یا نہ ہو۔ ویسے آپ نے اپنا تعارف کرا کے اپنا وقت ضائع کیا ہے کیوں کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے نام سے واقف ہیں۔ کچھ رسالوں کے ذریعے اور کچھ دوستوں کے وسیلے سے۔ لہٰذا اب تشریف رکھیے اور میں دوسری رسم ادا کرنے کے بطور چائے منگاتا ہوں''۔

یہ تھے سراج انور اور یہ ملاقات ہوئی تھی فروری ۱۹۵۰ء میں جب سراج انور کا فوٹو اسٹوڈیو کٹرہ نظام الملک میں اندر کی طرف ایک چھوٹی سی دوکان میں ہوا کرتا تھا۔

سراج بہت باغ و بہار طبیعت کے انسان تھے۔ ہم دونوں جلد ہی بے تکلف ہو گئے

Marfat.com

اور ایک ہفتہ میں ہی ایسے دوست بن گئے کہ میرا زیادہ تر وقت ان کے اسٹوڈیو میں گزرنے لگا۔

ہمارا تعارف کرانے والے نثار بھارتی سنیما کی فلموں کے ''بینر'' بناتے تھے اور دہلی کے ایسے فنکار تھے کہ ہر بڑا ڈسٹری بیوٹر ان کے اسٹوڈیو میں کھڑا رہتا تھا جو اسٹوڈیو کم تھا اور کھنڈر زیادہ۔ اسی کھنڈر کی ایک کوٹھری کو میں نے اپنا دولت خانہ بنالیا تھا جس میں دولت کے علاوہ سب کچھ تھا۔ سراج انور خالص دلّی والے تھے اور میں دہلی میں تازہ واردانِ شہر تھا۔ سراج بچوں کی کہانیاں ادبی ذوق کی تسلی کے لیے لکھتے تھے پیشہ سے وہ فوٹو گرافر تھے اور اپنے بڑے بھائی سید نظام کے ساتھ مل کر اسٹوڈیو چلاتے تھے۔ بے تکلف دوستوں میں بچوں کے ادیب یا بچہ ادیب کے نام سے مشہور تھے۔

سراج انور کی صحیح تاریخ پیدائش کا علم نہیں کیوں کہ اس زمانے میں ماں باپ بچوں کی تاریخ پیدائش لکھنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے ۴ر مارچ ۱۹۹۱ء کو وفات پائی۔ ان کے بیٹے راشد کے مطابق انھوں نے ۵۸ سال کی عمر میں انتقال کیا تھا۔ اس حساب سے ان کی پیدائش ۱۹۳۳ء بنتی ہے لیکن ڈاکٹر خوشحال زیدی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے بچوں کے لیے پہلی کتاب ''پتنگ'' کے عنوان سے لکھی تھی جو لاہور سے شائع ہونے والے رسالے ''بچوں کا باغ'' میں اکتوبر ۱۹۴۳ء میں چھپی تھی اس حساب سے ان کی تاریخ پیدائش ۱۹۳۲ء بنتی ہے۔

پہلی ملاقات کے کچھ دن بعد ہی ہم دوستوں کا ایک گروپ بن گیا جس میں نثار بھارتی، رئیس مرزا، سراج انور اور میں شامل تھے۔ ان ہی دنوں کمیونسٹ پارٹی پر سے پابندی ہٹی تھی اور پورے ہندوستان میں پارٹی اعلانیہ طور پر اپنے نظریات کی وضاحت کرنے لگی تھی۔ دہلی میں پارٹی کا دفتر سراج انور کی دوکان کے بہت قریب اردو بازار میں واقع تھا۔ ہم نوجوانوں کو بھی پارٹی کے پروگراموں میں دلچسپی ہونے لگی تھی اور ہم نے پارٹی پروپیگنڈے کے لیے اپنا ایک سنگنگ اسکواڈ بنالیا جو کمیونسٹ پارٹی کے جلسوں میں انقلابی گیت گاتا تھا۔ سراج انور کی آواز اچھی تھی بلکہ کئی گیتوں کی تو دھنیں بھی انھوں نے بنائی تھیں لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصہ نہ چل سکا چند ماہ بعد ہی سراج انور کے والد سید جلال مرحوم نے

Marfat.com

سراج کو کمیونسٹ پارٹی کے جلسوں میں شریک ہونے سے روک دیا لیکن اس رکاوٹ کے باوجود ہمارے ذاتی تعلقات میں کوئی فرق نہ آیا۔

سراج انور کی زندگی دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ دن میں مقررہ اوقات پر وہ فوٹو گرافی کے کاموں میں مصروف رہتے تھے اور جب اس کام سے فرصت ملتی تو دوکان میں ہی کاؤنٹر پر بیٹھے بیٹھے کہانیاں لکھنے لگتے تھے۔ سراج بہت بذلہ سنج تھے مگر ان کی فطرت میں تھوڑا سا شرمیلا پن بھی شامل تھا۔ وہ بہت کم لوگوں سے بے تکلف ہوتے تھے۔ حسن پرست بھی تھے اور شاید میں ان کا واحد دوست تھا جس کو انھوں نے اپنے ایک معاشقہ کا رازدار بنایا تھا۔ وہ اپنی محبوبہ کو نہایت ادبی قسم کے خط لکھتے اور مجھے ضرور سناتے تھے۔ کبھی کبھی میں مذاق میں کہتا۔

''یار تمھارے یہ ادبی خطوط تمھاری محبوبہ سمجھ بھی لیتی ہے'' اور وہ جواب میں مسکرا کر کہتے ''وہ میری کہانیاں پسند کرتی ہے تو میرے خط بھی سمجھتی ہوگی''۔

میں یہ سوال ان سے اس لیے کرتا تھا کہ اس زمانے میں لڑکیوں کا تعلیمی معیار فلموں کی حد تک ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنے محبت ناموں کی ابتدا اور انتہا کسی فلمی گیت سے کرتی تھیں اور فلموں کے مکالموں سے ہی اپنی محبت کا اظہار کرتی تھیں۔

ہماری ملاقات کے تین چار سال بعد ہی سراج انور کا ایشیا اسٹوڈیو گلی سے نکل کر اردو بازار میں مین روڈ پر آ گیا۔ وہ بہت اچھے فوٹو گرافر تھے۔ شمع کے ادارے سے شائع ہونے والا رسالہ آئینہ میں ان کے بنائے ہوئے فوٹو اکثر چھپتے رہتے تھے۔ مجھے بھی اس زمانے میں فوٹو گرافی کا شوق تھا، اس لیے میں اعتراف کرتا ہوں کہ فن فوٹو گرافی کے بارے میں میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔

ان کا پہلا اور آخری معاشقہ اس لیے ختم ہو گیا کہ محبوبہ اور اس کا پورا خاندان پاکستان چلا گیا اور سراج میں والدین کے سامنے لب کھولنے کی جرأت نہ تھی۔

جون ۱۹۶۰ء میں ان کی شادی ہوگئی جس کے لیے ہم کئی دوستوں نے مل کر ان کے دو سہرے لکھے جن میں سے ایک سہرا رسم کے مطابق نکاح کے بعد پڑھا گیا اور دوسرا سہرا پیروڈی کی شکل میں صرف پرائیویٹ محفلوں میں پڑھا جاتا رہا۔

Marfat.com

سراج انور کی کہانیاں ہندوستان اور پاکستان سے شائع ہونے والے تقریباً تمام بچوں کے رسالوں میں شائع ہوتی تھیں۔ ان دنوں میں آریہ ودت کا ایڈیٹر ہوگیا تھا جو دوسال میں ہی شمع رسالے کے برابر شائع ہونے لگا تھا۔ ان ہی دنوں میرا پہلا ناول ''ناگن'' چھپ کر اس سال کا مقبول ترین ناول بن گیا تھا، لیکن کافی شہرت حاصل ہوجانے کے باوجود کئی معاملات میں مجھے سراج انور پر رشک بھی ہوتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے ڈرامے ریڈیو سے نشر ہونے لگے تھے اور پانچ چھ سال کے عرصے میں میرا صرف ایک مختصر ڈراما آکاش وانی اردو سروس سے براڈ کاسٹ ہوا تھا۔ میں نے بھی ان دنوں بچوں کے لیے کئی کہانیاں لکھی تھیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ شمع کے ادارے سے شائع ہونے والا رسالہ ''کھلونا'' میں ادیبوں کو کہانیوں کا معاوضہ نہیں دیا جاتا تھا۔ میرا ذریعہ معاش چوں کہ قلم ہی تھا اس لیے اس بات پر شمع کے مالکان سے میرا اختلاف ہوگیا اور تقریباً دوسال تک میں نے ان کے لیے کچھ نہیں لکھا۔ اس کے بعد جب انھوں نے ہفتہ وار ''آئینہ'' نکالا تو ان کے لیے لکھنا شروع کیا۔

سراج کے پاس آٹھ ایم ایم کا ایک مووی کیمرہ بھی تھا۔ کئی بار ہم چند دوستوں نے چندہ کر کے اس کیمرہ سے مووی فلمیں بنائیں لیکن پراجیکٹر نہ ملنے کی وجہ سے ہم ایک دوبار ہی اپنی فلمیں دیکھ پائے اور اپنی اپنی احمقانہ اداکاری پر خوب ہنستے تھے۔

ڈاکٹر خوشحال زیدی نے اپنے تحقیقی مقالے میں سراج انور کی کہانیوں اور ناولوں کے بارے میں بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق سراج نے بہت سی کہانیاں اور ناول لکھے ہیں۔

ان کی کہانی تمیں مارخاں کا ٹیلی ویژن اسکرپٹ ان کے انتقال کے کافی عرصہ بعد میں نے تیار کیا تھا۔ اس کہانی کے تین اپی سوڈ دہلی دوردرشن سے ٹیلی کاسٹ ہوئے اس کے علاوہ ان کی کچھ طویل کہانیاں کھلونا بکڈ پو نے کتابی صورت میں شائع کیں۔

ڈاکٹر خوشحال زیدی نے ان کے تین ناولوں کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے جن کے نام خوفناک جزیرہ، کالی دنیا اور نیلی دنیا تھے۔ یہ ناول شمع بکڈ پو نے شائع کیے تھے لیکن سراج انور نے صرف بچوں کے لیے ہی کہانیاں اور ناول نہیں لکھے تھے انھوں نے بڑوں کے لیے

Marfat.com

بھی بہت کچھ لکھا ہے جن میں سے دو ناول تو پہلے رسالہ ''بیسویں صدی'' میں قسط وار شائع ہوئے پھر مکتبہ بیسویں صدی نے ہی انھیں کتابی شکل میں چھاپ لیا۔ ان میں پہلا ناول ''شیشے کی چٹان'' تھا اور دوسرے ناول کا نام ''آغوش'' تھا۔ یہ دونوں ناول بہت مقبول ہوئے۔

خوشحال زیدی نے سراج انور کا تعارف کراتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''سراج انور نے گوناگوں موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے، لیکن ان کا خاص میدان سائنس فکشن ہے۔ اپنی سائنسی کہانیوں اور فنطاسیوں میں سراج انور نے مافوق الفطرت واقعات اور کرداروں کو بھی اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ وہ حقیقت پسند اذہان کو بھی مانوس لگتے ہیں''۔

یہاں میں ایک بات واضح کرنا چاہوں گا۔ اور وہ یہ کہ ہمارے اردو کے محقق اور نقاد فنطاسی اور سائنس فکشن کے فرق کو نہیں پہچانتے۔ ان کے لیے ہر فنطاسی سائنس فکشن ہوتی ہے جب کہ ایسا نہیں ہے۔ فنطاسی پڑھنے میں یقیناً سائنس فکشن محسوس ہوتی ہے لیکن وہ اصل سائنس فکشن کے زمرے میں نہیں آتی۔ دونوں کے درمیان اہم فرق یہ ہے کہ فنطاسی میں ہر طرح کے مافوق الفطرت کردار یا حالات تخلیق کیے جا سکتے ہیں لیکن سائنس فکشن میں تخلیق کی آزادی محدود ہوتی ہے۔ مافوق الفطرت کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز فطرت سے مختلف ہو لیکن سائنس میں کوئی چیز فطرت سے بالا یا جدا نہیں ہوتی۔ کسی بھی سائنسی کہانی میں آپ ان حدوں کو پار نہیں کر سکتے جو کسی مخصوص سائنس کے تعلق سے لکھا جا رہا ہے۔ اس کے کرداروں اور واقعات کا سائنس کے بنیادی نظریوں سے وابستہ رہنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی لیے جو ادیب سائنس سے دلچسپی نہیں رکھتے وہ فنطاسی کو ہی سائنس کا انداز دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ کافی عرصہ سے سائنسی فلمیں بھی بنائی جا رہی ہیں۔ خاص طور سے بہت سی انگریزی فلمیں سائنس کے نام پر شہرت حاصل کر چکی ہیں جب کہ وہ فنطاسی اور سائنس کا امتزاج کہی جا سکتی ہیں۔ اصل سائنس فکشن پر صرف چند فلمیں بنی ہیں جن میں پہلی فلم آرتھر سی کلارک کے ناول پر مبنی ''اسپیس اوڈیسی'' کے نام سے بنائی گئی تھی اس کے بعد دوسری فلم ''اسٹار وار'' بنی جو بے حد مقبول ہوئی اور تیسری فلم ''جوراسک پارک'' تھی۔

Marfat.com

یہ تمام فلمیں سائنس فکشن کی شرطوں پر پورا اترتی ہیں۔ اگر چہ ان میں بھی کہیں کہیں فنطاسی کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے۔ اسی دوران ایک سائنسی فلم ای۔ ٹی (E.T) کے نام سے آئی تھی جو کائنات کے کسی دوسرے سیارے سے آئی مخلوق کے ایک کیرکٹر پر بنائی گئی تھی۔ اسی فلم کے کردار کو پروڈیوسر راکیش روشن نے اپنے بیٹے کی فلم ''کوئی مل گیا تھا'' میں استعمال کیا تھا۔ اس کے علاوہ جتنی سائنسی فلمیں بنائی گئی ہیں ان میں ایک ہی سائنسی نظریہ کو بنیاد بنایا گیا ہے یعنی کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہماری دنیا پر حملہ کرتی ہے یا کوئی نیم دیوانہ سائنس داں حشرات الارض کو سائنس کی مدد سے خوفناک حد تک بڑا بنا دیتا ہے جو نسل انسانی کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں۔

اردو ادب میں سائنس فکشن بہت کم لکھا گیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ انگریزی میں بھی سائنسی ناول اور کہانیاں لکھنے والے بہت کم ادیب ہیں۔ جن میں آرتھر سی کلارک اور آئزک ایسی موف کے نام پیش پیش ہیں۔

یہ وضاحت میں نے اس لیے ضروری سمجھی ہے کہ ڈاکٹر خوشحال زیدی نے سراج انور کی فنطاسی کہانیوں کو سائنس فکشن مان لیا لیکن سراج انور کی اصل سائنسی تخلیق کا کہیں ذکر بھی نہیں کیا۔

۱۹۵۰ء کی دہائی میں سراج نے ایک سائنسی ریڈیو ڈراما ''خلیفہ شدو'' کے نام سے لکھا تھا جو نشر ہونے کے بعد اس قدر مقبول ہوا تھا کہ اس کیرکٹر پر ان سے اور بہت سے ریڈیائی ڈرامے لکھوائے گئے۔ یہ ڈراما سائنس کے اصل بنیادی نظریہ پر لکھا گیا تھا اور اس کی دوسری اہم خوبی یہ تھی کہ اس میں دہلی کے کرخنداروں کی زبان استعمال کی گئی تھی۔ سراج انور دہلی کے اصل باشندے تھے اس لیے دہلی کی کرخنداری زبان ان سے بہتر کون لکھ سکتا تھا۔ اس ڈراما میں انھوں نے دکھایا تھا کہ خلیفہ شدو نام کے ایک کرخندار اپنی بیگم کے ساتھ چاند پر جانے کا پروگرام بناتے ہیں۔ چاند پر جانے کے لیے وہ تخت کے چاروں پایوں سے آتشبازی کے خنگے باندھ کر اڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہی اس ڈراما کا سائنسی پہلو تھا باقی لطف اس زبان کا تھا جو خلیفہ شدو اور ان کی بیگم استعمال کرتے ہیں۔ کرخنداری زبان میں میاں بیوی کے مکالمات نے ڈراما کو بے حد دلچسپ بنا دیا تھا۔ اس ڈراما کی اصل

اہمیت یہ تھی کہ اس زمانے میں عام آدمی چاند پر جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔صرف سائنسداں یہ جانتے تھے کہ ایک بار وہ خلا میں پہنچ جائیں تو چاند پر جانا آسان ہو جائے گا اور حقیقت میں یہی ہوا۔ پہلے انسان خلاء میں پہنچا اس کے پندرہ بیس سال بعد چاند پر جا اترا۔

بات سراج انور کے سب سے مقبول اور سب سے بڑے سائنسی کارنامے یعنی ان کے ریڈیائی ڈرامے خلیفہ شدو کی ہو رہی تھی۔زبان اور خیال کے اعتبار سے میں ان کے اس ڈراما کو ان کا سب سے بڑا تخلیقی شاہکار مانتا ہوں۔ان تخلیقات کے علاوہ سراج انور نے کئی جاسوسی ناول بھی لکھے ہیں۔شروع میں رسالہ مجرم کے لیے انھوں نے دو جاسوسی ناول لکھے تھے اس کے بعد رسالہ ''قلزم'' کے لیے کئی ناول لکھے یعنی انھوں نے بچوں کے ادب میں خصوصی پہچان بنا کر ادب کی دوسری اصناف میں بھی اپنی تخلیقی قوت کے جوہر دکھائے اور ہر صنف میں کامیابی اور شہرت حاصل کی۔انھوں نے بہت سے ''کامکس'' بھی لکھے اور ''بچوں کا شعری ادب'' اور ''بچوں کا نثری ادب'' جیسے تحقیقی مقالے بھی تحریر کیے۔ ان کے کارناموں کے صلے میں ان کو آل انڈیا چلڈرن ایجوکیشن سوسائٹی دہلی اور اردو اکادمی، دہلی نے انعامات سے نوازا۔افسوس صرف یہ ہے کہ اردو اکادمی کا ایوارڈ ان کو پس ازمرگ دیا گیا۔

تقریباً ۴۵ سال وہ ادبی خدمت کرتے رہے۔اس کے ساتھ ہی ان کے بنائے ہوئے فوٹو بھی ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ جتنے مشہور ادیب تھے اسی قدر فوٹوگرافی میں بھی ماہر تھے۔میرے لیے ان کا انتقال بھی ایک افسانے کے ٹریجڈک اختتام کی طرح ہوا۔ان کے انتقال سے صرف ایک ہفتہ پہلے میں اردو بازار میں اپنے دوست رشید آرٹسٹ کے انڈیا آرٹ اسٹوڈیو میں بیٹھا تھا وہیں سراج انور آ گئے۔ان دنوں میں نیو رنجیت نگر میں رہنے لگا تھا۔اس لیے جامع مسجد کبھی کبھی ہی جانا ہوتا تھا۔ہم دونوں عرصہ کے بعد ملے تھے اس لیے خوب بغل گیر ہو کر ملے اور بے تکلف دوستوں کی طرح ایک دوسرے کو برا بھلا بھی کہا پھر بیٹھ کر سنجیدہ گفتگو کرنے لگے۔اسی مہینے ہمارے ایک مشترکہ دوست کا انتقال ہوگیا تھا۔اس دوست کے انتقال پر تبصرہ کرتے

Marfat.com

ہوئے سراج انور نے فلسفیانہ لہجہ میں کہا۔

''یار اس زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ محمد احمد نہیں رہے۔ بھائی نورو چل بسے۔ سارے دوست ایک ایک کرکے رخصت ہوتے جارہے ہیں''۔

میں نے ہنس کر کہا ''یار موت سے کسے مفر ہے ایک دن جانا تو سب کو پڑے گا''۔

''ٹھیک کہتے ہو''۔ سراج انور سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب آج ہم ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے باتیں کررہے ہیں لیکن ایک دن میں سن لوں گا کہ اظہار اثر نہیں رہے یا تم سن لوگے کے سراج انور چل بسے''۔

آج ایسا لگتا ہے کہ اس روز یہ الفاظ ان سے کوئی غیبی طاقت کہلوارہی تھی کیوں کہ ایک ہفتہ بعد ہی میں نے اخبار پڑھا تو اس میں سراج انور کے اس دنیا سے رخصت ہونے کی خبر چھپی تھی۔ یہ خبر پڑھ کر میرے دل کو دھکا سا لگا اور ان سے صرف ایک ہفتہ پہلے کی ملاقات یاد آگئی۔ افسوس یہ ہے کہ ان کی موت کی خبر مجھے ایک دن بعد اخبار کے ذریعہ ملی۔ آج دہلی کی مصروف زندگی اور فاصلوں نے تمام انسانی رشتوں کو بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے آج سب ایک دوسرے سے بے تعلق ہوگئے ہیں۔ کسی نے مجھے ان کی موت کی خبر تک نہیں دی۔ میں نے خبر پڑھ کر فوراً اپنے دوست رشید آرٹسٹ کو فون کرکے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ ہماری آخری ملاقات کے چوتھے روز ہی اچانک حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کرگئے تھے۔

سراج انور مرنے کے بعد اپنی تخلیقی تحریروں کا کافی اثاثہ چھوڑ گئے ہیں اس کے علاوہ ان کے دو بیٹے طارق اور راشد اور دو بیٹیاں ان کی یادگار رہ گئے ہیں۔ دونوں بیٹوں نے اب ان کا فوٹوگرافی کا کاروبار سنبھال لیا ہے۔ میری دعا ہے کہ ان کے یہ بچے بھی اپنے والد کی طرح شہرت حاصل کریں۔

□□

Marfat.com

حافظ کریم الدین
(کریم ہوٹل والے)

آج میں ایک ایسی شخصیت کا تعارف کرانے جارہا ہوں جن کے آباءواجداد بادشاہ بابر کے زمانے سے بہادر شاہ ظفر کے آخری دور تک مغل باورچی خانے کے نگراں، منتظم، باورچی اور شیف رہے۔ میں اس شخص کا ذکر کرنے جارہا ہوں جس نے اپنا بچپن لال قلعہ میں گزارا، جس نے پہلی جنگِ آزادی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ ۱۸۵۷ء کی وہ جنگِ آزادی جسے غدر کا نام دیا گیا۔ میں اس انسان کی بات کروں گا جو انگریزوں کے ظلم وستم کا چشم دید گواہ تھا۔ وہ شخص جس نے ہندوستان کو آزاد ہوتے ہوئے دیکھا، جس نے ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو لال قلعہ پر ہندوستانی پرچم لہراتے ہوئے دیکھا تو خوشی سے اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ یہ وہی لال قلعہ تھا جہاں سے وہ اپنے باپ کے کندھے پر بیٹھ کر فرار ہوا تھا اور کسی گوشۂ عافیت کی تلاش میں ان کا خاندان مارا مارا پھرا تھا۔ وہ شخص جس نے اپنی جوانی کے ۵۴ سال گمنامی یا اگیات واس میں گزارے تھے۔

میرا مطلب کریم ہوٹل کے بانی جناب حافظ کریم الدین قریشی سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حافظ کریم الدین کو طویل عمر سے نوازا۔ ان کی پیدائش ۱۸۵۲ء میں ہوئی تھی اور ۱۹۶۸ء میں وفات پائی۔ انھوں نے ۱۱۶ سال کی عمر پائی۔

حافظ کریم الدین نے پانچ سال کی چھوٹی عمر میں مغل بادشاہ کے تزک واحتشام سے متاثر ہوکر یہ خواب دیکھے تھے کہ وہ اپنے بزرگوں کی طرح شہنشاہ اور درباریوں سے اچھا کھانا بنانے کی تعریف وتوصیف حاصل کریں گے، مگر ان کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ

Marfat.com

ہو سکے۔ بقول شاعر:

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

حافظ کریم الدین کی نگاہوں کے سامنے سب کچھ لٹ گیا، مگر انھوں نے اپنے خواب نہ لٹنے دیے۔ انھیں اپنی پلکوں پر سجائے رہے۔ بس انھوں نے اس کی تعبیر بدل دی۔ حافظ کریم الدین نے عہد کیا کہ وہ مغلئی کھانوں کو اسی طرح پکائیں گے، وہی خوشبو، وہی ذائقہ اور وہی دستر خوان ہوگا، مگر وہ شاہوں کے لیے نہیں بلکہ عوام کے لیے ہوگا۔

حافظ کریم الدین کی بابت تفصیل میں جانے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ دہلی اور اس دور کا مختصر ذکر کروں جب کریم ہوٹل کا قیام عمل میں آیا اور شاہی دربار کے مرغن مغلئی کھانوں کو حافظ کریم الدین نے عوام تک پہنچایا۔

۱۵۲۶ء میں مغل بادشاہ بابر نے ہندوستان فتح کیا اور یہاں مغل دور کا آغاز ہوا۔ بابر نے آگرہ کو اپنی سلطنت کا دارالحکومت بنایا، لیکن شاہجہاں نے ۱۶۵۰ء میں دارالحکومت آگرہ سے دہلی منتقل کر دی۔ آج دہلی کا شمار دنیا کی چند خوبصورت ترین دارالحکومتوں میں ہوتا ہے۔ جس کا متبادل ہندوستان کا کوئی دوسرا شہر نہیں ہو سکتا۔ دہلی کی عظمت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس شہر کی آبادی ایک کروڑ پچیس لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔

دہلی کی مٹی اور آب و ہوا میں کچھ ایسی کشش، جاذبیت اور اپنائیت ہے کہ خلقت دور دراز سے کھنچی چلی آتی ہے۔ جو بھی یہاں آیا بس یہیں کا ہو رہا۔ دہلی میں آنے والے افراد کے قیام و طعام کے لیے یہاں مسافر خانے، دھرم شالائیں اور ہوٹل اتنی بڑی تعداد میں ہیں جن کا شمار مشکل ہے۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ ڈھابے سے لے کر پانچ ستارہ ہوٹل تک اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ اکثر ہوٹلوں کو مہمانوں کی کمی کا شکوہ رہتا ہے۔ جامع مسجد کے علاقہ میں تو ہوٹلوں کی اتنی زیادہ تعداد ہے جنھیں دیکھ کر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ ان لوگوں کا کاروبار کس طرح چلتا ہوگا، لیکن چھوٹا بڑا کوئی ہوٹل ہو، رات بارہ بجے تک دیگ اور پتیلے اس طرح خالی ہو جاتے ہیں جیسے انسان نہیں جنات سارا کھانا چٹ کر گئے ہوں۔

جامع مسجد کے علاقہ کا کریم ہوٹل مغلئی کھانوں کے لیے نہ صرف دہلی، ہندوستان بلکہ بہت سے ممالک میں مشہور ہے۔ یہ ہوٹل ہی آج میرا موضوعِ سخن ہے۔ کریم ہوٹل یا کریم

Marfat.com

ہوٹل کے بانی حافظ کریم الدین کی بابت تفصیل بیان کرنے سے پہلے ایک نظر ہوٹلوں کی تاریخ پر بھی ڈال لیں۔

دلّی والوں کی مہمان نوازی مشہور اور مثالی ہے۔ یہاں ہر فرد کے پاس مہمانوں کی آمد رہتی ہے۔ وہ چاہے مزدور، جھلی والا ہو، فٹ پاتھ پر رہتا ہو، تاجر، سیاست داں یا ملازم پیشہ ہو۔ یہاں سرکاری مہمان، حکومتوں کے نمائندے اور سربراہ بھی آتے ہیں۔ اگر ہم تاریخ کے اوراق پلٹیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب دہلی میں کوئی ہوٹل نہیں تھا۔ دہلی کیا دنیا میں ہوٹلوں کا چلن ہی نہیں تھا، مگر اس دور میں بھی مسافروں کے قیام و طعام کا مناسب انتظام ہوتا تھا۔ اس زمانے میں آمد و رفت کے جدید ذرائع نہیں تھے۔ لوگ قافلوں میں سفر کیا کرتے تھے، جن کے قیام وطعام کے لیے شہر سے باہر بڑی بڑی سرائیں ہوا کرتی تھیں۔ جن میں انسانوں کے ساتھ ساتھ سواری میں استعمال ہونے والے جانوروں کے باندھنے کا بھی انتظام ہوتا تھا۔ یعنی گھوڑے، اونٹ اور ہاتھیوں کے لیے بڑے بڑے اصطبل ہوا کرتے تھے۔ صرف مشرق میں ہی نہیں مغربی ممالک بلکہ دنیا بھر میں سرائے کا چلن تھا۔ جس کا تذکرہ لوک گیتوں اور کتھاؤں میں ملتا ہے۔ شیکسپیر کی تخلیقات میں سرائے کا (INN) تذکرہ تو بہت سی جگہوں پر آیا ہے۔ ابن بطوطہ، فائیان اور کیپٹن کک کے سفرناموں میں سرائے ایک کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ دہلی میں بھی اس دور میں بہت سی سرائیں تھیں جن میں سیاح اور تاجر قیام کرتے تھے۔ ان سراؤں کے نشان تو نہیں ملتے لیکن ان کے نام باقی ہیں۔ جیسے سرائے خلیل، سرائے کالے خاں، سرائے روہیلہ، شیخ سرائے، عرب کی سرائے، یوسف سرائے وغیرہ۔

جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا گیا سفر کے جدید طریقے ایجاد ہوتے رہے۔ قافلوں کا سفر خواب وخیال وکہانیوں کی بات بن کر رہ گیا اور سرائے کی جگہ ہوٹل نے لے لی۔

حافظ کریم الدین نے ۱۹۱۳ء میں جامع مسجد علاقہ میں کریم ہوٹل قائم کیا، ان کا نظریہ صرف تجارت نہ تھا بلکہ وہ شاہی مغلئی کھانوں کو دہلی کے عوام تک پہنچانا چاہتے تھے۔ انھوں نے کریم ہوٹل بہت مختصر سرمایے سے شروع کیا تھا، ہوٹل کے مینو میں صرف دو سالن (ڈشیز) شامل تھیں۔ وہ بھی ایسی کہ کھانے والا مغلئی کے ساتھ ساتھ اس میں گھریلو تیاری

Marfat.com

کے ذائقہ کا لطف بھی اٹھا سکے۔ جن میں ایک سالن آلو گوشت تھا اور دوسرا دال۔ کریم ہوٹل کی بابت معلومات فراہم کرنے کی غرض سے میں نے حافظ کریم الدین کے پڑپوتے جناب زین العابدین سے ملاقات کی۔ میں نے ان سے سوال کیا کہ مغلئی کھانے کس طرح ایجاد ہوئے، کیا مغل بادشاہ یہ کھانے بنانے والے باورچی اپنے ساتھ لائے تھے۔

''نہیں... مغل بادشاہ بابر کے ساتھ اس طرح کے کھانے بنانے والا کوئی باورچی نہیں آیا تھا''۔

جناب زین العابدین نے جو معلومات فراہم کیں ان کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

حافظ کریم الدین کے آباء و اجداد مغل بادشاہ بابر کے زمانے سے شاہی باورچی خانے کے منتظم، باورچی اور شیف رہے تھے۔ انھوں نے مختلف کھانوں کو خوش ذائقہ بنانے کے لیے بہت سے تجربے کیے۔ کھانوں میں استعمال ہونے والے مسالوں، روغن اور خوشبو کو گوشت اور سبزیوں پر آزمایا۔ الگ الگ کھانے (ڈش) بنانے کے طریقے وضع کیے۔ انھوں نے ایسا کمال حاصل کیا کہ ہر کھانے کا ذائقہ، رنگ و روغن الگ ہوتا۔ ایک سال جسے جب بھی بنائیں اس کا ذائقہ اور رنگ و روغن وہی ہوتا جسے انھوں نے پہلی بار بنایا تھا۔ حافظ کریم الدین کے آباء و اجداد نے ان کھانوں کو الگ الگ نام دیے۔ چوں کہ ان کھانوں کو مغل بادشاہوں کے باورچی خانے میں بنایا گیا اور یہ مغلوں کو بہت پسند و مرغوب تھے اس لیے انھیں مغلئی نام دیا گیا۔ بادشاہوں کو یہ کھانے اتنے پسند آئے کہ وہ سفر و حضر میں یہی کھانے پسند کرتے تھے۔ بابر سے بہادر شاہ ظفر کے دور تک حافظ کریم الدین کے اجداد مغل کھانوں میں ترمیم اور اضافہ کرتے رہے۔

ایک بار پھر ماضی پر نظر ڈالیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی سے مغل دور کا خاتمہ ہوا۔ بہادر شاہ ظفر گرفتار ہوئے۔ انگریزوں نے لال قلعہ سے متعلق افراد پر بے شمار ستم ڈھائے۔ انگنت جانیں تلف ہوئیں۔ لوگ جان بچانے کے لیے دہلی سے بھاگے اور جہاں جس کے سنگ سمائے وہ وہیں روپوش ہو گیا۔ حافظ کریم الدین کے پُرکھوں نے دہلی سے فرار ہو کر فرخ نگر غازی آباد میں پناہ لی۔ ۱۹۱۱ء تک ان کے خاندان کے افراد فرخ نگر میں گمنامی کی زندگی جیتے رہے لیکن اس مشکل وقت اور آزمائش کی گھڑی میں بھی ان کے

خاندان میں مغلئی کھانوں کے پکانے کی مشق جاری رہی۔

حافظ کریم الدین کی تعلیم اسلامی مدرسے میں ہوئی۔ انھوں نے کم عمری میں قرآنِ پاک حفظ کیا، بعدازاں دنیاوی تعلیم بھی حاصل کی، لیکن جو علم و ہنر انھوں نے اپنے والد اور دادا سے سیکھا وہ مغلئی کھانوں کا پکانا تھا۔ دراصل وہ کھانا پکانے کو ایک فن، ایک ہنر قرار دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح اس میں بھی جتنا ریاض کیا جائے اتنی ہی کامیابی ملے گی۔ حافظ کریم الدین نے جب کریم ہوٹل قائم کیا تو ان کی عمر ۶۱ سال تھی۔ یعنی جس عمر میں لوگ کاروبار سے ریٹائر ہو جاتے ہیں اس عمر میں حاجی کریم الدین نے ہوٹل کھولا۔ انھیں مغلئی کھانوں کو عوام تک پہنچا کر دادِ تحسین حاصل کرنے کا جنون سوار تھا بالکل اسی طرح جیسے کسی فنکار کو چاہے وہ مصور ہو، گلوکار موسیقار، شاعر یا ادیب ہو اپنے فن کا مظاہرہ کر کے داد حاصل کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ شاید یہ بات مالکِ دو جہاں کو اچھی لگی اور ان کی دعائیں قبول ہوئیں۔ وہ پودا جو انھوں نے ۶۱ سال کی عمر میں لگایا تھا اسے تناور درخت بنانے کے لیے خون پسینے کی آبیاری درکار تھی، جو صرف کریم الدین ہی کر سکتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں طویل عمر بخش دی۔ وہ کریم ہوٹل کو ۵۵ سال تک اپنے خون پسینے سے سینچتے رہے۔ آج وہ کریم ہوٹل جو دو کھانوں سے شروع ہوا تھا اس کے مینو میں ۵۶ ڈشیز شامل ہیں۔ کچھ خاص کھانے کریم ہوٹل کے علاوہ کہیں دستیاب نہیں ہیں۔ پوری یا آدھی پلیٹ سالن کے علاوہ پورا تندوری بکرا بھی اس میں شامل ہے۔ ایک عام ڈش کی قیمت ۸۰ روپے ہے اور بکرے کی ڈش ۳۵۰۰ روپے ہے۔ یہاں کم سے کم پچاس روپے میں ایک فرد پیٹ بھر کر کھانا کھا سکتا ہے۔ حافظ صاحب نے جس پودے کو تناور درخت بنانے میں ایک عمر صرف کی آج اس کی شاخیں دہلی میں چاروں طرف پھیل رہی ہیں۔ کریم ہوٹل جسے انھوں نے پانچ آدمیوں سے گلی کبابیان میں شروع کیا تھا آج اس میں ۱۲۵ ملازم کام کرتے ہیں اور ہوٹل گلی کے اندر کئی دو کانوں اور مکان پر مشتمل ہے، جس کی شاخیں حضرت نظام الدین، کیلاش کالونی، ذاکر نگر، پریت وہار، نوئیڈا، کملا نگر اور گڑگاؤں تک پھیلی ہوئی ہیں۔

حافظ کریم الدین اینڈ سنز کی کامیابی کا راز ان کا خلوص، انکساری اور ایمانداری

Marfat.com

ہے۔آج کریم الدین صاحب کی چوتھی پیڑھی کریم ہوٹل اور اس کی شاخوں کو چلا رہی ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور صاحبِ حیثیت ہیں، جن کی پہچان دہلی یا صرف ہندوستان میں ہی نہیں دنیا کے بہت سے ممالک میں کریم ہوٹل مشہور ہے لیکن غرور یا تکبر انھیں چھو کر بھی نہیں گیا۔ بلکہ وہ یہ بتاتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں کہ ۱۹۱۱ء میں جب کنگ جارج پنجم کی تاجپوشی کے جشن منائے گئے تو حافظ کریم الدین اپنے خاندان کے ساتھ فرخ نگر غازی آباد سے دہلی واپس آئے اور انھوں نے دہلی میں ایک ڈھابہ کھولا جو دو سال تک چلا۔ اس ڈھابے میں باورچی، ویٹر اور مالک وہ خود اور ان کے فرزند تھے۔

حافظ کریم الدین بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان میں نفاست کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ شاید مغل باورچی خانہ اور دسترخوان کا خاکہ ان کے ذہن سے کبھی مندمل نہیں ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ کریم ہوٹل میں صفائی پر انھوں نے ہمیشہ زور دیا۔ آج بھی صفائی کا یہ عالم ہے کہ اگر بھولے بھٹکے کوئی مکھی آ بھی جائے تو میز پر بیٹھنے کے بجائے پھسل جائے گی۔ کریم ہوٹل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کھانا مرغ اور بکرے کے گوشت میں ہی تیار ہوتا ہے۔ ۱۹۶۵ء تک کھانا دیسی گھی میں پکایا جاتا تھا۔ پھر مجبوراً دیسی گھی میں تیاری ختم کرنی پڑی کیوں کہ دیسی گھی کا ملنا دشوار اور نرخ دونوں ہی قابو سے باہر ہو گئے۔ دیگر نئی پیڑھی دیسی گھی کو ناپسند کرنے لگی۔

کریم ہوٹل کی اتنی خصوصیات ہیں کہ اگر ان سب کا ذکر کیا جائے تو خاکہ انتہائی طویل ہو جائے گا، جس کی گنجائش اس سیمینار میں نہیں ہے لیکن حافظ کریم الدین کا شجرہ اور ہوٹل میں تشریف لانے والے ذی وقار مہمانوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔

حافظ کریم الدین کے والد جناب محمد عیوض کے ایک فرزند کریم الدین ہوئے، جن کے ایک فرزند جناب نور الدین تھے۔ جناب نور الدین کے چار بیٹے ہوئے جو حیات ہیں جن کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں۔ جناب ظہور الدین جو کریم ہوٹل کے چیئر مین ہیں۔ دوسرے فرزند حاجی علیم الدین جو کریم ہوٹل کے مینجنگ ڈائرکٹر ہیں۔ حاجی صلاح الدین اور حاجی شرف الدین ہوٹل کے ڈائرکٹر ہیں۔ جناب زین العابدین حاجی ظہور الدین کے فرزند ہیں۔ دیگر کریم برادران صاحبِ اولاد ہیں اور سب ہوٹل کے کاروبار سے جڑے

Marfat.com

ہیں۔

جب ہم نے جناب زین العابدین سے مغلئی کھانوں کی کامیابی کا راز پوچھا تو انھوں نے بہت ہی پختگی سے جواب دیا کہ ہم سب کریم خاندان کے افراد مغلئی کھانے بنانا جانتے ہیں، ہم میں سے کوئی بھی کھانا بنائے گا تو اس کا ذائقہ وہی ہوگا جو بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں رہا ہوگا۔ ہوٹل میں جو کھانا بنتا ہے اس کا کوالٹی کنٹرول خاندان کے افراد ہی کرتے ہیں۔ باورچی تو کریم ہوٹل میں آتے جاتے رہتے ہیں، لیکن ہمارے ہوٹل سے جانے کے بعد وہ مغلئی ڈش اس طرح نہیں بنا سکتے جیسی ہماری رہنمائی میں بناتے ہیں۔

جب ہم نے خصوصی مہمانوں کی آمد کے بارے میں معلوم کیا تو زین العابدین صاحب نے ہمارے سامنے ہوٹل کے وزیٹر بک رکھ دی۔ ہم نے الٹ پلٹ کر دیکھا اس میں بہت سے افراد کے دستخط اور اظہارِ خیال درج تھا۔ یہ وزیٹر بک ۱۹۴۳ء میں شروع کی گئی تھی، جس میں سب سے پہلے جگر مراد آبادی کے دستخط ہیں۔ انھوں نے پہلی بار ۲۶ر جنوری ۱۹۴۳ء اور دوسری بار ۲۵ر جنوری ۱۹۵۷ء کو دستخط کیے ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں انھوں نے دستخط کے ساتھ یہ شعر بھی لکھا ہے:

کارِ عظیم چاہیے طبع سلیم چاہیے
عزمِ مصمم چاہیے فکرِ مالِ کار کی

جوش ملیح آبادی ۳ر جولائی ۱۹۴۴ء اور ۲۰ر ستمبر ۱۹۶۷ء میں تشریف لائے۔ انھوں نے بھی ایک شعر لکھا ہے جس کا پہلا مصرع پڑھا نہیں جا سکا دوسرا مصرع اس طرح ہے:

”ذرا آئینہ لے چل کاروانِ مستی کو“

ان کے علاوہ جن مہمانوں نے اندراج کیا ہے ان کے نام اس طرح ہیں:

جنرل مانک شاہ، فاروق عبداللہ، عمر عبداللہ، وسندھرا راجے سندھیا، جگن ناتھ آزاد، ظفر پیامی، راجندر سنگھ بیدی، مقبول فدا حسین، بسم اللہ خاں، استاد اللہ رکھا خاں، ذاکر حسین، شیام بینگل، دلیپ کمار، ناصر خاں، راج ببر، رضا مراد، حاجی مستان، اسلم شیر خاں، بشن سنگھ بیدی، پاکستانی گلوکارہ ریشما، سکریٹری شیخ راشد، سید انور محمود کے نام نامی شامل

Marfat.com

ہیں۔ ابھی حال ہی میں ۲۶/نومبر کو پاکستان کے مشہور واعظ، عالمِ دین مولانا اسرار احمد ہوٹل میں تشریف لائے تھے۔

مہمانوں کی لمبی فہرست ہے جو کریم ہوٹل میں تشریف لائے۔ یہاں کچھ نام دیے گئے ہیں جس سے کریم ہوٹل کے مقام و شہرت کا اندازہ ہو سکے۔ ایک بات جو سب مہمانوں کی تحریر میں مشترک ہے وہ یہ ہے کہ تمام حضرات نے کھانوں کے خوش ذائقہ، صفائی اور مہمان نوازی کی اپنے اپنے انداز سے تعریف کی ہے۔

کریم ہوٹل نے خوش ذائقہ مغلئی کھانوں کی تیاری کے لیے کئی قومی اور بین الاقوامی ایوارڈ بھی حاصل کیے ہیں جن میں USA کا (Akea Ine) بیسٹ (اعلیٰ) کباب اور ٹکّہ کا ایوارڈ شامل ہے۔ دیگر بی بی سی لندن ورلڈ گائیڈ اور بہت سے اخباروں نے کریم ہوٹل پر خبریں اور آرٹیکل شائع کیے ہیں۔

آخر میں ہم نہ صرف کریم ہوٹل کے کھانوں کی تعریف کرتے ہیں بلکہ یہ بھی بتا دیں کہ یہ خاکہ ہم نے کریم ہوٹل، جامع مسجد میں کھانا نوش کرنے کے بعد لکھا ہے۔

□□

Marfat.com

انجم عثمانی

قاضی سجاد حسین: کچھ یادیں، کچھ باتیں

کچھ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے دور میں بہت اہم ہوتے ہیں، مگر کچھ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے دور میں اہم ہونے کے ساتھ ساتھ آنے والے دور میں مزید اہم ہوجاتے اور نسلوں کو متاثر کرتے ہیں، جن کے کارنامے قوم و ملک اور علم و دانش کے لیے نئی راہیں کھولتے ہیں، ایسی اہم شخصیات میں نمایاں نام قاضی سجاد حسین مرحوم کا بھی ہے۔

مولانا قاضی سجاد حسین محدث بھی تھے، مفسر بھی، عربی، فارسی اور اردو کے جید عالم بھی تھے اور بہترین مترجم بھی۔ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے ناشر بھی۔ قاضی صاحب مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے بڑوں کے لیے قابلِ فخر اور اپنے چھوٹوں کے لیے قابلِ تقلید ہوتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے دورِ ثانی میں جن علما نے قابل ترین نسل برصغیر کے مسلمانوں کو دی ان میں مولانا انورشاہ کشمیری، شیخ الاسلام مولانا شبیراحمد عثانی، مفتی اعظم ہند مفتی عزیزالرحمٰن عثانی قدس سرہ العزیز وغیرہ کا نام بہت اہم ہے۔ ان حضرات کے شاگردوں کی ایک پوری کھیپ نے علمی، دینی اور سماجی زندگی میں نمایاں کام انجام دیے۔ آج جو برصغیر کے بیشتر علاقوں میں مدارس کے ذریعے دین وعلم کی حفاظت اور ارتقا کا کام انجام دیا جارہا ہے اس کا بیشتر حصہ ان ہی بزرگوں کی کاوشوں، علمی خدمات اور نیکیوں کا مرہونِ منت ہے۔ ان بزرگوں کے راست شاگردوں میں میرے سگے تایا مفتی عتیق الرحمٰن عثانی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، میرے استاد قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، فقیہ الامت مولانا ابراہیم بلیاوی، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، صدر جمعیۃ علماء ہند مولانا محمد میاں

Marfat.com

دیوبندی، مولانا منت اللہ رحمانی، مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی، مولانا منظور نعمانی وغیرہ اور ذرا سا آگے چل کر قاضی سجاد حسین مرحوم کا نام نمایاں ہے۔ دارالعلوم دیوبند سے تربیت پانے والی اس اہم نسل کی فہرست میں اور بھی کئی ایسے نام ہیں جو اپنی جگہ ایک ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی زندگی اور کارنامے قرونِ اولیٰ کے بزرگوں کی یاد دلاتی ہے۔ ان برگزیدہ ناموں میں قاضی سجاد حسین مرحوم کا نام بہت نمایاں ہے۔

جن لوگوں کو ان بزرگوں سے کسی حد تک بھی نیاز حاصل ہوسکا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان حضرات کی شخصیت کیسی پرکشش اور ان حضرات کا علم کتنا متبحر تھا۔ میں ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہوں جنھوں نے ان میں سے اکثر حضرات کو نہ صرف دیکھا ہے بلکہ ان میں سے بیشتر سے ملاقات کا موقع بھی ملا ہے۔ مزید خوش نصیبی یہ کہ مجھے اپنے تایا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم کے علاوہ قاضی سجاد حسین مرحوم کے ساتھ کئی سال رہنے کا موقع ملا۔ مجھے یہ سعادت حاصل ہے کہ مجھے قاضی صاحب مرحوم کے ساتھ کام کرنے کا موقع بھی ملا اور ان کی کوششوں سے مستفید بھی ہوا۔

یوں تو قاضی صاحب مرحوم سے مجھے پہلے سے ہی نیاز حاصل تھا۔ قاضی صاحب جب بھی دیوبند تشریف لاتے تو ہمارے گھر آنا ضروری تھا۔ قیام مدرسے کے مہمان خانے میں ہو یا کہیں اور مگر فجر کی نماز دادا حضور کی مسجد جو دیوبند میں چھوٹی مسجد کے نام سے مشہور ہے قاضی صاحب مرحوم وہیں ادا فرماتے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ قاضی صاحب مرحوم کا زمانہ طالب علمی میں اس مسجد کے حجرے میں قیام رہا تھا، دوسرے میرے والد مرحوم قاری جلیل الرحمٰن عثمانی استاد دارالعلوم دیوبند کی امامت اور تیسرے یہ کہ اس مسجد میں بعد نماز فجر ختم خواجگان کا ورد ہوتا ہے جو گزشتہ تقریباً سوا سو سال سے بلاناغہ جاری ہے۔ قاضی صاحب مرحوم ختم شریف میں شریک ہوتے اور عام طور پر ناشتہ والد صاحب کے ساتھ ہوتا تھا۔ قاضی صاحب مرحوم کو میرے والد سے ایک خاص انسیت استاد زادہ ہونے کے علاوہ اس لیے بھی تھی کہ وہ اور والد مرحوم تقریباً ہم عمر تھے اور زمانہ طالب علمی میں ساتھ بھی رہے تھے۔ قاضی صاحب میرے تایا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم کے ہم سبق بھی تھے اور ان کے شاگرد بھی۔ ان دونوں کے مشفقانہ اور بے تکلف سعادت مندانہ تعلقات کے لطف کا میں

Marfat.com

چشم دید گواہ ہوں۔ ہفتہ میں ایک دوبار جب تک ابا جان مرحوم کی قاضی صاحب سے ملاقات نہ ہو جائے ان دونوں میں سے کسی کو چین نہیں آتا تھا۔ اگر کسی وجہ سے قاضی صاحب احاطہ کالے صاحب سے جامع مسجد نہ آپاتے تو ابا جان ان کے ہاں پہنچ جاتے۔ ہر ملی وقومی معاملے میں یہ لوگ نہ صرف ساتھ ساتھ تھے بلکہ ایک دوسرے کے ذاتی معاملات میں بھی دخیل تھے۔ دیوبند سے دہلی نقل مکانی کے بعد میں نے بارہا ان دونوں بزرگوں کو ایک دوسرے سے علمی بحثیں کرتے دیکھا ہے۔

خود میرے ساتھ مولانا کا تعلق ایک ایسے مربی کا تھا جو محسن ہوتے ہوئے بھی احسان مند رہتا ہے۔ قاضی صاحب مرحوم کے مجھ پر بہت احسانات ہیں مگر انھوں نے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ انھوں نے مجھ پر کوئی احسان کیا ہے بلکہ ہمیشہ اظہارِ تشکر کرتے رہے کہ تم نے مجھ سے کام لے کر مجھے میرے بزرگوں کی نظروں میں سرخرو کیا۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد جب میں نے دلّی میں سکونت کا ارادہ کیا تو مرحوم قاضی صاحب مجھے اپنے پاس فتح پوری لے آئے۔ اس زمانے میں، میں نے تقریباً دو سال مولانا کے ساتھ مدرسہ فتح پوری کام میں گیا۔ یہ وہ دور ہے جب مشہور عالمِ دین مفتی معظم احمد مدظلہ اور موجودہ شاہی امام سید احمد بخاری دامت برکاتہم وغیرہ قاضی صاحب مرحوم سے حدیث کی تعلیم حاصل کررہے تھے۔ یہ حضرات نہ صرت بہت لائق طلبا میں شمار کیے جاتے تھے بلکہ قاضی صاحب مرحوم کے خاص شاگردوں میں بھی تھے۔ ان حضرات کی علمیت، قابلیت اور معتبریت میں قاضی صاحب مرحوم کا بڑا حصہ ہے۔

مدرسہ فتح پوری سے متعلق رہنے کے دوران میرا زیادہ تر وقت قاضی صاحب مرحوم کے ساتھ گزرا۔ یہ ۱۹۷۲۔ ۱۹۷۳ء کی بات ہے۔ میرا قیام بھی اس دوران مسجد فتح پوری کے گھنٹے والے بڑے کمرے میں رہا جو صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتح پوری کی حیثیت سے قاضی مرحوم کے پاس رہتا تھا۔ ان دنوں قاضی صاحب مرحوم کا زیادہ تر وقت فارسی کی درسی کلاسیکس کے ترجمے، حاشیے اور تشریح کی تحریر کے علاوہ حدیث کے مطالعے اور ہمدرد کے کاموں میں مشیرِ اعلیٰ کی مصروفیات میں گزرتا تھا۔ مجھے وہ نہ صرف مدرسے اور گھر میں ساتھ رکھتے تھے بلکہ ہمدرد کی فیروزی رنگ کی فیٹ کار، جس کے ڈرائیور صدیق بھائی تھے

Marfat.com

میں بھی ہر جگہ ساتھ لے جاتے تھے۔ مقصد میری دلجوئی اور تربیت تھا۔ ان کی شفقتیں اور مربیانہ انداز یاد آتا ہے تو آج بھی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے بوجھل اور دل ان کے لیے ایصالِ ثواب کرنے لگتا ہے۔

ان دنوں قاضی مرحوم کے ساتھ رہنے، انھیں مزید قریب سے دیکھنے اور ان سے بہت کچھ سیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان چند برسوں کو مختصراً کاغذ پر سمیٹنا چاہوں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے گی۔

دیوبند سے دلّی تک اور ملک کے کتنے ہی علاقوں میں کتنے ہی علما سے ملاقات کا موقع مجھے ملا مگر میں نے قاضی صاحب مرحوم جیسا منتظم اور وقت کے ایک ایک لمحے کا استعمال اور قدر کرنے والا مولوی نہیں دیکھا۔ وہ وقت کے نہایت پابند اور ہر کام کو نہایت سلیقے سے کرنے کے عادی تھے۔ میں نے اتنی قربت کے باوجود کبھی انھیں بے کار بیٹھے نہیں دیکھا۔ روزانہ کی زندگی میں نظم کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی کو ایک پوسٹ کارڈ بھی لکھتے تو اس کا اندراج ان کے پاس ہوتا۔ قاضی صاحب مرحوم نہایت خوش لباس، خوش ذوق اور خوش خوراک تھے۔ دلّی میں کون سی چیز کہاں اچھی ملتی ہے قاضی صاحب اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کی قیام گاہ سلیقے کا ایک نمونہ تھی۔ ہر چیز ترتیب سے رکھی ہوتی۔ معمولی سے معمولی چیز پر بھی مولانا توجہ فرماتے تھے۔ خداداد صلاحیتوں، علمی بصیرت اور ان کے استادوں کی تربیت کے علاوہ غالباً اسی منتظم مزاج کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے تنِ تنہا ایسے بڑے علمی کارنامے انجام دیے جو بعض مرتبہ پورے پورے ادارے بھی نہیں کر پاتے۔

استادوں سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ ان کی اولاد در اولاد تک کا احترام کرتے۔ ایک مرتبہ ہم لوگوں کو کہیں جانا تھا۔ مولانا اندر جانے کی تیاری کر رہے تھے، میں نے موقع پا کر ان کے جوتے پالش کر دیے اور ان کی مخصوص جگہ پر رکھ دیے۔ مولانا تیار ہو کر جوتے پہننے لگے تو ایک نظر میری طرف دیکھا، میرے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور رُندھے ہوئے گلے سے فرمانے لگے ''میاں انجم آپ نے یہ کیا کیا، میں تمھارے دادا کو کیا جواب دوں گا''۔

قاضی صاحب کے تعلقات اس دور کے بہت مقتدر لوگوں سے تھے اور بالکل عام آدمی سے بھی۔ نہ وہ غیر ضروری طور پر کسی سے مرعوب ہوتے تھے اور نہ کسی کو مرعوب کرتے

Marfat.com

تھے۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ وہ خاموشی سے کتنے لوگوں کی مدد کرتے تھے، کتنے ہی طلبا کا وظیفہ اپنے پاس سے دیتے تھے اور کتنے ہی غریب لوگوں کو ماہانہ رقم بھیجتے تھے۔

قاضی صاحب مرحوم صرف عالم دین، معتبر محدث، سماجی رہنما ہی نہیں تھے بلکہ علما و صلحا کی اس صف سے تعلق رکھتے تھے جو نسلوں کی تربیت کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

اپنی علمی، قلمی، سماجی اور ثقافتی خدمات کے لیے قاضی صاحب مرحوم کو یاد کیا جاتا رہے گا۔

□□

Marfat.com

انور علی دہلوی

آنجہانی لالہ شام ناتھ

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

دلّی اور دلّی والے ہر دور میں ''منتخب روزگار'' کی حیثیت سے جانے اور پہچانے گئے ہیں۔ ۱۹۴۷ء تقسیمِ ہند سے پہلے کے دلّی والوں میں بنج بیوپار کرنے والوں کی بڑی تعداد گپتا اور اگروالوں کی تھی، اسی بڑے طبقے کے کئی خاندان دلّی کے پرانے محلوں اور گلیوں میں آباد تھے، ان کی حویلیاں اور قدیم طرز پر بنے مکانات دلّی کی طرزِ تعمیر کی نشاندہی کرتے تھے۔انہی خاندانوں میں ایک خاندان آنجہانی لالہ شام ناتھ کا تھا جن کی حویلی محلّہ دسان، چرخے والان، دلّی میں آج بھی واقع ہے۔لالہ شام ناتھ جی کے والد لالہ شمبھو ناتھ ایک اعلیٰ اور ارفع خاندانی وجاہت اور دلّی کی تہذیب و شرافت کی منہ بولتی تصویر تھے۔ پستہ قد تھے مگر ان کی پہنچ بہت اونچی تھی۔ چاوڑی بازار میں گلی حکیم بقا کے بالکل سامنے ان کا دلّی پرنٹنگ پریس صفِ اول کے پریسوں میں بھی درجہ اول کا تھا۔اس زمانے میں لیتھو کی چھپائی خاص قسم کے بڑے بڑے موٹے اور وزنی پتھروں پر ہوتی تھی۔لالہ شام ناتھ اپنے والد کے جانشین کی حیثیت سے اور سب سے بڑی اولاد ہونے کے ناطے پریس میں کافی وقت دیا کرتے تھے۔ دلّی کے ولی صفت بزرگ مرحوم حکیم عبدالحمید دہلوی کے ہمدرد دواخانے، خواجہ حسن نظامی جیسے مصورِ فطرت کی کتابیں اور اخباروں کے علاوہ اردو کے اعلیٰ درجہ کی لیتھو چھپائی کے کرانے والے دلّی پرنٹنگ پریس کے علاوہ کسی دوسرے پریس میں کروانا پسند نہیں کرتے تھے۔حوض قاضی سے متصل دلّی پرنٹنگ پریس وسیع اور عریض رقبہ میں تھا۔اس پریس کے پھاٹک پر دلّی پرنٹنگ پریس کا بورڈ آویزاں تھا۔لالہ شام ناتھ جی کا

زیادہ وقت پریس میں ہی صرف ہوتا تھا لیکن اوائلِ عمری سے ہی کانگریس کے لیڈروں، ورکروں اور تحریکوں سے لگاؤ تھا۔ محلہ چرخے والان میں ہی لالہ جی کی حویلی سے متصل کانگریس کے ممتاز رہنما لالہ جگل کشور کھنہ گلی ساہنی رام میں رہائش پذیر تھے اور میونسپل کمیٹی کے ممبر تھے۔ ۱۹۳۹ء ماہ اگست میں جب نئے میونسپل الیکشن ہونے کا اعلان ہوا تو مسلم لیگ نے باقاعدہ ٹکٹ دے کر چار حلقوں سے اپنے امیدوار کھڑے کیے لیکن کانگریس نے شہر کے باقی حلقوں میں اپنے امیدوار تو کھڑے کیے لیکن ان کو ٹکٹ نہ دے کر آزاد امیدواروں کی حیثیت سے الیکشن لڑانے کا پروگرام بنایا۔ چرخے والان سے لالہ جگل کشور کھنہ کے مقابلہ میں سب سے پہلے لالہ شام ناتھ بحیثیت آزاد امیدوار میدان میں کود گئے اور چوں کہ آفیشیل امیدوار تو تھے نہیں اس لیے انھوں نے نام واپس نہ لے کر الیکشن لڑا اور لالہ جگل کشور کھنہ ہار گئے۔ اور یہاں سے لالہ شام ناتھ کی سیاسی زندگی کا عروج شروع ہوا اور ایک بار سے زیادہ میونسپل الیکشن میں جیت حاصل کرتے رہے۔ دوسری یا تیسری بار وہ صدر میونسپل کارپوریشن اور ایک بار میئر دلّی میونسپل کارپوریشن بھی منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۷ء کے الیکشن میں دوبار پارلیمنٹ کا الیکشن جیتے ہوئے شری رادھارمن کی جگہ پارلیمنٹری حلقہ چاندنی چوک کا ٹکٹ کانگریس نے لالہ شام ناتھ کو دیا اور ۱۹۶۲ء میں لالہ جی ممبر پارلیمنٹ اور ریلوے منسٹر بن گئے لیکن ۱۹۶۷ء میں چاندنی چوک پارلیمنٹری حلقہ سے لالہ رام گوپال شال والوں سے جو آزاد امیدوار تھے لیکن بھارتیہ جن سنگھ کی حمایت اور اس کا انتخابی نشان دیپک حاصل کر کے کامیاب ہوئے اور لالہ شام ناتھ ہار گئے۔ انھوں نے الیکشن پٹیشن بھی کیا مگر جسٹس کپور کی ہائی کورٹ کی عدالت سے پٹیشن بھی ہار گئے اور بیمار ہو کر بمبئی علاج کرانے گئے اور بمبئی میں ہی انھوں نے اپنی جان دے کر موت کی نیند سو گئے۔ لالہ شام ناتھ کی زندگی دہلی میں اور نئی دہلی میں سرگرمیوں کا تو مرکز بنی رہی لیکن دہلی پردیش کانگریس کمیٹی میں لالہ دیش بندھو گپتا کو ۱۹۵۲ء تک عروج حاصل رہا اور لالہ شام ناتھ، لالہ دیش بندھو گپتا کے ''لالہ گروپ'' کے ایک اہم ممبر تھے۔ مقابلہ چودھری برہم پرکاش جو دہلی کانگریس میں انقلابی گروپ کے لیڈر تھے ان سے سیاسی کشمکش جاری تھی کہ دہلی اسمبلی کے اعلان سے پہلے لالہ دیش بندھو گپتا کلکتہ کے ڈم ڈم ہوائی اڈے پر ہوائی حادثہ میں ہلاک

Marfat.com

ہو گئے اور ان کے مرنے کے بعد چودھری برہم پرکاش کا دھڑا آگے بڑھتا رہا۔ دہلی اسمبلی کا اعلان ہوتے ہی الیکشن میں برہم پرکاش جی کے گروپ کو اکثریت حاصل ہوئی اور ۱۹۵۲ء میں چودھری برہم پرکاش پہلے چیف منسٹر بنے لیکن اس وقت کے مرکزی ہوم منسٹر شری گوبند بلبھ پنت نے بہت تھوڑے عرصہ ہی اس دہلی اسمبلی کو چلنے نہ دیا اور پھر اس کو توڑ دیا۔ لیکن دہلی پردیش کانگریس پر دہلی کے لالہ گروپ کی پکڑ ڈھیلی پڑتی گئی اور چودھری برہم پرکاش مضبوط ہوتے رہے۔ ۱۹۶۶ء میں ہوم منسٹر نے دہلی میں انٹریم میٹروپولیٹن کونسل بنادی جس کے چیف ایگزیکٹیو کونسلر چودھری برہم پرکاش کے پرانے ساتھی میر مشتاق احمد بنائے گئے۔ اس کے بعد ۱۹۶۷ء میں فروری کے مہینہ میں تین الیکشن ساتھ ہوئے پارلیمنٹ، کونسل اور کارپوریشن تینوں میں بھارتیہ جن سنگھ کے امیدواروں نے اکثریت حاصل کر کے تینوں جگہ پر قابو حاصل کرلیا۔ اسی ۱۹۶۷ء میں لالہ شام ناتھ بھی حلقہ چاندنی چوک سے ہار گئے تھے جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ اور لالہ رام گوپال شال والے الیکشن اور پٹیشن دونوں جیت کر دہلی میں جن سنگھ کا اثر اور رسوخ بڑھانے میں اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ لالہ شام ناتھ کی زندگی اپنے والد کے پریس دلّی پرنٹنگ پریس، چاوڑی بازار تک ہی محدود نہ تھی بلکہ وہ جنرل ٹاکیز لمٹیڈ فلم ڈسٹری بیوٹرز کے ڈائرکٹر بھی تھے۔ میجسٹک سنیما اور جوبلی سنیما بھی جنرل ٹاکیز کے ہی انتظام میں تھے ان دونوں سنیماؤں کی بلڈنگیں دہلی کے مشہور رئیس لالہ چھنامل والوں کی تھیں اور لالہ جی نے اپنی بیٹی کی شادی بڑی دھوم دھام سے شام ناتھ مارگ والی کوٹھی سے ہی لالہ چھنامل والوں کے خاندان میں ہی کی تھی۔ یہ کوٹھی بھی چندولال جی بیرسٹر نے لالہ شام ناتھ کی اہلیہ کو جہیز میں دی تھی یہ سڑک جس کا پرانا نام علی پور روڈ تھا۔ لالہ جی کی سیاسی زندگی کے سلسلہ میں ان کے سرپرست حضرت مولانا احمد سعید دہلوی اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے۔

رکھیو یارب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

لالہ شام ناتھ جی کی زندگی بھی اسی قدرت کی دین تھی جو انسانوں میں جہاں بہت سی صفات جمع کرتا ہے وہیں کچھ برائیاں بھی ہوتی ہیں اور قدرت کا یہ نظام جب سے بنا آج

تک چلا آتا ہے۔ میں نے اپنے اس مضمون میں لالہ جی موصوف کی صفات اور ان کے اعلیٰ خاندانی روایات کا ذکر کیا ہے۔ چوں کہ اگر انسان کے روشن پہلو ہی سامنے آئیں اور ان تاریکیوں سے روشناس نہ کرایا جائے جن میں وہ گاہے بگاہے بھٹکتا رہا تو یہ بات عوام کی امانت میں خیانت کے مصداق خیال کی جاسکتی ہے۔ میں نے لالہ جی کے ساتھ اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ گزارا ہے۔

لالہ جی کی زندگی کا ایک واقعہ بڑا ہی اہم ہے۔ چاندنی چوک پارلیمنٹری حلقہ سے ۱۹۶۲ء میں تو لالہ جی کانگریس ٹکٹ پر کامیاب ہوکر ریلوے منسٹر تک پہنچ چکے تھے لیکن اپنے زمانۂ وزارت ریلوے ہونے کے باوجود نئی دہلی ریلوے اسٹیشنوں کے درمیان بیچ میں ایک مسجد تھی جس کو ریلوے اتھارٹیز نے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں کھڑی کر بند کرادیا تھا۔ جب اس مسجد کو بند کرایا گیا تو بمبئی سے انھیں دنوں اردو اخبار دورِ جدید کے ایڈیٹر بڑے امام صاحب والی گلی میں آکر آباد ہوئے تھے اور انھوں نے اس مسجد کے بند کرائے جانے پر اپنے اخبار اور جلسے کر کے احتجاج کیا۔ لالہ شام ناتھ کی توجہ دلائی مگر مسجد بند رہی۔ اب ۱۹۶۷ء کا چاندنی چوک کا پارلیمنٹری الیکشن قریب تھا اور لالہ شام ناتھ جی کو کانگریس کا ٹکٹ مل چکا تھا لیکن حافظ علی بہادر ایڈیٹر دورِ جدید نے نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کی مسجد کو لالہ جی کی وزارت میں بند کرانے کو بڑی گرم جوشی سے اٹھا کر مسلمانوں کو مخالف بنادیا اور یہ ۱۹۶۷ء کا الیکشن اس طرح تکونا بن گیا کہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے لالہ رام گوپال شال والے آریہ سماجی لیڈر جن سنگھ کی حمایت اور دیپک کا نشان لے کر کھڑے ہوگئے اور نتیجہ میں لالہ شام ناتھ ہار گئے، اس کے بعد جسٹس کپور ہائی کورٹ کی عدالت میں پٹیشن دائر کیا گیا وہ بھی لالہ شام ناتھ جی ہار گئے اور پیلیا کے بیمار ہوکر بمبئی علاج کرانے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کا جنازہ دہلی لایا گیا اور دہلی کے چڑھتے ہوئے سیاسی سورج کے ڈوبنے کا منظر دلّی والوں نے دیکھا۔

یاد رہے کہ دہلی میں شری چودھری برہم پرکاش کا دہلی کانگریس میں ۱۹۵۲ء سے ہی عروج شروع ہوچکا تھا اور لالہ دیش بندھو گپتا کے ہوائی حادثہ سے موت نے دہلی کے لالہ رادھا رمن اور لالہ شام ناتھ گروپ کو تقویت حاصل نہ ہوسکی اور یہ لالہ گروپ دہلی کانگریس

Marfat.com

میں اپنا اثر قائم نہ رکھ سکا۔

ایک اور واقعہ بڑا اہم اور سیاسی فکر ونظر کا حامل ہے، جس میں کردار کی بلندی اور پستی صاف نظر آتی ہے۔ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کے بعد جب اگست ستمبر میں دہلی میں فسادات شروع ہوئے اس میں علاقہ سبزی منڈی، قرول باغ اور صدر کا علاقہ مسلمانوں سے خالی ہوگیا تھا۔ مار دھاڑ اور فسادیوں نے لوٹ مار اور قتل وغارت گری ان علاقوں میں بڑے پیمانے پر کی تھی اور دہلی شہر کے دوسرے علاقوں میں بھی مسجدیں اور کئی آبادیوں کے علاوہ سڑکوں پر اکا دکا قتل وغارت جاری تھی۔ چنانچہ ایک دن سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی کے مکان واقع کوچہ ناہر خاں اور کٹرہ مہر پرور کے مولانا کے مردانہ مکان میں محلے کے لوگ جمع ہوئے اور بتایا گیا کہ پٹودی ہاؤس کے آریہ اناتھ آلیہ کی طرف سے جوان دونوں محلوں کے پیچھے ہے آج بڑا حملہ کر کے ان دونوں مسلمان محلوں کو خالی کرائے جانے کا پلان ہے۔ مولانا نے لوگوں سے کہا کہ ڈر اور خوف دل سے نکال دو اور سفید کپڑے بانسوں پر لگا کر مکانوں کی چھتوں پر لگا دو، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم صلح ملاپ چاہتے ہیں لڑائی نہیں لیکن آناً فاناً میں یہ خبر دہلی پردیش کانگریس کے لالہ گروپ کے لیڈروں تک پہنچ گئی اور لالہ شام ناتھ جو حضرت مولانا احمد سعید دہلوی کے بڑے لاڈلے خیال کیے جاتے تھے شری رادھا رمن، شری جگل کشور کھنہ اور لالہ دیش بندھو گپتا کو لے کر ان کے مردانہ مکان میں آئے۔ میں ان دنوں بحیثیت آنریری اسپیشل آفیسر تھا میں بھی وہاں موجود رہا۔ مجھے دہلی کے انقلابی لیڈر چودھری شیر جنگ جو میونسپل کارپوریشن میں دہلی کے فسادات روکنے کے اقدامات تھے۔ انھوں نے ایک بندوق، چند کارتوس اور اسپیشل پولیس کا بازو پر باندھنے والا بیج اور ایک تحریر اسپیشل پولیس کی دے رکھی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ دہلی پردیش کانگریس کے یہ مقتدر اور معزز لالہ گروپ کے لیڈروں نے مولانا سے فرمایا کہ ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ آپ کے ان دونوں محلوں کٹرہ مہر پرور اور کوچہ ناہر خاں میں آج حملہ ہونے والا ہے، اس لیے ہم نے آپ کے اور آپ کے خاندان کے افراد کے لیے ایک کوٹھی میں رہائش کا انتظام پورے حفاظتی انتظامات کے ساتھ کر دیا ہے۔ آپ ہمارے ساتھ اس کوٹھی میں چل کر رہیں۔ حضرت مولانا احمد سعید نے جو جواب دیا، وہ سیاسی کردار کی بلندی اور

Marfat.com

پستی کا آئینہ دار ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ شام ناتھ تم جانتے ہو کہ میری موت اور زندگی کے تو یہی لوگ ساتھی ہیں۔ میں اپنا مال جان اور اپنے عزیزوں کی جان مال بچا کر اپنے محلے کے ان غریبوں کو چھوڑ کر خود حفاظت سے نئی دہلی کی کوٹھی میں جا کر رہوں یہ قطعی ممکن نہیں۔ آپ لوگوں نے میرا خیال رکھا اس کے لیے تو شکر گزار ہوں لیکن یہ قومی کردار کے دامن پر ہمیشہ کالا دھبہ لگ جائے گا، میں تو انہی محلّہ والوں کے ساتھ مروں گا اور جیوں گا۔ لالہ گروپ کے لیڈر جو اس زمانے کے بڑے لیڈروں میں تھے مولانا کے کردار کی اس بلندی کا جواب سن کر شرمندہ ہو کر چلے گئے۔ مولانا آخر وقت تک انہی مکانوں میں اور انہی محلوں میں غریب اور مظلوم مسلمانوں کے ساتھ زندگی گزارتے رہے۔

□□

Marfat.com

تمیزالدین دہلوی

حکیم محمد یوسف المعروف بہ حکیم کلّن

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے جہاں منتخب ہی روزگار کے

دلّی زمانہ قدیم سے راجدھانی ہی رہا، وگرنہ کم سے کم اسے مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ اسی تعلق سے دلّی ہر فن کے ماہر اور ممتاز افراد کا مسکن رہا۔ چوں کہ مجھے حکیم محمد یوسف صاحب کے تعلق سے گفتگو کرنی مقصود ہے اس لیے ماضی قریب کے چند ممتاز اطبا کا ذکر لازمی سا لگتا ہے۔ سب سے پہلے میں جنگِ آزادی کے صفِ اول کے سیاسی رہنما حکیم اجمل خاں صاحب کا نام نامی، اسم گرامی یاد دلانا چاہتا ہوں جنھوں نے فنِ طب کی اعلیٰ خدمات کے ساتھ ساتھ ملکی، سماجی اور سیاسی زندگی میں اہم ترین کردار ادا کیا۔ ان کے زمانے سے قبل ہی علاقہ بلیماران مشہور ترین اطبا کا مرکز و مسکن بن چکا تھا۔ غالباً قدیم ترین حویلی جو ''شریف منزل'' کے نام سے جانی جاتی رہی۔ اس کا ذکر ۱۸۵۷ء کے غدر کے حوالے سے مرزا اسداللہ خاں غالب کے یہاں موجود ہے۔

حکیم غلام کبیر خاں صاحب اپنی قیام گاہ میں مطب کیا کرتے تھے، جواب مسلم مسافر خانہ کے نام سے موسوم ہے۔ آزادی کے بعد حکیم بھورے میاں، حکیم جمیل خاں ولد حکیم اجمل خاں، حکیم محمد عاقل خاں، حکیم محمود احمد خاں، حکیم محمد شریف خاں وغیرہ وغیرہ بلیماران میں ہی سکونت پذیر تھے اور شریف منزل میں مطب کیا کرتے تھے۔ بلیماران کے اطبا میں قابلِ ذکر حکیم ذکی احمد خاں اپنے جید پریس میں مطب کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ بلیماران کو طب کے سلسلے میں ایک نمایاں مقام حاصل تھا، مگر ایسا نہیں کہ

Marfat.com

اطبا اور حکما شہر کے دوسرے علاقوں میں فن اور مریضوں کی خدمت نہ کرتے رہے ہوں۔ باڑہ ہندوراؤ میں حکیم خلیل الرحمٰن ناز اور حوض قاضی پر فدائے طب حکیم برج موہن، بازار چتلی قبر پر حکیم شریف احمد بقائی، حکیم شجاع الدین بقائی، کمرہ بنگش کوچہ فولاد خاں میں حکیم طالب احمد نظامی ہمدانی، ان سے تھوڑا آگے حکیم نعیم بیگ صاحب، ادھر بارہ دری خواجہ میر درد گلی راجان میں حکیم سردار حسین اور ان کے بھائی حکیم قیام حسین خاں۔ کوچہ چیلان میں حکیم محمد فضل احمد خاں عرف کن کٹے، کوچہ چیلان کے باہر آصف علی بیرسٹر کے گھر کے سامنے حکیم علی رضا خاں کا مطب تھا۔ جامعہ طبیہ بلیماران، گلی قاسم جان میں پرنسپل حکیم الیاس خاں اور حکیم انوار احمد صاحب، حکیم رام لبھایا وغیرہ وغیرہ قابلِ ذکر اطبا موجود تھے۔

راقم الحروف نے حکیم عبدالحمید خاں (ہمدرد دواخانہ) کا قصداً اس لیے کوئی ذکر نہیں کیا کہ ان کی خدمات بے مثل، لاثانی اور عظیم ترین ہیں۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ ان کا تفصیل سے ذکر کیا جاتا لیکن یہ نفسِ مضمون اور اصل موضوع سے الگ ہو جائے گا۔ فی الحال طوالت سے بچتے ہوئے اصل موضوع کی ہی طرف لوٹتا ہوں۔

اردو اکادمی، دہلی کی فرمائش میری آزمائشی ٹھہری، ناطقہ سر بہ گریباں خامہ انگشت بدنداں، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ ہرچہ بادا باد۔ بسم اللہ پڑھ۔ نصر من اللہ کے سہارے آگے بڑھ۔

حکیم محمد یوسف صاحب کے والد کا نام حکیم محمد یعقوب تھا جو بازار کمرہ بنگش میں مطب کیا کرتے تھے۔ وہیں آپ کا دواخانہ بھی تھا۔ غالباً ۳۶-۱۹۳۵ء میں آپ نے وفات پائی۔ آپ نے اپنی زندگی کے آخری ایام مکان نمبر ۲۰۹۶، کوچہ ناہر خاں اندرونِ کوچہ چیلان میں گزارے۔ حکیم یعقوب صاحب پر کیمیا بنانے کا بھوت سوار ہو گیا۔ رات دن الاؤ جلتا تھا اور ہانڈیوں میں مختلف کیمیکل پکتے رہتے تھے، مگر نتیجہ کچھ نہ نکلتا۔ البتہ بس ایک انچ کی کسر اور رہ گئی ہے کا جملہ ادا ہوتا اور پھر ہانڈیاں الاؤ پر چڑھا دی جاتیں۔ کافی لمبی چوڑی جائداد اسی کیمیا بنانے کے شوق کی نذر ہو گئی۔

حکیم محمد یعقوب صاحب کی پانچ اولادیں تھیں، جن میں حکیم محمد یوسف واحد فرزند اور منجھلے تھے۔ ان سے دو بہنیں بڑی اور دو چھوٹی تھیں۔ بچپن میں اپنے والد ہی سے حکمت

Marfat.com

کی تعلیم و تربیت حاصل کی، حکیم صاحب کی والدہ گھر پر مختلف خصوصی ادویات، خمیرہ جات اور مشروبات تیار کرتی تھیں۔ گھر میں دوا سازی کے جملہ آلات مہیا رہتے۔ مثلاً بھپکا، ہاون دستہ، مختلف اقسام کے پتھروں کے کھرل وغیرہ وغیرہ۔ دوا سازی کی بنا پر ہی حکیم صاحب کی والدہ اماں حکیمن کے نام سے مشہور تھیں۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق بچوں کو نظرِ بد سے بچانے کے لیے، مائیں کلّن، بندو جیسے غیر معقول ناموں کی عرفیت کا استعمال کرتی تھیں۔ عرفیت کی وجہ تسمیہ کچھ بھی رہی ہو حکیم محمد یوسف عرف حکیم کلن بہت توانا و تندرست اور خوبصورت آدمی تھے۔ انھوں نے اپنا دواخانہ بھوگل (دلّی) میں قائم کیا جو عرصہ دراز تک چلا مگر بعد میں ۱۹۴۷ء کے فساد کی نذر ہو گیا۔ اس کے بعد یہاں سے بمبئی تشریف لے گئے اور بھنڈی بازار میں مطب کرتے رہے، یہ حکیم صاحب کے لیے پہلا موقع تھا جب وہ گھر سے دور کسبِ معاش کی غرض سے گئے۔ دلّی والے تھے، اس لیے زیادہ عرصہ طبیعت نہیں لگی اور چند ہی سال میں گھر لوٹ آئے، کچھ عرصہ میرٹھ میں بھی مطب کیا مگر وہاں بھی دل نہ لگا اور دلّی لوٹ آئے اور آخر وقت تک مختلف پیشوں کے ذریعہ کسبِ معاش کرتے رہے مگر دلّی نہ چھوڑی۔

عالمِ شباب میں حکیم صاحب فی الواقع یوسفِ ثانی تھے، حسین و جمیل، توانا، چوڑا سینہ، چوڑی کلائی، غزالی آنکھیں، غلافی پلکیں، چہرے پر کالی بھنورالی خش خشی داڑھی، دراز قامت، وجاہت اور جلالت چہرے سے ٹپکی پڑتی تھی۔ عام طور پر بڑے پائینچے کا کھدر کا پاجامہ اور کرتا زیب تن کرتے تھے۔ ان کے جمعہ کی تیاری بھی اپنا ایک الگ مزاج رکھتی تھی، بھری بھری پنڈلیوں پر چوڑی دار پاجامہ کرتا، شیروانی، خوشبو سے معطر، آنکھوں میں سرمہ، سر پر کشتی نما شیروانی کے ہی کپڑے کی ٹوپی، ہاتھ میں صندلی عصا جس پر سفید براق سنگ مرمر کا مُٹھ، اس سج دھج سے جمعہ کی نماز کے لیے عموماً جامع مسجد تشریف لے جاتے۔ آپ بڑی تہہ دار شخصیت کے مالک تھے۔ شہر کے سیاسی وسماجی کاموں میں آپ کا عمل دخل ہوتا۔ محکمہ کسٹوڈین، ڈی۔ ڈی۔ اے اور میونسپل کارپوریشن کے اہلکار آپ کی بہت عزت کرتے اور آپ کی بات مانتے۔

کوچہ ناہر خاں میں شاہ ہدایت اللہ صاحب کا سالانہ عرس بڑی شان وشوکت کے

Marfat.com

ساتھ منعقد کرتے۔ یہ تقریب سہ روزہ ہوتی اور اختتام پر شیرینی تقسیم کی جاتی۔ ایک مرتبہ حکیم صاحب نے مولانا احمد سعید صاحب کو ایک مشاعرے کی صدارت کے لیے مجبور کیا۔ اس مشاعرے میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، علامہ گوپی ناتھ امن لکھنوی (اسپیکر دلی اسٹیٹ حکومت)، پنڈت آنند موہن ناتھ زتشی گلزار دہلوی، مخمور دہلوی اور سلام مچھلی شہری وغیرہ شریک ہوئے۔ مشاعرے کے اختتام پر کنور صاحب نے مولانا احمد سعید صاحب سے صدارتی کلام سنانے کی درخواست کی، مولانا اسیر تخلص کرتے تھے۔ مولانا فرمانے لگے کہ اسے میری نوعمری کی غلطیوں پر محمول کیا جائے، برسوں ہو گئے نہ کوئی شعر کہا نہ سنایا، اب تو حافظے میں کچھ بھی محفوظ نہیں۔ اس پر کنور صاحب نے پھر اصرار کیا۔ مولانا نے پھر انکار کیا۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ کنور صاحب نے فرمایا کہ اب تک تو میں آپ سے درخواست ہی کرتا رہا ہوں مجھے مجبور نہ کیجیے کہ میں ڈی۔ ایم کی حیثیت سے حکم دوں کہ آپ کلام سنائیں۔ مولانا نے برجستہ جواب دیا۔ کنور صاحب آپ تو بخوبی واقف ہیں کہ ہم پرانے ستیہ گرہی ہیں اور ہمیں حکم کی خلاف ورزی میں کوئی تردد نہیں ہوتا۔ اس ردّ و کد کے درمیان مولانا کے قدموں میں بیٹھے ایک نوجوان نے عرض کیا (یہ نوجوان جناب تمیز الدین تھے) کہ اگر گستاخی نہ شمار کیا جائے تو میں قبلہ مولانا موصوف کو ان کی غزل کے کچھ اشعار یاد دلاتا رہوں گا، قبلہ چاہیں تو اپنی زبانِ مبارک سے دہرا دیں۔ اب کوئی راہِ فرار نہ تھی مجبوراً مولانا نے اس نوجوان کی مدد سے اپنی ایک غزل کے چند اشعار عطا فرمائے جس کے دو اشعار خاکسار کو اب بھی یاد ہیں:

ایسے آنے سے نہ آنا خوب تھا
شام آئے، شب سے پہلے گھر چلے
تیرے صدقے اے شہر لطف و کرم
ہاتھ خالی آئے دامن بھر چلے

بہر حال اس طرح مشاعرہ اپنے اختتام کو پہنچا۔

ایک واقعہ شوخی کا بھی عرض کرتا چلوں یہ واقعہ تقریباً ۴۹۔۵۰ء کا ہے۔ ہوا یوں کہ ایک کہار بوقت عصر سر پر سینی اٹھائے حکیم محمد ایوب صاحب کی تلاش میں تھا۔ حسنِ اتفاق

Marfat.com

کہ حکیم محمد یوسف صاحب سے اس کہار کا سامنا ہو گیا۔ اس نے حکیم محمد یوسف صاحب ہی سے حکیم محمد ایوب صاحب کا پتہ معلوم کر لیا۔ حکیم یوسف شوخ تو تھے ہی سینی دیکھتے ہی بھانپ گئے اور بولے آؤ میں تمھیں لے چلتا ہوں۔ اس کہار کو لے کر اپنے ہی ایک دوست اختر شیرانی کے مکان پر پہنچے۔ وہ گھر پر نہ تھے۔ ڈیوڑھی ہی میں سے انھوں نے اختر صاحب کی صاحبزادی کو آواز دی کہ بیٹھک کھول دیں۔ بچی نے دروازہ کھول دیا۔ حکیم صاحب نے وہ سینی بیٹھک میں رکھوادی اور کہار سے بولے تم جاؤ ہم برتن خود بھجوادیں گے۔ سینی کیا تھا خوانِ نعمت تھا۔ ایک قاب میں بریانی، ایک قاب میں قورمہ، خمیری نان اور کچھ شیر مال، تین جوڑہ فیرنی اور اس پر چٹا پٹی کا خوان پوش۔ بہر حال حکیم صاحب کی اللہ میاں نے سنی۔ انھوں نے اپنے قریبی دوست سردار علی اور داروغہ شمشاد کو کہلوا بھیجا کہ شام کا کھانا شیروانی صاحب کی بیٹھک میں ساتھ کھائیں۔ ایسا ہی ہوا۔ دوستوں نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا، برتن کس کو واپس بھجوانے تھے؟ چند روز بعد جب برتن واپس نہ گئے تو حکیم محمد ایوب صاحب کے پاس پیغام پہنچا کہ آپ کے یہاں کھانا بھیجا تھا مگر برتن ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں لہٰذا برتن بھجوادیجیے۔ اب یہاں بھانڈہ پھوٹ گیا۔ حکیم محمد ایوب صاحب کی تگ ودو کی وجہ سے معاملہ صاف ہو گیا کہ یہ شوخی حکیم کلّن کی ہے لہٰذا انھوں نے کہا کہ یہ تو اچھا ہی ہوا کیوں کہ دانے دانے پر لکھا ہے کھانے والے کا نام مگر برتن پر تو کسی کا نام نہیں ہوتا لہٰذا وہ برتن تو احاطہ کالے صاحب واپس بھجوادو۔

ایک واقعہ انسانی ہمدردی کا بھی عرض کردوں۔ ایک مدرس ہوا کرتے تھے ماسٹر کشوری لال، جن کے اسکول انسپکٹر سے اختلاف ہو گیا، بدلے کی نیت سے ماسٹر صاحب کا تبادلہ دور دراز کے ایک اسکول میں کر دیا گیا۔ ماسٹر صاحب بہت پریشان ہوئے۔ انھوں نے اپنے ایک ساتھی مدرس ضیاء الحسن سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ وہ ماسٹر کشوری لال کو حکیم یوسف صاحب کے پاس لے آئے، حکیم صاحب نے پوری بات سنی اور کشوری لال جی سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ بہ مشکل تمام دو چار دن ہی گزرے ہوں گے کہ حکیم صاحب قبلہ صبح صبح ہاتھ میں بید کی بیضوی ٹوکری لے کر گوشت ترکاری لینے نکلے، راستے میں خیال آیا تو ماسٹر ضیا کو آواز دے دی اور یہ دونوں حضرات اردو بازار میں چودھری عبدالستار کے کمرے

Marfat.com

پر پہنچے۔ چودھری عبدالستار ان دنوں سبنی ساؤتھ زون میونسپل کمیٹی کے چیئرمین ہوا کرتے تھے۔ چودھری صاحب کچھ لوگوں سے محوِ گفتگو تھے۔ حکیم صاحب کو خاصی دیر انتظار کرنا پڑا تو غصہ میں آ کر کھڑے ہو گئے اور ضیاء الحسن سے مخاطب ہو کر بولے کہ چلو میاں یہ چودھری نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھے بیٹھا ہے۔ غصے میں تو تھے ہی جو منہ میں آیا کہا۔ چودھری بیچارے نے ہکا بکا حکیم صاحب کی خوشامد کر کے ان کو روکا، پہلے اپنی بے توجہی کی توضیح اور معذرت کی، پھر بولے صبح صبح کیوں زحمت کی۔ حکیم صاحب نے کشوری لال کا معاملہ سامنے رکھ دیا۔ چودھری صاحب نے جواب میں کہا کہ آپ مطمئن رہیں یہ کام آج ہی آپ کے حسبِ منشا طے ہو جائے گا، سو ہوا بھی یہی، اسی دن کشوری لال کے تبادلے کے احکامات واپس لے لیے گئے۔

حکیم صاحب پکّے کانگریسی تھے۔ ہمیشہ کھدر پہنتے تھے۔ جب شیروانی نہ پہنتے تو جواہر کٹ صدری اور گاندھی کیپ کا استعمال کرتے۔ اپنے مطب واقع کوچہ ناہر خاں میں دوائیوں کی بوتلوں کے ساتھ ساتھ جنگ آزادی کے مجاہدین کے فوٹو لگانا ان کا مخصوص انداز تھا۔ ہر روز شام میں دوستوں کے ساتھ بیٹھک رہتی۔ تاش کھیلنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ ترپ چال کھیلتے کھیلتے ہنسی مذاق شور کی حد تک پہنچ جاتا۔ کبھی کبھی کھیل اتنا جذباتی ہو جاتا کہ بات تو تو میں میں سے تاش کی گڈی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے تک پہنچتی۔ حکیم صاحب غصے میں تاش سے توبہ کر لیتے۔ چند روز خاموشی چھائی رہتی، مگر پھر کسی اور بیٹھک میں یہ سلسلہ دوستوں کی دعوت سے شروع ہو جاتا اور پرانی تلخی کو بھلا کر ترپ چال پھر شروع ہو جاتی۔ کھانے کے بے حد شوقین تھے۔ ہر وہ چیز انھیں مرغوب تھی، جس کا انھیں پرہیز بتایا جاتا تھا۔ گردہ کے عارضہ کا شکار تھے۔ تقریباً ہر سال دو سال میں گردے میں پتھری پیدا ہو جاتی تھی۔ درد کی شدت سے بے چین ہوتے تو ڈاکٹر سے علاج کراتے۔ جو ڈاکٹر انھیں زیادہ پرہیز کی ہدایت کرتا وہ ان کے نزدیک ڈاکٹر کم اور حکیم زیادہ قرار پاتا۔ اب ڈاکٹر بھی حکیم جیسا برتاؤ کرے تو وہ خود کون سے کم حکیم تھے۔

آیئے اب ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں بھی کچھ عرض کروں۔

حکیم صاحب کی پہلی رفیقۂ حیات کی زندگی نے کچھ زیادہ عرصے وفا نہ کی اور ایک

لڑکی کی ولادت کے کچھ عرصہ بعد ہی راہی ملک عدم ہوئیں۔ وہ لڑکی حکیم صاحب کے زیر سایہ پرورش پاتی رہی کہ اسی دوران تقسیمِ وطن ہوئی۔ بچی اپنے ننیہال والوں کے ساتھ کراچی بھیج دی گئی۔ حکیم صاحب چوں کہ کٹر نیشنلسٹ تھے اس لیے انھوں نے ترکِ وطن اختیار نہیں کیا۔ حالاں کہ کوئی اور لالچ دامن گیر نہ تھا۔ جائیداد تو تھی نہیں جو یہاں پڑے رہتے خیر کئی سال تجرد کی زندگی گزاری۔ ان کی تنہائی کی اذیتوں کا واحد شاہد خاکسار ہی ہے۔ تنہائی سے تنگ آکر عقدِ ثانی کیا اور بیٹی کو اپنے پاس واپس بلالیا۔

حکیم صاحب کے پڑوس میں ایک خاندان رہتا تھا جو پنّی والوں کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس خاندان کا ایک بچہ پڑوس کی بناپر حکیم صاحب کے گھر ہی کھیلتا رہتا تھا۔ چوں کہ حکیم صاحب کی دوسری بیوی سے بھی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ غالباً اس وجہ سے بھی حکیم صاحب اور ان کی بیگم اس بچے سے بہت مشفقانہ برتاؤ کرتے۔ ہمہ وقت کھلانا، پلانا، نہلانا، کپڑے بدلنا یہ سب حکیم صاحب ہی کے گھر ہوتا۔ اس بچے سے محبت اتنی بڑھی کہ اسے باقاعدہ گود لے لیا اور اس کی پرورش اپنی بیٹی کے ساتھ سگے بیٹے کی طرح کی۔ حکیم صاحب نے اس کی تعلیم وتربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اپنی معاشی استعداد کے مطابق وہ اس بچے کے ہر شوق کو پورا کرتے۔ وہی بچہ اپنی آئندہ زندگی میں اپنی محنت، تقدیر اور حکیم صاحب کی تربیت سے م۔ افضل بنا اور پارلیمنٹ تک پہنچا۔ حکیم صاحب کی ایک نواسی طلعت سلطانہ بھی سیاست میں آئیں اور ان دنوں جامع مسجد ایریا کی میونسپل کونسلر ہیں۔ حکیم صاحب کے ایک بھانجے اتر پردیش کانگریس کے قابلِ ذکر لیڈر ہیں۔ وہ رئیسِ انچولی (میرٹھ) فخرالدین پردھان کے نام سے مشہور ہیں۔ پہلے وہ خود پردھان تھے اور اب ان کی اہلیہ قصبہ انچولی کی پردھان ہیں۔ حکیم صاحب نے ۶۵ سال کی عمر میں ۷/جولائی ۱۹۷۳ء کو دہلی میں اپنے آبائی مکان میں وفات پائی اور دہلی گیٹ کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ بحمد اللہ ان کی اہلیہ جو تقریباً ۹۰ سال کی ہیں تاہنوزم۔ افضل کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔

□□

Marfat.com

حکیم عبدالحمید (مرحوم)

حکیم عبدالحمید کو مرحوم کہنے کو جس سے ان کے سفر آخرت کی طرف اشارہ ہے جی نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ ایسی شخصیتیں تو روحانی طور پر زندہ رہتی ہیں۔ فارسی کا مشہور شعر اس موقع پر یاد آتا ہے:

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامے ما

(ترجمہ: جس انسان کا دل عشق کی بدولت زندہ ہو گیا اب ہرگز اس کے لیے موت نہیں ہے۔ اس کا نام یا ذکر خیر تو جریدۂ عالم کے روشن صفحے پر برابر نور افشاں رہے گا اور اسے کوئی مٹا نہیں سکے گا۔)

عشق سے دل کا زندہ ہونا دراصل نیک کاموں کا ذہن اور زندگی پر وہ اثر ہے جو زمانے پر ہمیشہ کے لیے اپنے روشن و شفاف اثرات چھوڑ جاتا ہے۔ انسان کو علم اور توفیقِ خدا کی دین ہوتی ہے مگر اس عملِ محبت کے لیے کچھ خاص دل ہی مخصوص ہوتے ہیں جو واقعتاً انسانیت کی وہ ذمہ داریاں اٹھاتے ہیں جن میں دوسروں کی بھلائی کے امکانات موجود ہوتے ہیں اور یہ انسان کی خوش قسمتی ہوتی ہے کہ ایسے کچھ نیک کام اس کے ذریعے روبہ عمل آئیں وما توفیقی الا باللہ (اور نہیں ہے توفیق سوا اللہ کی دین کے) میں نے جب انسانوں کو اپنے حالات اور خیالات کے روشن دائرے میں رہتے ہوئے نیکیاں اور بھلائیاں کرتے ہوئے دیکھا تو اکثر قرآنِ پاک کی مقدس آیت اپنے معنی اور معنویت کے ساتھ نظر کے سامنے آ گئی۔

Marfat.com

حکیم عبدالحمید بہت سے انسانوں کی جانی پہچانی شخصیت تھے اور اسی کے ساتھ یہ بھی ایک واقعہ ہے، سچائی ہے کہ جن لوگوں نے حکیم عبدالحمید کو بہت قریب سے نہیں دیکھا وہ بہت سے تعارف ناموں اور تعریفات کے ساتھ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ حکیم عبدالحمید کیا تھے اور ان کی شخصیت کو ان کی انسانی خوبیوں کے ساتھ جانچنے اور پرکھنے کا پیمانہ کیا ہوسکتا ہے۔ فارسی کی شاعری میں بہت سے بیش بہا موتی ہیں، ان میں شخصیت وشعور کا ایک پیمانہ وہ بھی ہے جس کا اختتام اس جزوِکلام پر ہوا ہے:

لیکن تو چیزے دیگری

حکیم صاحب کو اگر دیکھیے تو وہ بے حد سیدھے سادے، ملنسار، خوش اخلاق، سادہ کلام مگر معنی خیز شخصیت تھے۔ ان کی شرافتِ مزاج، خلوصِ خدمت اور جذبے کی پاکیزگی سے حکیم صاحب کو دیکھنے والا ہر آدمی پہلی نظر میں متاثر ہوجاتا تھا مگر ان کی شخصیت وشعور کی پرتیں دھیرے دھیرے کھلتی تھیں۔ ان کے عقل وشعور کی انسانی وسعتوں تک پہنچنا اور ان کی داخلی شخصیت کو پھولوں کی خوشبوؤں کی طرح محسوس کرنا شاید سب کے حصے میں نہیں آتا تھا۔ ان کے یہاں سادہ پن کا یہ عالم تھا کہ ان کو پہلی نظر میں کوئی آدمی یہ کہے کہ پوری طرح دیکھ بھی نہیں پاتا تھا ان کا معاملہ کچھ ایسا تھا جسے اس شعر میں کسی شخصیت کی پہلو داریوں کو پیش کیا گیا ہے:

از شمارِ نظر زیکتا / وز حسابِ خرد ہزاراں بیش

یعنی وہ ظاہری نظروں سے اگر دیکھا جائے تو ایک تن سے بھی کم تھے یعنی دبلے پتلے اور منحنی سے آدمی۔ چھوٹی موری کا علی گڑھ کٹ پائجامہ، اس پر سفید کپڑے کا قدرے نیچا سا کرتا اور کرتے یا قمیض پر شیروانی جس کا سفید رنگ بھی کبھی مشکل ہی سے بدلا ہوگا۔ راقم الحروف نے ہمیشہ انھیں ایک سادہ سی سفید شیروانی میں دیکھا۔ پیروں میں ضرور انگریزی وضع کا جوتا پہنتے تھے۔ تیز تیز چلتے تھے اور از راہِ شرافت نگاہیں نیچی کیے رہتے تھے۔ انھوں نے توجہ فرمائی کے طور پر بھی آنکھیں ملانے اور دوبدو انداز اختیار کرنے کی روش وکشش کو شاید ہی کبھی پسند کیا ہو۔ اس لیے کہ ان کے مزاج میں ایک طرح کی فطری نرمی اور شریفانہ آدھینگی تھی جس کی وجہ سے ان کی گردن میں شاید ہی کسی نے کبھی ایسا خم دیکھا ہو جس سے

شعوری یا نیم شعوری طور پر ایک طرح سے شخصی بڑائی کا احساس موجود رہتا ہے۔

وہ کبھی اونچے لہجے میں بات کرتے ہوں ایسا کم از کم میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ بہت دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے اور الفاظ کے انتخاب میں جو ان کے یہاں قدرتی اور فطری ہوتا تھا ایک خاص طرح کی شرافت موجود رہتی تھی۔ یعنی لب و لہجے کی سنجیدگی، جملے مختصر ہوتے تھے اور اکثر کسی طوالت کو گفتگو میں راہ دیے بغیر اختصار پر ختم ہو جاتے تھے۔ ان کی بات چیت میں کبھی تصنع اور تکلف کا شائبہ بھی شامل نظر نہیں آتا تھا۔ یوں بھی ایک حکیم کو نہ تنک مزاج ہونا چاہیے اور نہ تند و تیز لہجے میں کبھی گفتگو کرنی چاہیے۔ خاص طور پر اپنے مریضوں کے ساتھ۔ اور حکیم صاحب کی طرف تو ان کے مریض یہ سوچ کر ہی رخ کرتے تھے کہ اللہ پاک نے ان کے ہاتھ میں شفاء دی ہے اور جن پر وہ توجہ فرما ہو جاتے تھے وہ ان کی دوائی سے نہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دعا سے شفایاب اور صحت مند ہو جاتا تھا۔ خاندانی پیشہ میں بڑی برکت ہوتی ہے اور حکیم صاحب کے لیے تو پیشۂ طبابت نیکوکاری اور خدمت گزاری کا ایک وسیلہ، طریقہ، سلیقہ تھا۔ وہ اوقاتِ عبادت کی پابندی کی طرح اوقاتِ مطب کی بھی پابندی کرتے تھے۔ اور جب مریض پر ایک طرح کی بے چینی اور اضطراب کا عالم چھایا ہوا نظر آتا تھا تو اسے ہمدردانہ، مشفقانہ اور بزرگانہ انداز سے تسلی اور تشفی بھی دیتے تھے۔

فنِ طب میں ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ طبیب نبض دیکھتا ہے اور نبض کی حرکت اور اس کی نرمی اور گرم روی سے خون کی حرکات اور طبیعت کے سکون و سلامتی یا بے سکونی اور اضطراب کی حالت کو جان سکتا ہے۔ نبض دیکھ کر مرض کی کیفیت کا اندازہ لگانا معمولی بات نہیں۔ اب تو خیر بہت سے آلات ایجاد ہو گئے جن کی مدد سے مریض کے طبعی کوائف کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، مگر ایک وقت بہت کچھ انحصار نبض کی رفتار پر ہی ہوتا تھا۔ حکیم صاحب جس توجہ سے نبض دیکھتے تھے اس کا اندازہ ان کے ذہنی انہماک سے بھی ہوتا تھا جس کے ساتھ وہ مریض کے چہرے پر نظر کیے رہتے تھے اور اس کی سانسوں کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنے کی سعیِ مشکور فرماتے تھے۔ راقم الحروف نے بھی خاندانی پیشہ ہونے کے علاوہ باقاعدہ فنِ طب کو پڑھا تھا۔ میرے والد بھی ایک جید طبیب اور حکیمِ حاذق تھے۔ میں نے تو ان کو نہیں دیکھا مگر وہ اپنے زمانے کے بہت ممتاز اور لائق اطبا میں گنے

Marfat.com

جاتے تھے اور حکیم عبدالمجید خاں صاحب (حکیم اجمل خاں کے بڑے بھائی) کے شاگرد تھے۔ ان سے مطلق جو کچھ سنا اس نے بھی فنِ طب سے میری دلچسپی کو آگے بڑھا دیا۔ حکیم عبدالحمید کو میں اس پیشہ کا ماہر مان کر بھی ان سے ایک گونا شخصی واقفیت اور گہری عقیدت رکھتا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ جب وہ مریض کو دیکھ رہے ہوں تو میری آنکھیں بھی اشتیاق واحترام سے ان کی طرف اٹھ رہی ہوں۔

حکیم صاحب نے حکمت سے کیا کچھ کمایا یہ تو میرے علم میں نہیں مگر انھوں نے اس کے ذریعے کس قدر نیکیاں کمائیں اور خلقِ خدا کی خدمت کی یہ بات ہمیشہ میری نظر میں رہی کہ حکیم صاحب عظمتِ کار کے قائل تھے۔ اور وہ اپنی ذات کی حد تک کام میں لگے رہنے اور اس کے وسیلے سے عظمت حاصل کرنے کے قائل تھے۔ خدا نے انھیں ان کی اپنی فکر، ان کے اپنے منصوبہ بند ذہن اور متحرک شعور و شخصیت کے ذریعہ بہت کچھ دیا اور عظیم بنایا۔ اس کے باوجود انھیں اپنے دورِ عظمت وعروج میں بھی میں نے کو اپنی تجربہ گاہ میں اپنے ہاتھ سے کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

حکیم صاحب کا مجھ پر یہ خاص کرم تھا کہ وہ مجھے ان لمحات میں بھی یاد فرما لیتے تھے جب کہ وہ اپنے خاص کمرے میں دوا سازی کے عمل میں مصروف ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ جب میں نے موصوف کو جواب مرحوم ہو گئے ہیں اس حالت میں دیکھا کہ ان کے ہاتھ دواؤں میں بھرے سنے تھے تو میں نے کہا کہ حضرت آپ مجھے میری عقیدت کو جانتے ہوئے بھی کبھی ہاتھ چومنے کی اجازت نہیں دیتے مگر اس وقت تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ آپ کے ہاتھ چومے جائیں کہ وہ دوا میں ایک طرح سے سنے ہوئے ہیں۔ ہنس کے کہنے لگے کہ جب دوا تیار ہو جائے گی تو بہت لوگوں تک پہنچے گی اور جو لوگ اس دوا کو کھائیں گے وہ گویا ان ہاتھوں کو ضرور چومیں گے، جنھوں نے اسے تیار کیا ہوگا اور وہ میرے دواخانہ کے ساتھ ہی اور کام کرنے والے ہیں۔ دوائیں اپنی خوشبو، اپنے رنگ اور اپنی موجودگی سے بھی ہمیں متاثر کرتی ہیں۔ میں نے فوراً عرض کیا کہ یہ تاثر آپ کی زندگی پر اس طرح چھایا ہوا ہے کہ جو لوگ آپ سے براہِ راست واقف نہیں ہیں وہ اسے پورے طور پر اپنے تصور اور تاثر کا حصہ بھی نہیں بنا سکتے۔

حکیم صاحب نے اپنی شعوری کوشش، ذہنی کاوش اور دور اندیش ذہن کی مدد سے ہمدرد کے ایک چھوٹے سے دوا ساز ادارہ کو اتنا بڑا بنا دیا کہ اس کا کوئی اس دور میں خیال بھی نہیں کر سکتا تھا جب ہمدرد قائم کیا گیا تھا مگر حکیم صاحب کی کوشش و کاوش سے یہ خواب برابر اپنی تعبیروں کے سانچے میں ڈھلتا رہا۔ اس خواب کو حقیقت بنانے میں حکیم صاحب کے ساتھیوں کا بھی بہت بڑا Contribution ہے۔ اورنگ زیب نے اپنے پردادا اکبرِ اعظم کے لیے یہ لکھا تھا کہ حضرت عرش آشیانی کیوں کہ بہت اچھے ملازم اور نوکر اپنے دربار میں رکھتے تھے۔ اسی لیے متواتر فتوحات اور مسلسل مہمات میں لگے رہتے تھے۔

حکیم صاحب کے پاس کوئی سلطنت تو نہ تھی مگر وہ اپنے ساتھیوں کے دلوں پر حکومت ضرور کرتے تھے اور اس کو سمجھنے کے لیے ہم اقبال کے اس مصرعہ سے مدد لے سکتے ہیں:

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم

حکیم صاحب نے محبت سے دلوں کو جیتا اور وہ اپنی کارپردازانہ فتوحات میں اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو بھی شامل رکھتے تھے اور ان کا ذکر بڑے احترام سے کرتے تھے۔

کسی طرح کا تفاخر اور تکبر حکیم صاحب کے ذہن و زندگی میں داخل ہی نہ تھا وہ ہنسی مذاق تو شاید نہ کرتے ہوں کہ مزاج میں ایک خاص طرح کی متانت اور سنجیدگی تھی۔ بہت ہی لطیف سی ہلکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر ہمیشہ کھیلتی رہتی تھی۔ بہت نرمی، سلامت روی اور اپنائیت کے شریفانہ لہجہ میں باتیں کرتے تھے۔ تیز تیز بولتے تھے اور ان کے جملے اکثر مختصر ہوتے تھے۔ اس پر بھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنی گفتگو میں ذرا بھی بے تعلقی کا اظہار کیا ہو۔

وہ علمی گفتگو اکثر کرتے تھے اور اس میں واقفیت کا اظہار تو موقع بہ موقع ہوتا رہتا تھا مگر کسی طرح کی دعویداری کبھی شامل نہیں ہوتی تھی۔ اکثر طبی تاریخ سے متعلق خیال انگیز گفتگو ہوتی رہتی تھی اور فنِ طب کو وسطی عہد میں آگے بڑھانے کا کام جن حکما اور اطبا نے اپنے اپنے وقت میں کیا تھا وہ اس سے واقف بھی تھے اور ان کے بارے میں کلماتِ تحسین و اعتراف ان کی زبان پر آتے رہتے تھے اور گفتگو کا انداز اس حد تک شریفانہ ہوتا تھا جیسے وہ اپنے مخاطب سے کچھ سیکھ رہے ہوں۔ سکھانے والا انداز وہ کبھی اختیار نہیں کرتے تھے۔

Marfat.com

دوسروں کی صلاحیتوں کا اعتراف اور اپنے چھوٹوں پر شفقت و مرحمت کی نظر برابر رہتی تھی۔ یہ بڑی بات تھی کہ حکیم صاحب کو کسی طرح کا کمپلیکس نہیں تھا۔ اسی لیے وہ بے تکلف بات بھی کچھ اس طرح کرتے تھے کہ جیسے اس پر دھیان رکھتے ہوں کہ جہاں بے تکلفی ہو وہاں تکلف انتہائی ضروری ہو جاتا ہے۔

حکیم صاحب نے بہت کام کیا اور بقول شخصے اس علم و عمل کے ''پتلے'' کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہیں تھا۔ اللہ پاک نے ان کو اپنی خصوصی نعمتوں اور رحمتوں سے نوازا تھا، جس کا سب سے خوش آئند اثر ان کے حسنِ سلوک اور جذبۂ خلوص و خدمت سے ظاہر ہوتا تھا۔

اس زمانہ کی بات الگ رہی جب وہ بیمار تھے یا کبھی بیمار رہے ہوں گے ورنہ ان کے معمولات میں کبھی فرق نہیں آیا اور اس میں مریضوں کو دیکھنا، اپنے ادارے کے معاملات سے باخبر رہنا اور اس کے ایک ایک پہلو پر نظر رکھنا یہ کہیے کہ ان کے معمولات کا حصہ تھا اور اسی میں وہ مجھ ایسے اپنے کسی نیازمند کے لیے بھی وقت نکالتے تھے اور اپنی شریفانہ گفتگو اور عملی نکتہ سنجیوں سے اس گفتگو کو روشن اور شفاف بناتے تھے۔

ان کا بڑا کام یہ ہے کہ انھوں نے ایک ناسازگار ماحول میں فنِ طب کی بقا اور فنِ دواسازی کے اعلیٰ معیار کو قائم رکھا۔ ہماری توجہ اس طرف بہت کم جاتی ہے اور اس کی وجہ معلومات کی کمی نہیں طریقۂ رسائی کی کوتاہی ہے کہ فنِ طب کا تعلق ہماری تہذیب اور تاریخ سے بہت گہرا ہے اور مختلف اعتبارات سے وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ ہمارے فنِ تعمیر، فنِ مصوری اور فنِ موسیقی کو فنِ طب سے جو قوسِ قزح جو رنگا رنگ رشتہ ہے، ہم نے بہت کم اسے فنِ طب کی روشنی میں دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے یہاں سقف و ستون، منبر و محراب اور دریچہ و دروازہ فنِ طب سے ایک گہرا رشتہ رکھتے ہیں۔ اس میں خشت و سنگ کا استعمال، منبر و محراب اور دریچہ و در جن نسبتوں کے ساتھ بنائے جاتے ہیں، اگر ان پر نظر ڈالی جائے تو ان کا صحت اور حفظانِ صحت سے ایک ناقابلِ شکست رشتہ ملے گا۔

فنِ مصوری کا فنِ طب سے جو گہرا تعلق رہا ہے ہم نے کبھی اس پر بھی غور نہیں کیا۔ اسپین، مرکزی ایشیا، عراق، یمن اور ہندوستان میں فنِ طب کے ایسے مخطوطے ملتے ہیں، ان میں امراض کی کیفیت اور مریض پر اس کی نفسیات کو جن تصویروں اور مرقعوں کے

Marfat.com

سانچے میں ڈھالا گیا ہے اس سے پتہ چلا کہ فنِ مصوری کو فنِ طب کی فکری اور فنی رسائیوں نے کہاں تک متاثر کیا۔

راقم الحروف کو ایسے مخطوطوں سے گزرنے کا موقع ملا ہے، جن میں تصویروں کے رنگ، ان کے خاکوں اور تاثراتی مرقعوں کو تحریر کے ساتھ تصویر کے فن سے بھی گہری مناسبت رہی ہے۔ تاثرات ان تصویروں میں بطورِ خاص دیکھنے کے لائق ہیں جہاں مرض، علاج اور عملِ جراحی کے اثرات کو چہرے، پیشانی اور آنکھوں پر ظاہر کیا گیا ہے۔ مجھے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ فنِ طب کے مخطوطوں میں ایسے مخطوطے بھی ملتے ہیں کہ جہاں دواؤں کی مدد سے پانی کی تاثیر بدلی گئی اور اس کے وسیلے سے پھر پتھروں میں نازک نقاشی ممکن ہوئی۔ راگ راگنیوں کا انسانی نفوس، ارواح اور قلوب پر جو اثرات ہوتے ہیں ان کو بھی فنِ طب میں پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ علم قرائن، قیاس اور قیافے سے بھی فنِ طب میں بہت غیر معمولی مدد لی گئی ہے۔ اس نوعیت کے لطائف، قصہ اور حکایات بھی فنِ طب کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں میں ملتے ہیں۔

حکیم صاحب سے اکثر ان امور پر تبادلۂ خیال بھی ہوا اور حکیم صاحب نے اپنے اس گوشۂ فکر کو بھی سامنے آنے کا موقع دیا کہ فنِ طب کی کوئی تہذیبی تاریخ بھی مرتب ہونی چاہیے۔ اب معلوم نہیں وہ اپنے اس خیال کو عملی جامہ کیوں نہیں پہنا سکے۔ جب کہ مرحوم کے یہاں خیال و عمل کی پرچھائیاں ایک ساتھ حرکت کرتی تھیں۔ فنِ طب کی تاریخ اور اس کے تہذیبی رشتے کس طرح مرحوم کی نظر میں رہے، اس کا اندازہ ہمدرد نرسنگ ہوم، آصف علی روڈ کے گیسٹ ہاؤس کی ایک سے زیادہ تصویروں سے ہوتا ہے جن میں شیخ رئیس بوعلی سینا اور دوسرے نابغوں کی جاذبِ توجہ اور فکر انگیز تصویریں موجود ہیں۔ کاش حکیم صاحب اپنے اس خیال کو بھی عملی جامہ پہنا سکتے کہ فنِ طب کی تہذیبی تاریخ اس طرح مرتب ہوتی کہ اس میں ہماری ثقافتی تاریخ کے ارتقائی گوشے سامنے آجاتے۔ ہمدرد نگر تغلق آباد حکیم صاحب کی آخری آرام گاہ بھی ہے لیکن وہ ان کے خواب اور خوابوں کی تعبیرات کے ایسے مرقعوں کا تصویر کدہ بھی ہے جہاں ہم حکیم صاحب کے ذہن، زندگی اور زمانے کو بیک وقت منجمد اور متحرک دیکھ سکتے ہیں۔

Marfat.com

حکیم صاحب، خدا ان کی روحِ پرفتوح کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ان کی خاک کو عنبرین فرمائے۔ مرحوم بے حد خوش قسمت اور خوش کردار انسان تھے۔ انھوں نے اپنے ادارے کو جس کے وہ سربراہ تھے بہت سے اداروں میں بدل دیا اور اس کی بہت سی شاخیں ملک بھر میں پھیل گئیں۔ یہ صرف ایک ادارۂ تجارت کی ہی کامیابی اور ترقی نہیں بلکہ ایک تہذیب، ایک تاریخ اور ایک روایت کی نئی زندگی کی روشن علامت بھی ہے۔ فنِ طب کو زندہ رکھنا ایک فلسفۂ علم و عمل کو نئی زندگی بخشنے کی کوشش کرنا بھی ہے۔

حکیم صاحب نے ہمدرد صحت کے ذریعہ ایک طویل زمانے تک فنِ طب کو نیز اس کی جہت نمائیوں کو آج کے دور میں روشناس کرنے کی سعیٔ مشکور فرمائی اور اپنے لیے قوم اور ملک سے جو کچھ لیا اس سے کہیں زیادہ اپنے اداروں کی شکل میں اسے اپنے علم و عمل اور فکر و فن کی نئی ترقیوں اور ترقی کی نئی جہتوں کی شکل میں واپس دیا بھی۔

خوش قسمت وہ ہی نہیں ہوتا جسے خاندان یا دوسرے اشخاص کے ذریعہ بہت کچھ مل جائے بلکہ وہ شخص ہوتا ہے جو دوسروں کو بہت کچھ دے جائے۔

□□

Marfat.com

ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ

پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی

خدا سلامت رکھے دلّی اردو اکادمی والوں کو جنھوں نے دلّی اور دلّی والوں کی یادوں کو محفوظ رکھنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جو پرانی دلّی کی یادیں کلیجے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ بہت سے تو ان داستانوں کو سینے میں لیے منوں مٹی کے نیچے پہنچ گئے۔ بزرگوں کو یاد کرنا سعادت مندی بھی ہے اور دانش مندی بھی۔ جو قوم اپنا ماضی بھول جاتی ہے اس کا اپنا مستقبل بھی نہیں ہوتا۔ یادِ ماضی بے سود نہیں ہوتی البتہ اس کے استعمال کا سلیقہ آنا چاہیے۔

میں اکادمی والوں کا شکر گزار ہوں کہ پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی کے متعلق خاکہ لکھنے کا مقدس فرض مجھے سونپا گیا ہے۔ دلّی اور دلّی والوں کے متعلق قلم اٹھانے سے پہلے بار بار یہی خیال آتا ہے "اور بستی نہیں یہ دلّی ہے" اس عالم میں انتخاب شہر کے متعلق کچھ قلم بند کرنے کے لیے جو سلیقہ، معلومات، زبان و بیان پر قدرت ہونی چاہیے وہ مجھ میں کہاں لیکن پھر بھی دل کا تقاضہ یہی ہے 'گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را' اور جب دل کا معاملہ ہو تو عقل محوِ تماشائے لبِ بام رہ جاتی ہے۔

اگر میں بیتے زمانے کی بات کروں تو مجھے ماضی پرست نہ سمجھا جائے لیکن اتنے حسین ماضی کو یکسر فراموش کر دینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ تمنا ہوتی ہے میں کہوں اور سنا کرے کوئی۔ آج کی چمک دمک اور بھاگ دوڑ کی زندگی میں جب کہ لوگ علیک سلیک تک کے روادار نہیں ہیں، ایئر کنڈیشنڈ کمروں نے دل اتنے سرد کر دیے ہیں کہ میل جول میں گرمجوشی نہیں رہی، جسے دیکھیے ہجوم شہر میں تنہا جی رہا ہے۔ اگر ایسے میں دلّی اور دلّی والوں کا پرانا

Marfat.com

فسانہ سنانے کی فرمائش ہو تو یہی گمان گزرتا ہے، لوگ باقی ہیں ابھی اگلے زمانے والے۔

پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی کا انتقال پر ملال ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۲ء کو ہوا، اس وقت راقم الحروف کی عمر ۸ برس کی تھی۔ اس لیے خاکہ نگاری کے لیے جن تفاصیل کی آج ضرورت ہے وہ میرے پاس موجود نہیں۔ ساحر صاحب کی شخصیت سے میں بچپن سے ہی متاثر رہا ہوں۔ ان کی ایک تصویر میری البم میں موجود ہے۔ ایک شعر اس وقت سنا تھا جو دل پر نقش ہو گیا تھا:

کوئی حرم سے دیر سے منسوب ہے کوئی
اک رہ گیا ہوں میں کہ تمھارا کہیں جسے

خمخانۂ جاوید کی جلد چہارم میں یہ شعر اس طرح لکھا گیا ہے:

منسوب کفر دیر سے ایماں حرم سے ہے
اک رہ گیا ہوں میں کہ تمھارا کہیں جسے

میں نے قبلہ والد صاحب کی توجہ ادھر مبذول کرائی تو انھوں نے ساحر صاحب کا دیوان کفرِ عشق میرے حوالے کیا میں نے ورق گردانی کی تو زیادہ تر اشعار میری سمجھ میں نہ آئے لیکن جتنا بھی میں سمجھ سکا اتنا بھی ساحر صاحب کی عظمت مرے دل پہ نقش کرنے کے لیے کافی تھا۔ موصوف کی عادات واطوار کے متعلق والد محترم عالی جناب امن لکھنوی سے جو سنا وہ پیشِ خدمت ہے۔ جناب آنند موہن زتشی گلزار دہلوی کے پاس بھی پرانی دلّی کی یادوں کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ میں نے ان سے بھی اس معاملے میں گفتگو کی میں ممنون ہوں کہ جناب گلزار صاحب نے اس سلسلے میں میری مدد فرمائی۔ اس مقالے کو قلم بند کرنے کے لیے دلّی کے کچھ کتب خانوں کو کھنگالا لیکن افسوس ہے کہ اس عظیم ہستی کے متعلق جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۴۲ء تک دلّی کی ادبی فضا پر چھائی رہی، معلومات محفوظ نہیں کیا، یہ محسن فراموشی نہیں ہے۔ اردو اکادمی کے کتب خانہ دارا شکوہ لائبریری مبارک کی مستحق ہے کہ وہاں ساحر صاحب کا مجموعۂ کلام ''کفرِ عشق'' موجود ہے۔

دبستانِ دلّی کی اپنی الگ شناخت رہی۔ معیار بندی اور تخلیقی رجحانات کو پروان چڑھانے میں سخنورانِ دہلی کا نمایاں حصہ رہا۔ تغزل دلّی کی خصوصیت ہے جس میں سادگی و

Marfat.com

پرکاری کو فوقیت دی گئی لیکن غزل کا دائرہ زیادہ تر حسن و عشق پر محیط رہا۔ غالب نے ایک راستہ اختیار کیا مگر ان کے کلام میں بھی ڈھول ڈھپا کی معاملہ بندیاں شامل رہیں۔ داغ اور ان کے تلامذہ نے اردو زبان کی جو خدمت کی زمانہ اس کا معترف ہے۔ ان ماہرینِ سخن نے روز مرہ اور محاورہ کی صحت، تراکیب درستی بندش کی چستی، زبان کی سلاست و فصاحت کے ساتھ ہی لہجہ اور اندازِ بیان پر خاص نظر رکھی لیکن وصل و ہجر کے مضامین، عاشق کی نفسیاتی کیفیات، محبوب کی دلربائی اور سراپا نگاری کے بیان نے سامعین کو عشق و محبت کی مجازی منزلوں میں گم کر دیا۔ اس دور میں تو اس قسم کی شاعری کو قبولِ عام کی سند ملی لیکن شعر و ادب زندگی کے اصل مقصد سے الگ ہوتے گئے۔

بیسویں صدی کے دوسرے دہے میں دلّی میں ایک نیا مکتبِ سخن وجود میں آیا جس نے سخنوروں اور سامعین کو متاثر کیا۔ یہ نیا مکتبِ شاعری نہ تو غزل کی روایتی حد بندیوں میں جڑا ہوا تھا نہ ملی اور قومی شاعری کا نقیب تھا۔ یہ شعر اتصوف، یوگ، ویدانت، توحید و معرفت کے مضامین جامۂ شعری میں سامعین کے سامنے پیش کرتے تھے۔ پنڈت دینا ناتھ مجزؔ، پروفیسر تربھون ناتھ زتشی زارؔ دہلوی، پنڈت برج کشور زتشی شورؔ دہلوی، ویدانت رتن سورج نرائن مہرؔ دہلوی جیسے عالم اس نئی تحریک کے علمبردار تھے اور روحِ رواں تھے سخنورِ سحر زبان، ناظم جادو بیاں، صوفیٔ روشن خیال عالی جناب پنڈت امرناتھ ساحرؔ دہلوی جنھیں ہندوؤں کے یوگ ابھیاس، ویدانت اور اسلام کے تصوف و معرفت کے رموز سے اچھی واقفیت تھی۔ ان کی بزمِ سخن میں اسی قسم کے کلام کو ترجیح دی جاتی تھی۔

حالاتِ زندگی: ساحر صاحب کے والد قبلہ کے برادر کلاں عالی جناب پران ناتھ برٹش فوج میں صوبیدار تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز دور میں افسر اعلیٰ کے یہاں جاتے ہوئے راہ میں گولی لگ جانے سے جاں بحق تسلیم ہوئے۔ سرکار نے ان کی وفاداری اور جنگی خدمات کے صلہ میں ان کے برادرِ اصغر پنڈت جانکی ناتھ مدن کو جن کی عمر اس وقت ۱۶ سال کی تھی سرکاری خزانچی اور رجمنٹ کا میر منشی مقرر کیا۔ جانکی ناتھ جی تقریباً ۱۳ برس تک اسی محکمہ میں کام کرتے رہے۔ ۱۸۷۰ء میں آپ یہ ملازمت ترک کر کے دہلی آ گئے اور یہاں اکاؤنٹینسی کے امتحان میں کامیابی حاصل کر کے ۱۸۷۲ء سے ۱۸۹۸ء تک

Marfat.com

ریلوے میں ملازم رہے۔ خاندانی خدمات کے صلہ میں آپ کو پنشن ملی (جو ملازمت کے زمانے میں مشاہرہ تھا) اور رائے بہادر کے خطاب سے نوازے گئے۔ پنڈت جانکی ناتھ جی کا مشغلہ خاص تھا علمی اور فلسفیانہ کتب کا مطالعہ، ترجمہ، تصنیف و اشاعت۔ وہ مشقِ سخن بھی کرتے تھے۔ ان کا تخلص تھا 'بے جان'۔ جناب پنڈت امرناتھ ساحرؔ اور پنڈت دینا ناتھ معجزؔ کو یہ انمول سرمایہ وراثت میں ملا۔

ساحرؔ دہلوی جانکی ناتھ جی کے خلفِ اکبر تھے جن کی ولادت ۲۹/مارچ ۱۸۶۳ء کو بانس بریلی میں ہوئی۔ ساحر صاحب ۷ برس کی عمر میں دلّی آ گئے اور بارہ سال کی عمر میں پنڈت پرشاد رام رازداں کے شاگرد ہوئے۔ تین چار سال میں ہی اردو فارسی میں خاصی مہارت حاصل کر لی۔ لڑکپن میں ہی آپ کو اردو اور فارسی شعرا کے ہزاروں اشعار یاد تھے، جنھوں نے ان کی طبیعت میں شاعرانہ استعداد، قابلیت و ذوق پیدا کر دیا۔

انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اکبر آباد گئے اور وہاں کئی برس قیام کیا۔ یہاں مہرؔ، آغاؔ، صوفیؔ، ماہؔ، صفیؔ جیسے سخنورانِ باکمال کے ساتھ مشاعروں میں شرکت فرمائی۔ آپ نے پہلے فارسی زبان میں شعر کہنے شروع کیے۔ مولانا عبدالحلیم کاشانی سے تلمذ حاصل کیا۔ بسلسلۂ ملازمت ۲۲ سال کی عمر (۱۸۸۵ء) میں آپ اجمیر تشریف لے گئے اور وہاں اردو میں مشقِ سخن شروع کی۔ دہلی کے مشاعروں میں بھی شریک ہوئے۔ پنڈت جواہر ناتھ ساقیؔ اور منشی رام رچھپال شیداؔ کے آپ ہم عصر و ہم ذوق تھے۔ دلّی کے معمر سخنوروں مستان شاہ کابلی، منشی بہاری لال مشتاقؔ، میر شاہجہاں کاملؔ کے ساتھ مشاعروں میں کلام پڑھا اور دادِ سخن حاصل کی۔

ساحر صاحب برسوں عہدۂ تحصیلداری پر فائز رہے۔ ۱۸۷۷ء میں ایک پرچہ سحرِ ساحر بھی شائع کیا لیکن ملازمت کی مجبوریاں مانع ہوئیں جس کے سبب شعر گوئی کے مواقع بہت کم ہو گئے۔ ۱۸۹۵ء میں آپ شملہ پہنچے تو مناظرِ قدرت نے شاعرانہ جذبات کو ابھارا لیکن فرائضِ تحصیلداری حائل ہوئے۔ شاعری کا مشغلہ قائم تو رہا لیکن ذوقِ سخن کو جلا ملی جب ۱۹۱۱ء میں آپ ملازمت سے سبکدوش ہو کر دلّی تشریف لائے اور بیشتر وقت روحانیت اور شعر و ادب کی خدمت میں صرف کرتے رہے۔ ۱۱/ستمبر ۱۹۴۲ء میں آپ نے

Marfat.com

انتقال فرمایا۔

ساحر صاحب کو گنجیفہ کھیلنے شوق تھا۔ روزانہ کے ساتھ کھیلنے والوں میں پروفیسر زار دہلوی، پنڈت برج کشور شور دہلوی، بشیشر ناتھ شیو پوری، رائے صاحب کاشی پرشاد در وغیرہ تھے کبھی کبھی کھیلنے والوں میں حکیم محمود علی خاں ماہر دہلوی، حکیم مدن لال مدن، چنڈی پرشاد نگم شیدا دہلوی شریک ہو جاتے تھے۔

ریٹائرڈ تحصیلدار اور پنشن خوار سرکار انگلشیہ ہونے کی وجہ سے وہ ایسی محفلوں سے دور ہی رہتے تھے جہاں سیاسی نظمیں یا غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ والد محترم عالی جناب گوپی ناتھ امن لکھنوی نے مجھے ۱۹۲۵ء میں میرٹھ شہر کے ایک مشاعرے کے متعلق بتایا تھا جس کا اہتمام برہم سروپ سوتی خار میرٹھی نے کیا تھا اور صدر تھے جناب ساحر صاحب۔ غالباً دیوالی کا موقعہ تھا۔ ساحر صاحب ریل سے تشریف لائے تھے اور خار صاحب انھیں اسٹیشن سے فٹن پر لائے تھے۔ جیسے ہی وہ مشاعرہ گاہ میں تشریف لائے سبھی لوگوں نے کھڑے ہو کر ان کی تعظیم کی۔ ساحر صاحب نے بزرگانہ انداز میں مسکراتے ہوئے سلام کیا۔ ایک وسیع چبوترے پر نشست شروع ہوئی۔ خار صاحب کانگریسی تھے اس لیے سامعین میں بہت سے کانگریسی حضرات بھی موجود تھے۔ اس واقعہ کے متعلق امن صاحب یوں رقم طراز ہیں:

> ''مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ ساحر صاحب ریٹائرڈ تحصیلدار اور انگریزی حکومت کے پنشن خوار ہونے کی وجہ سے سیاسی موضوعات پر کچھ کہنے سے ہی نہیں بلکہ سننے سے بھی احتراز کرتے ہیں۔ خاص طور پر سرکار دشمن کلام سے دور ہی رہتے ہیں۔ میرٹھ کے اس طرحی مشاعرے کی زمین تھی ''ڈرتے ڈرتے جائیں گے''۔ میری غزل سیاسی رنگ میں تھی یہ وہ زمانہ تھا جب گاندھی صدرِ کانگریس تھے۔ میری غزل کا مطلع تھا:
>
> ہوں گے وہ جور آزما لیکن مکرتے جائیں گے
> نالہ ہائے دل انھیں بدنام کرتے جائیں گے
>
> یہ تو خیر تغزل بھی سمجھا جا سکتا تھا جیسے ہی میں نے یہ شعر پڑھا:

Marfat.com

رائے صاحب مغربی تہذیب سے واقف نہیں
جائیں گے دربار میں تو ڈرتے ڈرتے جائیں گے

ساحرؔ صاحب کی نظریں اٹھیں میں نے اگلا شعر پڑھا:

اک طرف قومی نظر ہے اک طرف تیغِ ستم
جو چڑھیں گے اِس طرف اُس گھاٹ اترتے جائیں گے

ساحرؔ صاحب کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ جیسے ہی میں نے یہ شعر پیش کیا:

قحط اگر پڑتے رہے اور ٹیکس یوں بڑھتے رہے
مرنے والے اور بھی بے وقت مرتے جائیں گے

ساحرؔ اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے 'حضرات یہ اور قسم کی محفل ہے، مجھے رخصت کی اجازت دیجیے'۔ میں نے کہا 'حضور میں ہی اٹھا جاتا ہوں'۔ اس کے بعد مشاعرے میں ہنگامہ بپا ہو گیا۔ سامعین مانگ کر رہے تھے کہ یہ غزل ضرور پڑھی جائے گی، لیکن منتظمین کا رویہ دوسرا ہی تھا۔ ساحرؔ صاحب یہ منظر دیکھ کر چیں بہ جبیں ہوئے مگر بیٹھے رہے۔ بہر حال اس بے لطف پہلی ملاقات کے بعد مجھے یہ بات دکھ دے رہی تھی کہ ساحرؔ صاحب کی طبیعت کو ٹھیس پہنچی۔ میں تلافی کے لیے ایک دن دلّی آ کر ساحرؔ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان سے معذرت کی۔ انھوں نے بھی بزرگانہ انداز معذرت کی۔ اپنی لکھی ہوئی کتاب ''سحرِ ساحر'' اور اپنے والد کی تصنیف کردہ ایک کتاب مرحمت فرمائی ساتھ ہی بزمِ سخن کے سالانہ مشاعرے میں شریک ہونے کا دعوت نامہ بھی بھیجا''۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جناب ساحرؔ صاحب اور امنؔ صاحب کے تعلقات میں کوئی تلخی نہیں رہی بلکہ ساحرؔ صاحب کے مجموعۂ کلام 'کفرِ عشق' میں جناب امنؔ صاحب کی لکھی تقریظ کو بھی شائع کیا گیا۔ یہ ہے بزرگوں کی شفقت اور وسیع القلبی کی ایک مثال۔

میرے ذہن میں ساحر صاحب اور ان کی لال حویلی میں بزمِ سخن کی نشست کا ایک دھندلا سا نقش باقی ہے۔ لال حویلی چوڑی گران میں مہینے کے آخری ہفتے کو ادبی نشستیں

Marfat.com

منعقد ہوتی تھیں۔ ساحرؔ باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ دبلا پتلا، اکہرا بدن، گورا رنگ، چوڑا ماتھا، روشن آنکھیں جن پر سنہری فریم کی عینک، سفید لمبی داڑھی، رعب دار آواز، گھر پر لمبا کرتا کشمیری طرز کی واسکٹ پہنتے تھے جس پر رنگین بیل بوٹے بنے ہوتے تھے لیکن نشستوں یا محفلوں میں گول ٹوپی، اچکن، تنگ مہری کا پاجامہ اور وصلی جوتی یا پمپ شو پہنتے تھے۔ ہاتھ میں چھڑی لے کر چلتے تھے۔

ساحرؔ صاحب سنجیدہ اور ضابطہ پسند تھے۔ محفل میں بار بار پہلو بدلنے یا پاؤں پھیلا کر بیٹھنے کو معیوب خیال کرتے تھے۔ محفل میں جب کوئی شاعر کلام پیش کر رہا ہو اور ذرا بھی آواز یا بات چیت ہوئی تو ساحرؔ صاحب کی آواز سنائی دیتی تھی 'صاحبان!' یا 'بندہ نواز یہ بزمِ ادب ہے' اور ان کی ایک آواز سے ہی ہر طرف سناٹا چھا جاتا تھا۔

یوں تو گھر پر روزانہ ہی علما اور اکابر جمع ہوتے تھے لیکن اتوار کے دن زیادہ حضرات آتے تھے اور ساحرؔ صاحب سے ویدانت، تصوف، اسلامیات وغیرہ موضوعات پر تبادلۂ خیالات ہوتا۔ ساحرؔ صاحب بے تکان گھنٹوں بولتے رہتے۔ مولانا حسرت موہانی نے ایک دن پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی سے کہا تھا 'میاں بڑے خوش قسمت ہو کہ ایسے جید عالم اور استادِ فن سے استفادہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے'۔ خواجہ حسن نظامی ہندو ویدانت درشن کے متعلق ساحرؔ کے خیالات سے مستفیض ہوتے تھے۔

ساحرؔ صاحب مشاعروں میں شریک ہوتے تھے تو معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ ایک دفعہ ریڈیو والوں نے معاوضہ پیش کیا تو انھوں نے خفا ہو کر فرمایا 'کیا آپ حضرات نے مجھے کسبی سمجھا ہے'۔ جناب پریم پال اشک صاحب نے راقم الحروف سے یہ فرمایا تھا کہ جناب ساحرؔ صاحب سے بہت درخواست کی گئی تو انھوں نے ایک روپیہ لینا منظور فرمایا۔ بیرونِ دلّی مشاعروں میں شریک ہونے جاتے تھے تو انٹر کلاس میں سفر کرتے اور کرایہ بھی منتظمین سے نہ لے کر اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔

پنڈت جی پریم گیانی تھے۔ کیا کیا پریشانیاں لاحق رہیں مگر آپ کی وضع میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ کتنے ہی غم اٹھائے لیکن نہ تو ماتھے پر ذرا بھی شکن پڑی اور نہ ہی زبان پر کوئی حرفِ شکایت آیا۔ خوشی اور غم دونوں ہی حالتوں میں دماغ و دل کی حالت یکساں بنائے

Marfat.com

رکھنے کی تلقین شری مد بھاگوت گیتا میں دی گئی ہے۔ قائم العقل کی یہی پہچان ہے۔ ہر حال میں آن بان قائم رہی، رکھ رکھاؤ میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔

ساحر صاحب میدانِ شاعری کے علمبردار ہیں۔ نثر میں بھی آپ کا پایہ بہت بلند ہے۔ سفیر کشمیر، کشمیر پرکاش وغیرہ میں آپ کے اخلاقی مضامین شائع ہوتے رہے۔ ۱۸۷۷ء میں 'سحرِ ساحر' ایک پرچہ بھی شائع ہوا۔ متعدد کتابوں کے مترجم، مولف و مصنف ہیں۔ چھ حصوں میں فسانۂ توحید کے نام سے وشنو پران کا ترجمہ کیا۔ جلوہ جہاں نما کے نام سے اردو میں بھگوت گیتا کے گیارہویں باب وراٹ روپ خلاصہ کو نظم کیا۔ شنکر آچاریہ کے ''تتو بودھ'' اور آتم بودھ کو اردو میں رسالۂ اسرارِ حقیقت اور رسالہ رموزِ معرفت کے نام سے پیش کیا۔ پنڈت پران کشن کی کتاب 'رازِ معرفت' کو مرتب کیا۔ انگریزی شاعروں کے خیالات کو بھی اپنی زبان کے سانچے میں ڈھال دیا، لیکن آج یہ کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ آپ کا فارسی کلام شائع نہ ہوسکا۔ آپ کا ظریفانہ کلام بھی خوب ہے۔ راقم الحروف کو یہ کلام ابھی تک حاصل نہیں ہوسکا۔ صاحب تصانیفِ کثیرہ ہوتے ہوئے بھی آپ میں ذرا بھی تعلّی نہیں، غرور نہیں ہے۔ آپ کے کلام میں حقائق و معارف کے موضوعات و مضامین کا گنج گرانمایہ موجود ہوتے ہوئے بھی آپ فرماتے ہیں:

شہید نغمۂ عشق و فنا ہوں اے ساحرؔ
کسے خبر ہے رنگِ سخنوری کیا ہے

کن کن زمینوں میں کیا کیا فلک پیمائیاں کی ہیں مگر کسرِ نفسی ملاحظہ ہو:

میں ننگِ دہلی ہوں ننگِ سخنوراں ساحرؔ
اساتذہ کی زباں کیا کروں وہاں میں نہیں

کلامِ ساحر میں فارسیت غالب ہے۔ کہیں کہیں اشعار ادق ہوجاتے ہیں۔ چنڈی پرشاد نگم شیدا دہلوی فرماتے ہیں کہ دیوانِ کفر میں صناعِ ازل کی صناعی میں وہ بے بہا اشعار تحریر کیے گئے ہیں کہ سرسری نگاہ سے دیکھنے والوں کی آنکھوں سے بھی غفلت کے پردے ہٹ جاتے ہیں۔ پختگیٔ فن کی دلیل یہ ہے جو لفظ جس موقعہ پر سجادیا وہ آپ اپنی نظیر ہے۔ علامہ برجموہن کیفی فرماتے ہیں ساحر کے اشعار وارداتِ قلبی کا آئینہ ہے۔ کل دیوان ایک

Marfat.com

دفتر ہے معرفت اور عشق الٰہی کا۔ پروفیسر زاؔر دہلوی فرماتے ہیں' جناب ساؔحر کے کلام کے متعلق عام اعتراض یہ ہے کہ وہ مشکل اور سنگلاخ الفاظ زیادہ استعمال کرتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کوئی دوسرا شاعران باریک رموز کو زیادہ سریع الفہم اور آسان زبان میں بیان کرسکتا ہے۔ مثال کے طور پر:

ہے صدائے نون غنہ پردہ دار حرف وصوت
نغمہ ہم آہنگ ہے ہر پردۂ ناساز پر

اس شعر میں ساؔحر صاحب کی رائے نون غنہ سے اوم کی بندی جس کی صدا حلق سے دماغ کی طرف جاتی ہے جب دماغ میں گھر کرتی ہے تو یوگی کو اہند شبد سنائی پڑتا ہے۔ شبد آکاش کا گن ہے اور عالم مادی میں آکاش لافانی ہے۔ صدائے نون غنہ آکاش میں لے ہوجاتی ہے اس لیے اسے پردہ دار حرف وصوت کہا گیا ہے۔ دوسرے مصرع میں سہوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ صدا ہر ذی روح میں ہوتی ہے اس لیے پردۂ ناساز کہا گیا ہے۔

پورے دیوان میں صرف ایک غزل عامیانہ رنگِ تغزل میں ہے۔

کس ندانست کہ منزل گہہ معشوق کجاست
ایں جز ہست کہ بانگ جرسے می آید
(حافظ)

جناب گوپی ناتھ امؔن لکھنوی فرماتے ہیں کہ' حضرت ساؔحر ایک معنی میں غزل گو ہیں اور دوسرے معنی میں نظم گو۔ بہ اعتبار صورت ان کا کلام غزل ہے بہ اعتبار معنی نظم ہے'۔

نہایت متین، با اخلاق اور منکسر المزاج سخنور جناب ساحر دہلوی قصیدہ، رباعی، قطعہ، مخمس، مسدس غرض جملہ اصنافِ سخن پر قادر ہیں۔ بندش کی خوش اسلوبی قابلِ داد ہے۔ زبان نہایت صاف ہے۔ آپ خدوخال، شاہد وساغر کے پیرایہ میں جو عارفانہ خیالات ادا کرتے ہیں وہ صاحبانِ ذوق پر وجد کا عالم طاری کردیتے ہیں۔ بازاری جذبات اور عامیانہ مذاق سے آپ کی شاعری کو کوئی تعلق نہیں:

دل کی تسکین کو کافی ہے پریشاں ہونا
ہے توکل بخدا بے سرو ساماں ہونا

Marfat.com

کور دیدہ ہے جسے دعویٰ بینائی ہے
شرط اول ہے یہاں دیدۂ حیراں ہونا

دور جب دل سے حجابِ شب عصیاں ہوگا
چہرۂ شاہد مقصود نمایاں ہوگا

ملا ہے جسم ہمیں امتیاز جاں کے لیے
بشر وجود میں آیا ہے امتحاں کے لیے

پیا ہے میکدۂ عشق میں وہ جامِ فنا
کہ بے خودی میں نہ صورت رہی نہ نام رہا

کیفِ مستی میں عجب جلوۂ یکتائی تھا
تو ہی تو تھا نہ تماشہ نہ تماشائی تھا

سرِ عرشِ بریں ہے زیرِ پائے پیر میخانہ
کمال اوج پر ہے حسنِ عالمگیر میخانہ

قائم ہے کُن سے پردۂ پندار کا وجود
ثابت ہے لَن ترانی سے تیرا کمال بھی

امید و بیم، ثواب و عذاب سے چھوٹا
صفائے قلب سے ساحرؔ ترا غلام رہا

ساحرؔ صاحب نے طرحی مشاعروں کے لیے بھی جو غزلیں کہیں ان میں ایک خاص رنگ سخن موجود ہے۔ ہر غزل کا کوئی نہ کوئی مسئلہ توحید و تصوف کا موضوع ہے۔ ہر شعر ایک شرح چاہتا ہے اور کلام میں مقاصد کی یکجائی نظر آتی ہے:

Marfat.com

ذات قائم تھی بذات اور صفت تھی معدوم
کُن نہ تھا معرکۂ انجمن آرائی تھا
پردہ در کوئی نہ تھا اور نہ در پردہ کوئی
غیرتِ عشق نہ تھی عالمِ تنہائی تھا
بزم میں تو نے جو الٹا رخِ روشن سے نقاب
ایک عالم تیرے جلوہ کا تماشائی تھا

عالیجناب ساحر دہلوی کا تذکرہ بغیر بزمِ سخن کے نامکمل رہے گا۔ حکیم اجمل خاں صاحب نے ایک بزمِ سخن قائم کی تھی جس کی ذمہ داری وہ رامپور جاتے ہوئے جناب ساحر صاحب کو سونپ گئے۔ بزمِ سخن کی ماہانہ نشستیں ان کے دولت کدے پر منعقد ہوتی تھیں۔ سن عیسوی کے اختتام پر سالانہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ جس میں دلّی اور بیرونِ دلّی کے باکمال شعرا شریک ہوتے تھے جن میں سے کچھ اسمائے گرامی ہیں: احسن مارہروی، نوح ناروی، امجد حیدرآبادی، سیماب اکبرآبادی، آنند نرائن ملا، اثر لکھنوی، دل شاہجہاں پوری، سائل دہلوی، جوش ملسیانی، عرش، ندرت میرٹھی، جوش، جگر، بہزاد، سراج، مجاز، حفیظ جالندھری، زار، شور، رونق، حیدر دہلوی، امن لکھنوی، ادیب لکھنوی، سلطان احمد، دیوان اٹل جے پوری، اکبر حیدری، راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی وغیرہ۔ اردو مشاعروں کے علاوہ ہندی اور فارسی کی شعری نشستوں کا الگ اہتمام ہوتا تھا۔ بزمِ سخن کے جشنِ سیمیں (۱۹۳۶ء) میں جو سالانہ مشاعرہ ہوا اس میں دلّی کے ۵۰ اور بیرونِ دلّی کے ۲۵ شعرا شریک ہوئے۔ کئی نشستوں میں یہ مشاعرہ چلا۔ تین طرحی نشستیں ہوتی تھیں ایک غیر طرحی۔ ساحر صاحب کے انتقال کے ساتھ ہی یہ بزم بھی ختم ہوگئی۔ ابھی حال ہی میں گلزار دہلوی اور پنڈت دینا ناتھ معجز کے صاحبزادے نے اسی کمرے میں ایک نشست کی تھی جس میں بزمِ سخن کی ماہانہ نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ بزمِ سخن میں صفِ سامعین میں بھی اعلیٰ پایہ کے حضرات ہوتے تھے۔ خان بہادر ناصر حسین، امام جامع مسجد، لالہ دیش بندھو گپتا وغیرہ۔ نشستیں بہت ستھری ہوتی تھیں۔ بزمِ سخن میں کیوں کہ نواب سائل شریک ہوتے تھے اس لیے بیخود دہلوی شریک نہیں ہوتے تھے۔ بیخود صاحب کے والد اور چچا شرکت فرماتے تھے۔ ساحر صاحب یہ فرمایا کرتے تھے

Marfat.com

'بیخود کے شریک نہ ہونے کا مجھے ملال ہے لیکن یہ کم ہے کہ ان کے والد اور چچا تو تشریف لاتے ہیں'۔ سالانہ مشاعرے کی کارروائی آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوتی تھی۔

اب نہ وہ دلّی رہی نہ وہ مشاعرے۔ سامعین کا مزاج بدل گیا ہے اور شاعری کا لب ولہجہ بھی۔ رہ گئیں بیتے زمانے کی یادیں۔ ذہن میں محفوظ ہیں جناب پنڈت امرناتھ ساحرؔ دہلوی کی عظیم شخصیت اور ان کی بزمِ سخن کی شاندار نشستیں۔ اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے:

خواب تھا جو کچھ بھی دیکھا جو سنا افسانہ تھا

□□

Marfat.com

رضی بدایونی

صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی

ہر دور میں بعض ایسی ممتاز ہستیاں گزری ہیں جنھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آج سمینار کے موضوع کے بموجب مستحسن فاروقی صاحب کی حیات و کارناموں پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔ اگرچہ کسی منفرد شخصیت کی حیات و خدمات کا ۲۰ منٹ کے پابند مقالہ میں احاطہ کرنا ممکن نہیں تاہم فاروقی صاحب کے ادارے سے تقریباً ۳۴ سال اپنی ملازمانہ وابستگی کے دوران راقم نے موصوف کو جس قدر قریب سے دیکھا، سمجھا اور پہچانا ان حقائق کی روشنی میں اختصار سے اظہارِ خیال کرتا ہوں۔

گزشتہ نصف صدی کے دوران بعض ایسے پختہ عزم، شعلہ رقم، حق پسند و بے باک اور حوصلہ مند صحافی و کاروباری گزرے ہیں جنھیں انگلیوں پر گنا جاتا ہے۔ جیسے دیوان سنگھ مفتون (مدیر و مالک ہفت روزہ ''سیاست'')، مولانا عبدالوحید صدیقی (مدیر و مالک روزنامہ ''نئی دنیا'')، مولانا فارقلیط (مدیر ''الجمعیۃ'')، مولانا مظہرالدین (مدیر و مالک ''الامان'' و ''وحدت'' وغیرہ۔ آنجہانی محمد مستحسن فاروقی صاحب بھی اپنے انھیں معروف ہمعصروں میں سے ایک گزرے۔ جو اپنے وقت کے حوصلہ مند پختہ عزم کاروباری اور بلند قامت شخصیت کے حامل اردو صحافت کے زبردست علمبردار تھے۔ آپ اتر پردیش کے ضلع سہارنپور میں واقع اپنے آبائی وطن، دینی تعلیم کے قدیمی مرکز دیوبند کے ایک متوسط دیندار خاندان کے ہونہار چشم و چراغ تھے۔ موصوف کا سنِ پیدائش معلوم نہیں ہو سکا البتہ سنِ وفات ۱۹۸۰ء ہے۔ ۱۴۔۱۵ / مارچ کی درمیانی شب میں تقریباً ۹ بجے پنت اسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں راقم کی موجودگی میں موصوف نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا تھا۔ وہ

Marfat.com

ذیابطیس اور ضعفِ قلب کے مریض تھے۔ اندازے کے مطابق ان کی عمر ۶۵ اور ۷۵ کے مابین قیاس کی جاسکتی ہے۔

بقول مبینہ فاروقی صاحب انھوں نے پرائمری و دینی تعلیم حاصل کر کے پھر انگریزی تعلیم کے لیے دیوبند کے سرکاری ہائی اسکول میں داخلہ لیا اور بتدریج مدارج عبور کر کے نویں جماعت میں پہنچے، لیکن نویں جماعت میں ناکامیابی سے دل برداشتہ ہوکر دیوبند کو خیر باد کہا اور بے سروسامانی کے عالم میں دہلی آ کر محلّہ بیری والا باغ میں کسی عزیز ورفیق کے یہاں مقیم ہوکر فکرِ معاش میں کام کی تلاش شروع کر دی۔ چند دنوں کی مسلسل کوشش اور کچھ نئے متعارف مقامی مخلص احبا کی نشاندہی و ہمدردی سے جن میں ایک متمول صاحبِ حیثیت دیندار شخصیت لئیق خاں صاحب کا اسم گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جن کی کوشش سے مولانا مظہرالدین صاحب مدیر و مالک اخبار ''الامان'' و ''وحدت'' کے ادارہ واقع پھاٹک تیلیان ترکمان گیٹ میں خریداروں کے پتے لکھنے کا کام دس روپے ماہوار پر فاروقی صاحب کو مل گیا۔ جس سے انھیں قدرے اطمینان تو ہوا لیکن یہ مشاہرہ ان کی ضروریات کی تکمیل کے لیے ناکافی تھا۔ چنانچہ انھوں نے خالی اوقات میں مزید کام کی تلاش جاری رکھی۔ متعدد مختلف فرموں، اداروں کے دفاتر کے چکر لگائے جس کے نتیجہ میں جامع مسجد شاہجہانی کے قریب چھتہ شیخ منگلو میں واقع دفتر ہفت روزہ ''اسلامی دنیا''، ''عادل'' اور ''دین دنیا'' جرائد جن کے مالک و مدیرِ اعلیٰ اپنے وقت کے معروف اہلِ قلم، تاریخ داں اور کئی کتب کے مصنف جناب مفتی شوکت علی فہمی تھے (جن کی رحلت کے بعد آج کل ان کے ہونہار فرزند ارجمند جناب آصف فہمی کی ادارت میں صرف ''دین دنیا'' ماہنامہ کی صورت میں پابندی سے جاری ہے) اس ادارہ میں بھی فاروقی صاحب کو پتے لکھنے کا مزید کام مل گیا، جس سے انھیں اطمینان ہوا، لیکن قسّامِ ازل نے تو ان کی قسمت میں ترقی و خوشحالی، عزت وتوقیر اور کامیابی و کامرانی کی مزید منازل ودیعت فرمادی تھیں جو بہرطور انھیں عبور کرنا تھا۔ ان منازل کی طرف بڑھنے کا آغاز کیوں کر ہوا اس ضمن میں فاروقی صاحب خود فرمایا کرتے تھے کہ وہ روزانہ نہایت پابندی سے خواہ موسم کتنا ہی ناخوشگوار و ناقابلِ برداشت کیوں نہ ہوتا علی الصبح اٹھتے اور اہم ضروریات سے فارغ ہوکر نظام المشائخ

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہی بدایونیؒ کی درگاہ شریف میں حاضر ہوکر نذرانہ عقیدت و ارادت پیش کرتے اور پھر وہاں سے واپسی پر قطبِ زمانہ حضرت خواجہ شیخ کلیم اللہ ولیؒ کی درگاہ شریف واقع بالمقابل لال قلعہ پریڈ گراؤنڈ میں جواب مولانا آزاد پارک کے نام سے موسوم ہے میں حاضر ہوکر والہانہ عقیدت واحترام سے دعا ومناجات کرتے اور جاروب کشی کی خدمت انجام دیتے۔ بقول فاروقی صاحب ان کا یہ عمل ان کی زندگی کا اہم اور روحانی مسرت بخش معمول ومشغلہ بن گیا۔

یہ قسمت کی یاوری اور قدرت کی کرم فرمائی کہیے کہ اسی دوران فاروقی صاحب کی ملاقات سید حکیم مشتاق علی نامی ایک مخلص سے ہوئی جو قصبہ بگراسی ضلع بلند شہر کے ساکن قاضی القضاۃ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور دہلی میں کسی اچھے مطب میں ملازمت کی خواہش سے آئے تھے۔ چند ملاقاتوں میں بے تکلف محبّ اور باہم ہم خیال ہوگئے۔ اگرچہ مالی بے بسی مانع تھی تاہم فاروقی صاحب نے ہمت نہیں ہاری اور عزمِ مصمم کرلیا کہ حکیم صاحب مذکور کے تعاون سے اپنا دواخانہ ضرور قائم کریں گے۔ چنانچہ بہت سوچ وچار کے بعد فاروقی صاحب نے اس ضمن میں اپنے دہلی کے صاحبِ حیثیت محبّ صادق لئیق خاں صاحب کا تعاون حاصل کرکے ان کے اثر ورسوخ سے محلّہ تیلی واڑہ میں ایک مختصر و معمولی جگہ کرایہ پر حاصل کی۔ یہ وہ دور تھا جب دنیا بھر میں جرمنی کا طوطی بولتا تھا۔ صنعت و حرفت کے میدان میں وہ بہت ترقی پذیر تھا۔ ہندوستان میں جرمنی کی بیشتر پائیدار مصنوعات سستے داموں دستیاب تھیں اور پسند کی جاتی تھیں۔ شاید اسی لحاظ سے فاروقی صاحب نے اپنے دواخانہ کا نام بھی ''انڈو جرمن کیمیکل ورکس'' منتخب کرنا مفید ومناسب سمجھا اور تیلی واڑہ میں اپنا دواخانہ قائم کردیا۔ گویا یہ قدرت کی کرم فرمائی سے ترقی کی بلند و بالا منازل کے زینہ کی پہلی سیڑھی پر فاروقی صاحب کا پہلا قدم تھا۔ اور پھر ان کی محنت، لگن اور پختہ عزمی سے چند برسوں میں دواخانہ کچھ مستحکم ہوا۔ چند مستند مجرب ادویہ بازار میں پہنچیں جو رفتہ رفتہ شہرت پاکر مقبول ہونے لگیں۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ فاروقی صاحب کو پھر ایک آزمائش سے گزرنا پڑا۔ اب یہ وہ دور آیا جب جرمنی ہٹلر کی قیادت میں بڑی طاقت بن کر ابھرا۔ دنیا کے سیاسی حالات ناخوشگوار اور ماحول ناسازگار ہوا۔

ہندوستان میں برطانیہ حکمران تھا جو جرمنی کے حریفوں میں شامل تھا۔ چنانچہ ۲؍ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری عالم گیر جنگ کا آغاز ہوا۔ چوں کہ دواخانہ کے نام میں لفظ ''جرمن'' موجود تھا اس لیے اس پر سرکاری طور پر اعتراضات وتحقیقات ہونے لگیں، لیکن حوصلہ مند فاروقی نے اس اچانک افتاد کا نہایت خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور سخت جدوجہد کر کے لفظ ''جرمن'' کو لفظ جینوئین سے بدلنے میں قانونی طور پر کامیابی حاصل کر لی۔ اور اسی دوران فاروقی صاحب نے اپنی فطری صلاحیت و جدوجہد، خوش اخلاقی و رفاقت پسندی سے دہلی کے بعض ممتاز معزز شہریوں اور سجادگان کے حلقوں تک رسائی حاصل کر کے اپنے ہمدردوں، محسنوں اور رفیقوں میں بھی اضافہ کیا۔ جن میں حافظ سید حسن بقائی صاحب جو ''پیشوا''، ''حریت''، ''آزاد ہند'' اور ''فلمی آرٹ'' جرائد کے مدیر و مالک تھے اور آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔ میر مشتاق صاحب جو ہر دلعزیز عوامی رہنما تھے اور آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔ محمد میاں صاحب ایڈوکیٹ، مولانا امداد صابری صاحب مدیر و مالک اخبار ''سوسائٹی''، سید احمد جعفری صاحب جو اخبار ''ملت'' کے مدیر و مالک تھے، دلّی وقف بورڈ کے سکریٹری اور آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔ ہلال قطبی صاحب سجادہ نشین درگاہ قطب صاحبؒ، عزیز شفیع صاحب مجسٹریٹ، خلیل صاحب باغ والے، نجم صدیقی صاحب مدیر و مالک ''جمالستان'' وغیرہ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جن میں بعض معززین فاروقی صاحب کے آخر دم تک مشیر و مصاحبین بھی رہے۔ جن کی کوشش سے ہی فاروقی صاحب نے جامع مسجد شاہجہانی کے عقب میں واقع بلڈنگ میں ایک وسیع ہال نما کمرہ کرایہ پر حاصل کیا اور اپنا دواخانہ تیلی واڑہ سے اس بلڈنگ کے ہال نما کمرے میں منتقل کر کے ''انڈو جینوئین کیمیکل ورکس'' کا بورڈ نصب کر دیا اور اخبارات میں مشتہری کی مہم شروع کر دی جس کے نتیجہ میں نہ صرف دہلی بلکہ ملک بھر کے عوام دواخانہ سے متعارف ہونے لگے اور فاروقی صاحب کی محنت، پختہ عزمی اور حوصلہ مندی بار آور ہونا شروع ہوگئی اور چند سال قبل مختصر جگہ میں فرش پر دری پر بیٹھ کر دواخانہ کا کام شروع کرنے والے اب اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے میز اور کرسیوں پر بیٹھ کر کام کرنے کے اہل ہوگئے۔ فاروقی صاحب اس ترقی کو فیضانِ کلیمی و نظامی مانتے تھے۔ اوائل ۱۹۴۶ء میں درگاہ کلیمی کے

Marfat.com

سابق سجادہ نشین جناب عبدالغنی نے معہ متعلقین پاکستان ہجرت کا ارادہ کرلیا تو درگاہ کے انتظام کے لیے اپنا قائم مقام منتخب کرنے کے لیے ان کی نگاہ فاروقی صاحب پر گئی جو روزانہ کے حاضر باش و عقیدت مند تھے۔ چنانچہ سابق سجادہ عبدالغنی صاحب نے فاروقی صاحب کو منصبِ سجادگی کا معہ جملہ اختیارات نامہ لکھ کر فاروقی صاحب کو منصبِ سجادگی سونپ کر پاکستان ہجرت کر گئے۔

فاروقی صاحب نے منصبِ سجادگی پر فائز ہو کر اپنی ذمہ داری کو نہایت عقیدت و لگن سے انجام دیا۔ درگاہ اور اس سے ملحقہ مسجد جو سابق سجادہ کی تہی مائیگی اور وسائل کی کمی کے سبب بہت شکست و ریخت حالت میں تھی فاروقی صاحب نے اس کی از سرِ نو تعمیر و تزئین کرا کر چار چاند لگا دیے۔ روشنی اور پانی کے معقول انتظام کرائے۔ ہمہ وقت نگرانی و صفائی کے لیے مستقل ملازم اور ایک مالی بھی رکھا اور ہر جمعرات کو ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی اور نعت و مناقب خوانی کے اجتماعات کے اوقات اور اصول و قواعد مقرر کیے جس سے عقیدت مندوں کی حاضری میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہر سالانہ عرس تقریب نہایت اعلیٰ پیمانے پر منعقد کی اور ہر سال تقریبِ عرس کے موقع پر وقت کے اعلیٰ اربابِ اقتدار اور مشاہیرِ ہند کو بھی خاص طور سے مدعو کر کے قومی اتحاد و یکجہتی کی انمٹ مثال قائم کر کے آستانۂ کلیمی کو قومی اتحاد کا ایک مرکز بنا دیا۔

ان اربابِ اقتدار کی فہرست تو بہت طویل ہو گی جنھوں نے ہر سالانہ عرس کی تقریب میں زحمتِ شرکت فرمائی تاہم ان میں صدر جمہوریہ ہند جناب وی۔ وی۔ گری، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، فخر الدین علی احمد صاحب، صدر جمہوریہ ہند سنجیوا ریڈی صاحب، صدر جمہوریہ ہدایت اللہ صاحب، صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ صاحب اور دہلی کے لیفٹننٹ گورنر شری کشن چند وغیرہ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے اعراس کی تقاریب میں شرکت فرما کر اظہارِ عقیدت مندی کیا۔

منصبِ سجادگی پر فائز ہونے کے بعد ۱۹۴۶ء ہی میں فاروقی صاحب نے آستانۂ کلیمی سے وابستہ ''آستانہ'' نام سے ہی دینی، اصلاحی، تبلیغی جریدہ بھی معمولی طریقہ پر جاری کیا جو بتدریج ترقی کر کے عالمِ اسلام کا اپنے وقت کا واحد مقبول دینی جریدہ ثابت

Marfat.com

ہوا۔

ہندوستان کی قدیم تحریک آزادی جو دوسری عالم گیر جنگ کے دوران کچھ سرد پڑ گئی تھی۔ جرمنی کی شکست اور جنگ کے بادل صاف ہوتے ہی مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لعل نہرو وغیرہ وقت کے اعلیٰ سیاسی رہنماؤں اور جاں باز مجاہدین کی قیادت میں تیز تر ہوتی گئی۔ ملک بھر میں ''انگریزو ہندوستان چھوڑو'' کے فلک شگاف نعرے گونج رہے تھے۔ شمع آزادی کے پروانے اپنی جانیں نثار کررہے تھے۔ مجاہدین سے جیلیں بھری جارہی تھیں۔ سامراجی ظلم وستم کی انتہا ہوگئی تھی۔ آخر کار حالات ووقت نے ایسا پہلو بدلا کہ برطانوی سامراج کو ہندوستان سے اپنا بوریا بستر سمیٹنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اگر چہ اس دور میں جنگِ عظیم کے اثرات اور تحریکِ آزادیٔ وطن کے انتشار و ہنگاموں کے سبب نہ صرف انڈو جینوئین دواخانہ بلکہ ملک کے تمام کاروبار متاثر ہوئے۔ تاہم فاروقی صاحب نے ہمت نہیں ہاری اور مسلسل جدوجہد جاری رکھی۔ چند ماہ بعد ہی ۱۹۴۶ء میں وہ وقت آیا کہ آزادیٔ وطن کی پرزور تحریک کامیابی کے پہلے مرحلہ میں داخل ہوئی اور عارضی حکومت وجود میں آئی جس کے پنڈت جواہر لعل نہرو وزیر اعظم، نواب زادہ لیاقت علی خاں وزیرِ خزانہ، آصف علی بیرسٹر وزیر ریلوے اور احمد آباد کے آئی آئی چندری گر کامرس منسٹر منتخب ہوئے۔

اس وقت احمد آباد سے ایک ماہنامہ ''دین'' شائع ہوتا تھا جس کے مالک و مدیر کے چندری گر صاحب قدیمی قریبی دوست اور سرپرست تھے۔ فاروقی صاحب نے ''دین'' کے مدیر سے ربط ضبط قائم کر کے ان کی وساطت سے '' آستانہ'' کے لیے نیوز پرنٹ کاغذ کا کوٹہ منظور کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ یہ فاروقی صاحب کی جدوجہد اور الطاف خداوندی سے ان کی ترقی وکامرانی کی بلند و بالا منزل پر پہنچنے کی دوسری سیڑھی تھی جس پر انھوں نے قدم رکھا۔ اس کے بعد ہر منزل آسان ہوگئی۔ اور اب انھیں ماہنامہ '' آستانہ'' اعلیٰ پیمانے پر ضخیم ودیدہ زیب منظر عام پر لانے اور اس کے ذریعے اپنا دینی تبلیغی خدمت کا جذبہ بروئے کار لانے، اردو زبان و ادب کی بقا وفروغ کے لیے جدوجہد اور ملت کے مسائل کی ترجمانی کرنے اور قومی اتحاد و یکجہتی کو فروغ دینے کے بہتر تسلی بخش مواقع فراہم ہوئے۔ '' آستانہ'' بتدریج ترقی وقبولیت کی منازل عبور کرتا ہوا عروج کی آخری منزل میں

Marfat.com

جا پہنچا۔ تمام عالمِ اسلام میں اپنے وقت کا واحد اسلامی دینی جریدہ کہلایا۔ تعداد طباعت کے لحاظ سے ۹۰ ہزار تک پہنچا۔ ''آستانہ'' کے علاوہ ہفت روزہ ''پیامِ مشرق'' بھی ۱۹۵۴ء میں جاری کیا جس کے ذریعے ادبی، اصلاحی، سیاسی اور تنقیدی خدمات انجام دیں۔ پھر کچھ عرصہ بعد ماہنامہ ''مولوی'' بھی عبدالحمید صاحب سے خرید کر اپنی ادارت میں شائع کیا۔ اور ان جرائد میں دواخانہ کے اشتہارات بھی شائع کیے جاتے رہے، جس کے نتیجہ میں دواخانہ کو خاطر خواہ فروغ ہوا۔ اسی دوران عالی دماغ فاروقی صاحب نے ان جرائد کے ذریعے دیگر کئی کاروبار (میل آرڈر بزنس) غزالہ جیولری میوزیم، سوئس ناولٹی امپوریم، قمر کشیدہ کاری، رعنا دوپٹہ اسٹور، دارالفرقان، قرآنی نقشِ اعظم اور آستانہ بکڈپو وغیرہ بھی شروع کیے اور کامیابی حاصل کی۔

اس وقت دفتر میں ملازمین، ٹائپسٹ، کلرکوں اور چپراسیوں کی تعداد تقریباً پچاس رہی اور ان کے علاوہ جرائد کے ادارتی شعبہ میں وقت کے جو ممتاز ادیب و صحافی اور قلمکار ملازم رہے ان میں عبدالباقی خاں صاحب سابق انفارمیشن آفیسر حکومت مشترکہ پنجاب، مولانا مفتی زاہد القادری، سید مہدی نظمی، ناز انصاری، نظام الدین حیرت رامپوری، مولانا ضیاء القادری بدایونی، زاہد رضوی، مولانا شبیر عثمانی، راقم الحروف، اشرف بھوپالی اور صدیقی آرٹسٹ و امانی آرٹسٹ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ دفتر کے پہلے جنرل منیجر ہاشمی صاحب تھے۔ ان کے بعد نہال عباس عباسی امروہوی جنرل منیجر رہے۔

تقسیمِ وطن کے وقت دفتر کی بلڈنگ کے مالک بلڈنگ فاروقی صاحب کے سپرد کر کے پاکستان ہجرت کر گئے اور بلڈنگ محکمہ کسٹوڈین کے تحت ہوگئی۔ فاروقی صاحب نے مولانا حفظ الرحمٰن ایم پی سے خواہش کی کہ وہ یہ بلڈنگ کسٹوڈین سے مجھے دلوا دیں، لیکن مولانا نے کسی وجہ سے انکار کر دیا جس سے دونوں کے درمیان کچھ تلخی پیدا ہوگئی۔ آخر کار عوامی رہنما میر مشتاق صاحب نے درمیان میں پڑ کر تلخی دور کرائی اور کچھ عرصہ بعد سولہ ہزار میں مذکورہ بلڈنگ فاروقی صاحب کو دلوا دی جس میں آج کل سفینہ ہوٹل ہے۔

فاروقی صاحب نے چار شادیاں کیں۔ ہر شادی پہلی رفیقۂ حیات کے ارتحال کے کچھ عرصہ بعد کی۔ چاروں سے اولادیں ہوئیں، سب کو اعلیٰ تعلیم دلائی اور بحمد اللہ سب

Marfat.com

خوشحال و پروقار زندگی کے حامل ہیں۔ بڑے فرزند شاد فاروقی صاحب ملیشیا میں قانون کے معلم ہیں۔ ان سے چھوٹے فہیم فاروقی صاحب دہلی ہائی کورٹ میں اعلیٰ عہدہ پر قائم ہیں اور ایک نواسے سہیل فاروقی صاحب نیویارک میں امراضِ قلب کے ماہر معالج ہیں۔
فاروقی صاحب کی رحلت کے بعد درگاہِ کلیمی کی دستارِ سجادگی ان کے نوجوان فرزند ارجمند وسیم فاروقی صاحب کے سر اپریل ۱۹۸۰ء میں باندھی گئی۔ انھوں نے بھی اپنی حیات میں اپنے پدر محترم کے نقشِ قدم پر چل کر درگاہ شریف میں تعمیر و تزئین کی مزید اہم خدمات انجام دیں۔ مزار شریف پر خوبصورت گنبد تعمیر کرایا۔ نعت و مناقب کے نصب کتبے جو بوسیدہ ہو گئے تھے انھیں درست کرایا۔ فرش از سرِ نو تعمیر کرایا۔ نعت و مناقب ذوق و شوق سے سنتے تھے۔ اکثر خوش گلو قاری و نعت خواں قاری شفیق کو دفتر میں طلب کر کے راقم کا کلام سنتے اور محظوظ ہوتے۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۸۵ء کو قاری مذکور کی زبانی دفتر میں راقم کا کلام سن کر خوش ہوئے۔ داد و تحسین سے نوازا اور درگاہ کلیمی کے قبرستان میں راقم کے مدفن کے لیے پروانہ بھی فوراً تحریر کر کے دے دیا جس کے لیے بصمیمِ قلم ممنون ہوں۔
باپ کے نقشِ قدم پر چلنے والے اس فراخ دل نوجوان سجادہ نشین کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ اس منصب پر سات سال فائز رہ کر مئی ۱۹۸۷ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند جو منصبِ جانشینی کے جائز مستحق تھے وہ اس وقت نابالغ و کمسن تھے اس لیے ان کے بالغ ہونے تک درگاہ شریف کے جملہ انتظام و نگرانی کی ذمہ داری ان کی دادی محترمہ بیگم ریحانہ فاروقی کے سپرد رہی جو انھوں نے بخوبی انجام دی اور میاں ساجد فاروقی صاحب کے بالغ ہونے پر ایک اعلیٰ تقریب منعقد کر کے منصبِ سجادگی پر فائز کرا دیا جو آج کل اپنی والدہ محترمہ بیگم خالدہ فاروقی کے زیر سایہ منصبِ سجادگی کے فرائض بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔
محمد مستحسن فاروقی صاحب کی آخری شریک حیات محترمہ بیگم ریحانہ فاروقی نے ایک خاتون ہوتے ہوئے فاروقی صاحب کی رحلت کے بعد گزشتہ چوبیس برسوں سے ماہنامہ ''آستانہ'' اور دوا خانہ کا کام اور نام کو اپنی صلاحیت سے قائم و زندہ رکھا ہے، اس کے لیے وہ قابلِ ستائش بھی ہیں اور لائقِ مبارکباد بھی۔

Marfat.com

جب بھی محمد مستحسن فاروقی صاحب کا خیال آتا ہے تو ان کی خدمات، کارناموں اور شخصیت کے بہت سے رنگ روپ نگاہوں میں رقص کرنے لگتے ہیں اور ان کے حالاتِ زندگی سے یہ درس ملتا ہے کہ کارزارِ حیات میں ناکامیوں سے مایوس ہوکر حوصلہ شکن نہیں ہونا چاہیے بلکہ پختہ عزمی سے راہِ عمل میں پیش آنے والی ہر رکاوٹ و افتاد کا سینہ سپر ہوکر مقابلہ کرنا چاہیے۔ پختہ عزمی سے کی گئی محنت اور لگاتار کوشش حصولِ مقصد میں کامیابی کی ضامن ہوتی ہے۔

فاروقی صاحب اپنے عرصۂ حیات میں بہت سے نشیب و فراز سے گزرے، بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے لیکن انھوں نے زندگی میں کسی محاذ اور کسی موڑ پر ہمت نہیں ہاری۔ راہِ عمل میں پیش آنے والی ہر افتاد کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا۔ جہاں انھوں نے اپنے جرائد کے ذریعے ملت اسلامیہ کی اصلاح و بیداری اور زبان و ادب کی خدمات انجام دیں وہیں عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی بھی کی۔ اقلیتوں منجملہ مسلمانوں کے جائز حقوق و حفاظت کی نمائندگی بھی کی اور اپنی حق گوئی و بے باکی کے نتیجہ میں حکومتِ وقت کے عتاب کا نشانہ بھی بنے۔ آپ پر کئی مقدمات قائم کیے گئے۔ ۱۹۵۷ء میں دفعہ ۱۵۳۔ الف کے تحت گرفتار کیے گئے، لیکن انھوں نے اپنا عزم و موقف نہ بدلا اور اپنے مشن پر قائم رہ کر پختہ عزمی کا وہ ثبوت دیا جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یکم جنوری ۱۹۵۸ء کو قید و بند کی صعوبت سے بے داغ آزاد ہوئے۔ اس مقدمہ کی پیروی میں راقم کے مخلص محبّ و محسن وقت کے ممتاز ملک کے معروف قانون داں الہٰ آباد ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس جناب ایس۔ پی۔ سنہا بار ایٹ لا نے بحث کی تاریخ پر خود تشریف لا کر بحث کی جب کہ وہ نچلی عدالتوں میں ہمیشہ اپنے جونیر کو ہی بھیجا کرتے تھے۔

□□

Marfat.com

خواجہ محمد شفیع

نواب خواجہ محمد شفیع ۱۹۰۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے زندگی میں عروج بھی دیکھا اور زوال بھی۔ ۸۳ سال کی عمر میں لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ خود نواب نہیں کہلاتے تھے بلکہ ان کے بزرگوں کو یہ خطاب عطا ہوا تھا اور انھوں نے زندگی بھر اس کی لاج رکھی، ان کی کلاہ ہمیشہ کج رہی۔ اس وقت بھی جب زمانہ ان کے لیے کج رفتار تھا، وہ خواجہ عبدالمجید کے فرزند ارجمند تھے۔ خواجہ عبدالمجید دلّی کی علمی محفل کے روشن چراغ، دلّی کی مشہور درسگاہ سینٹ کالج کے شعبۂ فارسی و اردو کے استاد۔ ایک متبحر عالم ـــــ گویا نکاتِ زبان دانی اور سخن فہمی ان کو ورثہ میں ملی تھی۔ ضرب الامثال اور محاورے ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے اور رعایتِ لفظی ضلع جگت، اور دلّی کی ٹکسالی زبان کے تمام زیور ان کے لبِ اظہار پر آراستہ تھے ـــــ نواب زادے، نازونعم میں پلے ہوئے، نکلتا ہوا قد و قامت، بھرا بھرا جسم، چوڑا چہرہ، شہابی رنگ، نوجوانی میں پہلوانی کرتے تھے، شہ سوار تھے اور ظاہر ہے وہ تمام شوق ان کے مزاج کا حصہ تھے جو آزادی سے پہلے دلّی کے خوشحال گھرانوں کے نوجوانوں کی شان ہوتے تھے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ علم کی دولت سے مالا مال تھے۔ تخلیقی ذہن کے مالک تھے، گریجویٹ تھے، مگر نوکرشاہی سے دور رہے اور اپنے فکر و قلم سے گیسوئے اردو سنوارتے رہے، اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ ان کے افسانے دلّی کی تہذیبی زندگی، یہاں کے رہن سہن، یہاں کے عوام کی بولیاں، کہاوتیں محاورے، شوق، کھیل تماشے اور ساتھ ہی اس یگانہ روزگار شہر کی تاریخی عظمت کے ترجمان تھے۔ ایک تو شستہ، بامحاورہ اور برجستہ زبان، اور اس پر بیان

میں وہ تاثیر کہ ایک ایک لفظ کی کیفیت اور لطافت سننے والے کے دل میں اتر جائے۔ اور اس بے ساختگی پر بعض اوقات ایسے واہ نکلتی تھی جیسے زبان کے چٹخارے دار اشعار پر، اندازِ بیان سے لفظ کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے تھے ___ اور یہ رنگ ان کی عام گفتگو میں بھی نمایاں رہتا تھا۔ ان کی محفلوں میں مشہور مزاحیہ شاعر احمق پھپھوندوی کے شاگرد اختر پھپھوندوی بھی آیا کرتے تھے جو بعض دفعہ سامانِ تفریح بنتے تھے۔ ایک بار اختر صاحب کئی ہفتے بعد آئے۔ خواجہ صاحب نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ اختر صاحب پھپھوند گئے تھے "پھپھوند گئے تھے" اس انداز سے کہا کہ اس کے معنی ہی بدل گئے اور اہلِ محفل نے خوب لطف لیا۔ ان کی محفل اس طرح کے برجستہ فقروں اور لطائف وظرائف سے شگفتہ رہتی تھی، رات نو دس بجے تک محفلِ شعر جمتی۔ ہر اتوار کو۔

ان دنوں مشاعرہ نئی کروٹ لے رہا تھا۔ طریقہ تو وہی تھا پرانا کہ صدرِ مشاعرہ شعرا کو زحمتِ کلام دیں گے، مگر ایک نہایت قابل اور بارسوخ اور عالی مرتبت شخص سر رضا علی (ممبر وائسرائے کونسل) مشاعروں کی دنیا میں نئی زندگی لے کے آئے تھے۔ سر رضا علی مشاعروں کی صدارت ذوق وشوق سے کرتے تھے اور بحیثیت صدر شاعر کا تعارف نہایت دلچسپ انداز میں ان کے نام اور کلام کی رعایت سے کراتے تھے، اور رعایتِ لفظی ان کے تعارف کی جان تھی ___ مشاعروں کو زندہ دلی سے چلانے کا فن سر رضا علی سے خواجہ محمد شفیع تک پہنچا اور پھر یہ دریائے فیض کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور گلزار دہلوی کے حصے میں آیا۔ اور بعد میں جانے کس کس نے خوشہ چینی کی، مگر جو کمال خواجہ محمد شفیع کو حاصل ہوا وہ انھیں پر ختم ہو گیا، نقل میں اصل جیسا لطف کہاں۔ کیا بات تھی خواجہ صاحب کی۔ مشاعرہ کو کبھی حدِ اعتدال سے گرنے نہ دیتے تھے، گروہ بندی ان کے مزاج میں نہ تھی اور ہر شاعر کا تعارف اس کے درجے اور مرتبے کے اعتبار سے کراتے تھے۔ بلا کے حاضر دماغ اور حاضر جواب ___ ایک واقعہ یاد آیا۔ مشاعرہ کھلے میدان میں ہو رہا تھا۔ مجمع کچھ بے چین تھا۔ شعرائے کرام آچکے تھے مگر کسی مہمانِ خصوصی کا انتظار تھا۔ مجمع کچھ اور بے چین ہونے لگا۔ خواجہ صاحب نے اسٹیج سے کہا "کتے کہیں کے"۔ اتفاق سے مائک آن تھا۔ لوگوں نے خواجہ صاحب کی بات سن لی اور ایک شور مچ گیا، مگر خواجہ محمد شفیع پھر خواجہ محمد شفیع تھے۔ مائک کے قریب آکر

Marfat.com

گرجدار آواز میں بولے ''تم کتے'' (مجمع بے چین) ''میں کتا'' (مجمع پر سکتہ کا عالم طاری ہوگیا) ''ہم سب کتے'' ___ اس رب العالمین کے آگے جس نے ہمیں پیدا کیا ___ بس پھر کیا تھا۔ مجمع خواجہ صاحب کے قبضہ میں۔ اور خوب کامیاب مشاعرہ ہوا۔

خواجہ صاحب کی اردو مجلس ایک ایسی انجمن تھی جس کے صدر بھی وہی، سکریٹری بھی وہی اور کنوینز بھی وہی۔ اب نہ وہ دیوان خانے رہے، نہ وہ علم و ادب کے دیوانے۔ عصر مغرب کے درمیان نثر کی چیزیں سنائی جاتی تھیں اور بعد نمازِ مغرب بزمِ مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ بزمِ نثر میں کبھی کبھی خواجہ حسن نظامی بھی آتے تھے اور خواجہ صاحب بلا کی ٹکسالی زبان میں افسانے سنایا کرتے تھے۔ نثر کی محفل محفلِ شعر سے بہتر اور مختصر ہوتی تھی۔ اردو مجلس کے جلسوں میں خواجہ محمد شفیع کی زندہ دلی، بزلہ سنجی اور نوابیت کا رنگ چھایا رہتا تھا۔ اور پھبتیاں کسنے میں خواجہ صاحب کو کمال حاصل تھا، کبھی کبھی خواجہ صاحب کی شعری محفلوں میں مشاہیرِ ادب بھی آجاتے تھے مگر ان کی عام محفلوں کا ایک خاص رنگ تھا۔ جامع مسجد کے قرب و جوار میں رہنے والے اکثر شعرا ان کے یہاں پابندی سے جاتے تھے۔ ان کی محفل میں ایک مخصوص قدیم رنگ کی غزلیں پسند کی جاتی تھیں جن میں زبان و بیان کا چٹخارہ ہوتا تھا۔ رعایت لفظی اور محاورہ بندی کو کمالِ فن تصور کیا جاتا تھا۔ ہم جیسے نظم گو شعرا تو وہاں محض اہلِ محفل کو بور کرنے کے لیے جاتے تھے۔ خواجہ صاحب کی محفلوں کے ساتھ جن لوگوں کا تصور آتا ہے وہ ہیں ظریف دہلوی، اختر پھپھوندوی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، فیض جھنجھانوی، بسمل شاہجہانپوری، ماہر دہلوی (نابینا)، عارف جلالی، عزیز وارثی، جوہر سعیدی، طالب دہلوی، نظر امروہوی، شیدا گجراتی، شیدا خورجوی، آفاق دہلوی، طور سیوہاروی، فرید جاوید، گلزار دہلوی، عطا محمد شعلہ اور جمیل الدین عالی وغیرہ۔ اور استاد مضمحل اور استاد ہلالؔ جیسے مہمل گو بھی خواجہ صاحب کی محفل میں پابندی سے جاتے تھے، جہاں محفل میں ذرا سنجیدہ فضا قائم ہوئی تو انھیں حضرات کے سہارے خواجہ صاحب اس سنجیدگی کو درہم برہم کر دیتے تھے۔

جدید شعرا کی تجرباتی شاعری اور ترقی پسندانہ خیالات سے انھیں خدا واسطے کا بیر تھا۔ اپنے ان خیالات کا اظہار وہ 'اردو مجلس' کی محفلوں میں بھی کرتے رہتے تھے۔ اتفاق سے ایک بار انھیں دل کے جلے پھپھولے پھوڑنے کا موقع مل گیا ___ دسمبر ۱۹۴۴ء کی بات

Marfat.com

ہے۔ مقیم الدین فاروقی اور قاضی محمد احمد (کمیونسٹ رہنما) نے بہ قول سجاد ظہیر ترقی پسندوں اور ان کے حریفوں کے مابین اپنے اپنے نظریہ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ایک مناظرہ کا اہتمام کیا اور جگہ طے کی گئی چاندنی چوک میں ٹاؤن ہال۔ سجاد ظہیر نے اس مناظرہ کے متعلق اپنی کتاب ''روشنائی'' میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے، مگر بہرحال چوں کہ مقامی لیڈروں نے ان پر یہ ذمہ داری تھوپ دی تھی اس لیے گلے پڑی ڈھولکی بجانا پڑی۔ اس مناظرہ میں میں بھی اسٹیج پر موجود تھا اور میرے ساتھ جمیل الدین عالی بھی تھے۔ ادھر سے سجاد ظہیر، فیض احمد فیض اور اختر الایمان۔ اور ادھر سے خواجہ محمد شفیع، مولوی سید احمد اکبرآبادی اور سر رضا علی جو صدارت بھی کر رہے تھے۔ خواجہ محمد شفیع نے خطابت کا وہ زور دکھایا کہ ایک ایک فقرہ پر تالیاں بجیں۔ وہ دلّی والوں کے مزاج سے واقف تھے، نہایت جذباتی تقریر کی۔ جوش کی نظموں کے اقتباسات پیش کر کے فرمایا کہ ترقی پسندی کفر والحاد کی تحریک ہے۔ میراجی کی نظم ''لب جوئبارے'' اور دوسری نظمیں پڑھ کر اعلان کیا کہ ایسے مخرب الاخلاق ادب کے خلاف آواز اٹھانا میں اپنا ایمان سمجھتا ہوں۔ راشد کی نظم ''انتقام'' کو انھوں نے اپنے مقاصد کے لیے خوب استعمال کیا ____ خواجہ محمد شفیع گرج رہے تھے اور دربار ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر نے نہایت سلجھے ہوئے اور پروقار لہجے میں کہا کہ ترقی پسندی صرف یہی نہیں ہے جس کی مثالیں خواجہ صاحب نے پیش کیں، ترقی پسندی اعلیٰ انسانی اقدار کی ترجمان ہے۔ انسان دوستی، وطن پرستی اور آزادی کے جدوجہد ترقی پسندی کا مطمحِ نظر ہے، مگر سب دلیلیں خواجہ صاحب کے جوشِ خطابت کے آگے ماند نظر آئیں۔ البتہ اختر الایمان نے ایک اچھے ڈیبیٹر کی طرح فراٹے دار تقریر کی اور جذباتی طور پر مجمع کو اپنے ساتھ کسی حد تک بہانے میں کامیاب ہو گئے، مگر انھیں صاحبِ صدر بیچ بیچ میں ٹوکتے رہے۔ سجاد ظہیر صاحب نے اپنی کتاب ''روشنائی'' میں اس کا ذکر یوں کیا ہے:

> ''خواجہ صاحب کی تقریر نہیں تھی، ترقی پسندوں پر چوٹوں کا سلسلہ تھا۔ انھوں نے آزاد شاعری کا مذاق اڑایا، ترقی پسندوں کی زبان کی غلطیاں بتائیں۔ ان کے تصورات کو مخربِ اخلاق اور پست اور غیر شاعرانہ ثابت

کرنے کی کوشش کی۔فحاشی کا الزام بھی لگایا گیا۔ہم ان اعتراضات کے سننے کے عادی ہو چکے تھے،مگر دہلی کی ٹھیٹ زبان اور اتنے پیارے لہجے میں ہم نے اس سے پہلے گالیاں نہیں سنی تھیں۔خواجہ صاحب کی تقریر کا مجمع پر کافی اثر ہوا اور میرا جی، راشد اور مخمور جالندھری کی چند نظموں کے ٹکڑے جب پڑھے گئے تو اس پر کافی قہقہے لگے''۔

(روشنائی،ص:۳۴۶)

''جلسے کے بعد خواجہ محمد شفیع اور قاضی سعید احمد سے میرا باقاعدہ تعارف ہوا۔خواجہ نے بہ اصرار مجھے اپنے دولت خانے پر بھی مدعو کیا اور ایسے مزے مزے کی چیزیں کھلائیں جو صرف دلّی والے ہی کھلا سکتے ہیں۔ان کا اندازِ گفتگو ان کے کھانوں سے بھی مزیدار تھا۔جب میں رخصت ہونے لگا تو اپنی تصانیف کا ایک پورا سیٹ مجھے تحفہ میں دیا۔میں ان کی ضیافت اور عنایت کے بوجھ سے جیسے دب سا گیا اور واپسی پر سوچتا رہا:

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو''

(روشنائی ص:۳۴۹)

خواجہ حسن نظامی اور نواب خواجہ محمد شفیع کے درمیان ایک اور مناظرہ کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ معلومات آفریں بھی۔یہ اقتباسات میں ذوالفقار علی بخاری کی مشہور تصنیف ''سرگزشت'' سے نقل کرتا ہوں۔بخاری صاحب نے یہ بات حضرت داتا گنج بخش کے کشف و کرامات اور روحانی اقدار کی عظمت کے سلسلے میں سپردِ قلم کی ہے اور درمیان میں ذکر ہے مناظرہ کا ____ یہ بھی عرض کردوں کہ ذوالفقار بخاری اس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو، دہلی کے اسٹیشن ڈائرکٹر تھے۔

خواجہ حسن نظامی: ''آپ کے مکان کے قریب نواب دوجانہ کی مسجد کے سامنے کاؤس جی پارسی نے ناٹک کے تماشے کا منڈوا بنوایا تھا۔دلّی کے مسلمانوں نے آپ کے نانا نواب محمد اکرام اللہ صاحب کو اپنی ناراضگی کا محضر دیا۔نواب صاحب نے وہ ڈپٹی کمشنر صاحب دہلی کو بھیج دیا۔ڈپٹی کمشنر صاحب نے مسلمانوں

کے خلاف فیصلہ کیا اور آپ کے نانا صاحب کو امن و استحکام کا ذمہ دار بنایا جس سے دہلی کے مسلمانوں میں بہت جوش پھیل گیا، اور پھر تین چار دن تماشہ ہوتا رہا، اس کے بعد ایک فقیر آپ کے نانا کے پاس آیا اور اس نے زمین سے خاک مٹھی بھر کے اٹھالی اور اس پر کچھ پڑھ کر دم کیا اور خاک ناٹک گھر کی طرف پھینک دی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دوسرے ہی دن کاؤس جی خود بخود اپنے تماشہ گھر کو یہاں سے اٹھا لے گئے۔ یہ قصہ آپ کے دادا نواب عبدالرحیم خاں صاحب نے مجھ سے بیان کیا تھا۔ تو بتایئے کہ خاک کی چٹکی نے یہ کیا اثر کیا؟ اور فقیر کے دم کرنے میں کیسی عجیب تاثیر تھی؟

نواب صاحب: آفت تو یہی ہے کہ ہمارا دماغ ہم کو غلط طرف لے جاتا ہے، جب سوجھتی ہے اندھی سوجھتی ہے، معاملہ یہ تھا کہ جس مقام پر اس نے منڈوا بنوایا تھا وہ جگہ مسلمانوں کی آبادی کے وسط میں واقع ہے۔ سمجھدار آدمی تھا۔ ڈرا کہ رات برات کو کسی نے آگ لگادی تو کچا ٹھاٹر ہے، ایک پردہ بھی سلامت نہیں بچے گا۔ بے چارہ چلا گیا۔ یاروں نے فقیروں کے سر سہرا باندھا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر کہیں اس تماشے میں آگ لگ جاتی تو فقیر صاحب ہی ذمہ دار ٹھہرائے جاتے کہ کہاں کا بزرگ تھا۔ دیکھا، آگ لگادی۔ میاں بڑے بڑے کامل پڑے ہوئے ہیں۔"

مکالمہ اپنے وقت کے صاحبِ طرز ادیب اور صوفی خواجہ حسن نظامی کے درمیان ہے، اور آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہو رہا ہے، کسی پرائیویٹ محفل کی گفتگو نہیں ہے۔ گویا خواجہ محمد شفیع واضح اور کھلا ذہن رکھتے تھے۔ عقلیت پسند تھے اور جن چیزوں پر وہ یقین نہ رکھتے تھے ان کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے وہ کہیں بھی اور کسی سے بھی بحث کرنے کو تیار رہتے تھے۔ یہ نہیں کہ مصلحتِ وقت کے مطابق بات کو ٹال گئے۔ گفتار و کردار کے ایسے غازی اب کہاں۔

وقت گزرا، ملک آزاد تو ہوا مگر تقسیم ہو کر، پاکستان بن گیا اور بہت سے روایتی دلّی والے وقت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی روایات، حویلیاں اور بزرگوں کی ہڈیاں یہیں چھوڑ کر

پاکستان بھاگ جانے کے لیے مجبور ہوئے۔ خواجہ صاحب بھی اسی طرح ہی گئے ____ نواب خواجہ محمد شفیع جیسے وضع دار، شریف النفس اور عظیم انسانی اقدار کے پاسدار شخص پر لاہور جا کر کیا گزری، مجھے اس کا علم نہیں، مگر یہ میں نے ضرور محسوس کیا کہ وہ دوبار دلّی آئے تو اپنی شکست کی آواز تھے۔ بزرگ ہو جانا اور بات ہے اور پژمردہ دل ہونا کچھ اور۔

نواب خواجہ محمد شفیع کی طرح دار شخصیت اور متنوع تحریروں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ ایسی نادرِ روزگار ہستیوں کو صرف طاقِ نسیاں نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی بازیافت اپنے ثقافتی ورثہ کی بازیافت ہے، اور یہ کام کوئی دلّی والا ہی بخوبی سرانجام دے سکتا ہے۔ دیکھنا ہے یہ قرض کون چکاتا ہے۔

□□

Marfat.com

ڈاکٹر ریاض عمر

حاجی محمد فاروق آئل کلاتھ والے

دہلی کی مٹی میں بڑی کشش ہے۔ دور دور سے لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔ یہ کوئی آج کی بات نہیں صدیوں سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ کوئی حکومت کرنے آتا ہے تو کوئی معاش کی تلاش میں۔ کوئی بزرگوں اور عالموں کے آگے زانوئے ادب تہہ کر کے علم حاصل کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے تو کوئی اپنے فن کو جلا دینے کے لیے یہاں کے ماہرین کی شاگردی کرنے اور ان کی چلمیں بھرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ کوئی اکا دکا آتا ہے تو کوئی جتھوں کی صورت میں ساتھ ہی اپنے ہم جنسوں کی تلاش کر کے چھوٹی چھوٹی برادریوں کی صورت میں محلے محلے سکونت اختیار کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اپنی اپنی شناخت برقرار رکھیں۔ اسی لیے یہاں رائی بھی ہیں اور قریشی بھی۔ لاہوریے بھی ہیں اور پنجابی بھی، حکیم بھی ہیں اور عطار بھی۔ کچھ تو اپنے اپنے پیشوں یا کاروباری خصوصیت کی وجہ سے اور کچھ اپنے آباء واجداد کے سکونتی علاقوں کی وجہ سے اپنا تشخص بناتے ہیں اور جتاتے ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنے اس گٹھ بندھن کو قوم کہہ کر پکارتے ہیں۔ جیسے قومِ پنجابیان، قوم سلفیان اور قوم حکیمان وعطاران۔ آخر الذکر قوم کے افراد اصلاً عطاروں میں سے ہیں۔ بعد میں کچھ افراد نے حکمت کا پیشہ بھی اختیار کیا۔ گمان یہ ہے کہ رفتہ رفتہ ہر دو پیشوں سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اپنے آپ کو اس مرکب نام سے پکڑوانا شروع کر دیا اور پھر اسی تعلق سے مشہور ہو گئے۔ اسی قوم کے ایک فردِ خاص، مردِ مومن، باعمل کارکن اور دینی خدمت گار جناب حاجی محمد فاروق آئل کلاتھ والے تھے۔

یہ تو پتہ نہیں کہ ان کے آباء واجداد کب اور کہاں سے دہلی میں وارد ہوئے تھے ہاں یہ

Marfat.com

تحقیق ہے کہ گزشتہ آٹھ دس نسلوں سے یہ لوگ اس ہنر پرور دہلی کے مختلف محلوں جیسے فراش خانہ، کوچہ رحمان، بارہ دری شیر افگن، بلیماران، ترکمان گیٹ وغیرہ میں سکونت پذیر ہیں۔ اگرچہ کہلاتے تو قومِ حکیمان وعطاران میں سے ہیں لیکن اب معدودے چند ہی ان پیشوں سے وابستہ ہیں۔ اکثر و بیشتر باقاعدہ کاروباری دنیا میں قدم رکھ کر مختلف اشیا کا خوردہ و تھوک کا کام کرتے ہیں۔ کچھ خاندانوں نے صنعتی میدان میں بھ قدم جما کر کاروباری مقاصد میں ترقی حاصل کی ہے۔

حاجی محمد فاروق صاحب اس برادری کے ایک معزز خاندان کے سربراہ حاجی حافظ محمد عمرؒ کے ہاں ۱۹۰۱ء میں علاقہ بلیماران میں واقع ایک محلّہ کوٹھی نواب لوہارو میں پیدا ہوئے۔ روایتی تعلیم مسجد کے مکتب میں اور بعد میں مقامی اسکول میں پائی۔ ابھی صرف درجہ آٹھ تک ہی پہنچ پائے تھے کہ دستورِ دنیا اور خاندانی رواج اور دباؤ کے تحت والد صاحب نے کاروباری گر سکھانے کے لیے دکان پر بلالیا۔ اس دن سے لے کر دمِ آخر تک اپنے خاندانی کاروبار سے وابستہ رہے اور قدم بقدم اسے ترقی کی انتہائی منازل تک پہنچایا۔ شیخ محمد عمر صاحب جوتے کی دکان کرتے تھے لہٰذا نوعمر محمد فاروق بھی اسی کاروبار میں شریک ہوئے اور خاص طور سے چمڑے کی پہچان میں بہت مہارت حاصل کی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جوتوں کے خوردہ اور تھوک بیوپار میں ایک بڑا بحران آیا۔ تمام مشنری اور دستی کارندے دو دو تین تین شفٹوں میں جنگی ضروریات کا سامان بناتے تھے۔ لہٰذا جنگ ختم ہوتے ہوتے تمام مشنری فرسودہ ہوگئی اور دست کاروں کو بھی نئے شاگرد نہ مل پائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جوتوں کے کاروبار میں مندہ ہونے لگا۔

اب کاروباری آدمی تھے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر تو بیٹھنے سے رہے۔ باپ بیٹوں نے مشاورت کی اور آبائی کام کو چھوڑ کر آئل کلاتھ کا کام شروع کردیا۔ یہ ایک نئی پروڈکٹ تھی۔ ایک طرف تو چمڑے کی نعم البدل اور دوسری طرف بہت سی نئی اشیا کے بنانے میں معاون۔

خدا کا کرنا کیا ہوا کہ محنت اور ایمانداری کا پھل جلدی ملنا شروع ہوگیا اور پھر تو خدا تعالیٰ نے ایسا نوازا کہ مارکیٹ میں کوئی مقابل نہ رہا۔ اس ایمانداری کی ایک مثال سنی ہے کہ میسرز ایچ۔ محمد فاروق اینڈ سنز کی فرم پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں سات عدد کی رقم میں

Marfat.com

انکم ٹیکس ادا کرنے لگی۔ ایک بار ایک انکم ٹیکس آفیسر نے اشارتاً کہا کہ " حاجی صاحب آپ واحد شخص ہیں جو اتنا ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ بقیہ تو آپ کے پاسنگ بھی نہیں ہیں۔ آپ کہیں تو میں کچھ ترکیب بتاؤں"۔ حاجی صاحب مسکرائے اور کہا کہ " اللہ کا انعام ہے، اس کا شکر ہے۔ مجھے دھاندلی پسند نہیں۔ میں ٹیکس ادا کرکے آرام کی نیند سوتا ہوں اور آپ سب میری عزت وتکریم کرتے ہیں"۔

کاروباری ذمہ داریوں کے علاوہ نوعمری سے ہی محمد فاروق صاحب کو دو ہی شوق تھے۔ خدمتِ خلق اور شکار۔ خدمتِ خلق کا انہماک اور عمل دمِ آخر تک رہا جب کہ شکار کی شوقینی ادھیڑ عمر تک پہنچتے پہنچتے ختم ہوگئی۔

خدمتِ خلق کے نام سے حاجی صاحب کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب دہلی فسادات کی لپیٹ میں آیا اور مختلف علاقوں سے مصیبت زدگان اور اپنے گھروں سے اجڑے ہوئے لوگ پناہ لینے کے لیے محفوظ علاقوں میں آئے تو حاجی صاحب نے دل کھول کر دامے درمے مدد پہنچائی۔ کھانے پینے کے سامان، کپڑے اور دوائیاں حاصل کرکے ان کے عارضی قیام کی جگہوں پر پہنچاتے اور دعائیں پاتے۔

اس کے علاوہ بھی کبھی شہر میں کرفیو لگ گیا تو اپنے گھر کے کسی فرد کو کرفیو پاس دلوا کر شہر کے دوسرے علاقوں سے راشن منگواتے اور پھر اپنے محلے اور آس پاس کے ضرورت مندوں کو مفت تقسیم کرواتے۔

بہت عرصے سے ایک ہی وطیرہ تھا۔ اپنی بلیماران والی دکان میں اندر ایک بڑے صوفے پر بیٹھے رہتے تھے۔ وہیں سے اپنے بیٹوں اور دکان کے کارندوں کو کاروباری ہدایات بھی دیتے تھے اور حاجت مندوں کی حاجت روائی بھی کرتے تھے۔ ماہ رمضان میں تو مدارس کے لیے مانگنے والے سفیروں کی روزانہ لائن لگی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی مالی امداد کے خواہش مند سنتے سناتے درِ فاروق پر آتے اور فیضیاب ہوکر جاتے۔ راقم الحروف کو بھی کئی باران کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ کبھی تو جمشید پور اور مرادآباد میں فساد زدگان کی امداد کے لیے تو کبھی بہار میں زلزلے سے متاثر لوگوں کی اعانت کے لیے۔ کبھی کسی ملی جماعت کی عوامی میٹنگ کے اخراجات کے لیے تو کبھی دہلی کے اردو میڈیم

اسکولوں کی منتظمہ کی ذمہ داریوں کا بوجھ کم کرنے کے لیے۔ حاجی صاحب نے ہمیشہ ہی دستِ تعاون بڑھایا اور ساتھ ہی ایسے پرشفقت انداز سے حوصلہ افزائی کی کہ مانو ان کے دل کی بات ہے جو ہماری کوششوں سے پوری ہو رہی ہے۔

حاجی محمد فاروق صاحب کو مسجدوں کی مرمت وتعمیرات سے بہت دلچسپی تھی۔ اب یہ تو سب کو معلوم ہے کہ شرعاً مساجد کے اخراجات زکوٰۃ کی رقوم سے ادا نہیں کیے جاسکتے لہٰذا وہ یہ تمام صرفہ اپنی جیبِ خاص سے کرتے تھے اور کوشش یہ ہوتی تھی کہ اس کام میں کسی دوسرے کی حصہ داری کم سے کم ہو۔ چنانچہ اپنے محلے کوچہ رحمان کی مسجد ایک برج کی تعمیر اپنے پاس سے کروائی، تاریخی مسجد عبدالنبی جہاں آج کل جمعیۃ علماء ہند کا صدر دفتر ہے کی تعمیرِ نو میں بھرپور تعاون دیا۔ شاہی مسجد فتح پوری میں سنگ مرمر کا کام کروایا اور ضروری مرمتیں کروائیں۔ اس کے علاوہ شہر دہلی کے مختلف علاقوں سے مساجد کی تعمیر و مرمت کے لیے ذمہ داران مالی سرپرستی کے لیے حاضر ہوتے رہتے تھے اور کبھی مایوس واپس نہیں جاتے تھے۔

شاہ جہاں آباد کے رہنے والے مسلمانوں کے تعلق سے ایک عجیب بات سامنے آئی ہے۔ برسہا برس سے یہ لوگ مختلف برادریوں میں بٹے ہوئے شہر کے مختلف علاقوں میں قیام پذیر ہیں۔ ان میں رئیس ابن رئیس ابن رئیس بھی گزرے ہیں اور حکومتِ وقت کے خطاب یافتہ بھی۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ وطن کے بعد اکثر مسلمان نقلِ وطن کر گئے اور باقی جو رہے وہ مالی اور معاشی حیثیت سے متاثر ہونے کے بعد پھر سے قدم جمانے میں مصروف ہو گئے اور واقعہ یہ ہے کہ بہت سوں کو اللہ [illegible] سے نواز دیا اور بہت سے نئے رئیس ایسے بھی بنے جو سابقین سے بھی آگے بڑھ گئے مگر ان میں سے کسی کی بھی توجہ اس طرف نہیں گئی کہ شہر میں باہر سے آنے والے اور مالی حیثیت سے کمزور لوگوں کے مختصر وقفہ کے قیام کے لیے کوئی مسافر خانہ ہی بنوا دیں۔ ہندو حضرات نے اپنے محلوں میں دھرم شالائیں بنوا کر بہت بڑی سماجی خدمت انجام دی ہے لیکن مسلمان اس معاملے میں پھسڈی ہی رہے۔

آخر کو یہ قرعہ فال بھی حاجی محمد فاروق صاحب آنل کلاتھ والوں کے نام نکلا۔ بانیں تو

Marfat.com

بہت لوگ کرتے رہے لیکن رہتی دنیا تک صدقۂ جاریہ پہنچانے کا کام کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسی مردِ مومن اور اپنے وقت کے سخی و داتا کے دل میں ڈالا اور انھوں نے خاندانِ شریفی کے ایک عزیز حکیم غلام کبریا خاں عرف بھورے میاں مرحوم کے وارثوں سے بلیماران میں واقع کبریا منزل خریدی اور پھر معقول رقم خرچ کر کے اس کی مرمت کروائی اور سن ۱۹۷۰ء میں مسلم مسافر خانہ قائم ہو گیا۔ اب حاجی صاحب نے کیا دیا اور مالکان نے کیا لیا۔ یہ اللہ ہی جانے۔ حاجی صاحب کے گھر والوں کو بھی پتہ نہیں مگر دلی والوں کے چہرے سے یہ داغ مٹ گیا اور غریب مسافروں کے لیے تقریباً مفت ہی دو تین دن ٹھہرنے کا انتظام اندرونِ شہر ہی ہو گیا۔

اسی پر بس نہیں۔ مسافر خانے کے اخراجات کے لیے بھی اپنے خاندان والوں کو ہدایت کر دی کہ کبھی کوئی کمی نہ آنے پائے اور مسافر خانہ کی ہر ضرورت پوری ہو۔ رہے نام سخی کا۔ آج اس مسافر خانے میں ہمہ وقت دو سو سے تین سو تک مسافران قیام پذیر رہتے ہیں۔ ہر سال حج کے موقع پر اس تعداد میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ شہر کے معروف وکیل نواب سلطان یار خاں صاحبؒ نے اس پورے معاملے میں شروع سے آخر تک حاجی صاحب کا ساتھ دیا اور ایک خوش آئند خواب کو حقیقی شکل تک پہنچانے میں اپنے علم، تجربے اور تعلقات کا بھرپور استعمال کیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں بھی اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

حاجی محمد فاروق صاحب کے مالی تعاون کا سلسلہ شہر کے دیگر مسلم سماجی، فلاحی اور تعلیمی اداروں جیسے دہلی وقف بورڈ، بچوں کا گھر، دریا گنج، فتح پوری مسلم سینئر سیکنڈری اسکول، مظہر الاسلام اسکول، مدرسہ امینیہ، کشمیری گیٹ، مدرسہ عالیہ، فتح پوری وغیرہ سے مستقلاً قائم رہا۔ ان اداروں میں آپ کسی بھی عہدہ کو لینے سے گریز کرتے تھے۔ ہاں اپنی برادری کی جماعت کے کئی بار صدرِ اعلیٰ چنے گئے اور اپنے تدبر اور تجربے کے فوائد پوری قوم کو پہنچاتے رہے۔

کوئی بزم ہو کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اک چراغ جلا دیا

سیر و تفریح کے نام پر حاجی صاحب کو شکار کا شوق تھا، خاص طور سے ہرن اور مچھلی کا۔

Marfat.com

اپنے نوعمری کے دوستوں جیسے حافظ عبدالستار صاحب (آف موڈرن بوٹ ہاؤس، بلیماران)، بھیا یعقوب صاحب (قصائی) اور عبدالحفیظ صاحب (سادہ کار) کے ہمراہ پروگرام بناتے اور شہر کے اطراف میں اپنے شوق کی تکمیل کے لیے جاتے۔ کبھی کبھی کچھ اور احباب بھی شریک ہو جاتے مگر زیادہ قربت انھیں دوستوں سے رہی اور مالی حیثیت کے فرق کے باوجود دمِ آخر تک اس دوستی کو نبھاتے رہے۔

حاجی محمد فاروق صاحب کی شادی زمانے کے رواج کے مطابق نوجوانی میں ہی اپنی برادری کے ایک معزز خاندان میں محترمہ امروز سلطان صاحبہ سے ہوگئی۔ آپ ماشاء اللہ کثیرالاولاد تھے۔ اللہ نے چھ بیٹوں اور چھ بیٹیوں سے نوازا تھا۔ کاروباری مصروفیات کے باوجود ہر بچہ کی تربیت کی طرف پوری توجہ رہتی۔ باہر سے آنے والے اور پھر دہلی میں جمنے والے مسلمانوں میں ایک دلچسپ بات نظر آتی ہے۔ شعوری یا لاشعوری طور پر اولاد کے سلسلے میں ''کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ'' والے محاورے پر خوب عمل کرتے ہیں۔ حاجی محمد فاروق صاحب بھی اس سے دور نہ تھے۔ تمام بچوں پر اور ان کے مشاغل پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ مجال نہ تھی کہ گھر میں ان کی موجودگی میں کوئی بچہ یا نوعمر بیٹا یا بیٹی ہلکی بات کر جائے، مگر اس کے ساتھ ہی اولاد کی اولاد سے خوب لاڈ پیار کرتے تھے۔ آخر عمر تک پہنچتے پہنچتے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی اچھی خاص تعداد ہوگئی۔ نظرِ بد سے بچانے کے لیے میں دانستہ اصل نمبر نہیں لکھ رہا اور پھر وقت کے ساتھ تو اس میں مزید اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

حاجی محمد فاروق صاحب دوبار حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ ایک بار اپنے دوستوں کے ساتھ۔ یہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کی بات ہے۔ اس وقت کاروبار کے سلسلے میں اتنی احتیاط کی تھی کہ اپنی فرم کا نام بدل کرالیں۔ محمد صالحین اینڈ کمپنی کر کے بچوں کو اس میں شریک کیا اور جملہ ذمہ داریاں ان کے سپرد کردیں۔ دوسری بار اپنی اہلیہ کے ساتھ تشریف لے گئے اور ان کو بھی اس فریضۂ اسلام سے بامراد کرایا۔

میں نے اپنی نوجوانی میں حاجی محمد فاروق صاحب کو بزرگ کی صورت میں دیکھا۔ درمیانہ سے ذرا اونچا قد، بھاری جسم، گندمی رنگ، لمبا چہرہ اس پر خوبصورت شرعی داڑھی۔

Marfat.com

سنا ہے جوانی میں ترکش ٹوپی اوڑھتے تھے مگر میں نے انھیں ہمیشہ کالی رامپوری ٹوپی میں دیکھا۔ جاڑوں میں اونی فرکی براؤن ٹوپی اوڑھتے تھے۔ لباس کے معاملے میں بہت باوضع تھے۔ بارہ مہینے کرتہ اور شرعی پاجامہ پہنتے تھے۔ گرمیوں میں صدری اور سردیوں میں گرم واسکٹ کا اضافہ ہوتا۔ کسی تقریب میں تشریف لے جاتے تو شیروانی زیب تن کرتے تھے۔ چہرے مہرے سے سادگی اور شفقت کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ اجنبیوں سے ذرا لیے دیے رہتے تھے مگر جب ایک بار کسی کو جان لیا تو اسے دل میں رکھ لیا۔ بہت التفات فرماتے تھے۔

آپ کو بزرگانِ دین سے بھی بہت عقیدت تھی۔ اپنے دور کے مشاہیر جیسے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور حضرت مولانا احمد سعید وغیرہ سے قریبی مراسم تھے۔ اول الذکر کے علاوہ بقیہ سب سے بے تکلفی سے ان کے ہاں آتے جاتے تھے۔ حاجی صاحب بھی مہمان نوازی کے دلدادہ تھے اور دہلی والوں کی روایتی خاطر داری کر کے بہت خوش ہوتے تھے۔

وائے افسوس، دہلی کا یہ دُرِ بے بہا، غریبوں کا ہمدرد اور قوم کے غم میں گھلنے والا ہم سے ۹ رفروری ۱۹۸۴ء کو جدا ہوگیا۔ قبرستان باقی باللہ میں اپنی بیگم مرحومہ کے پہلو میں تدفین ہوئی۔ جانے والا اپنے پیچھے اپنی یادیں اور نیک کام چھوڑ گیا۔

وہ دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ آمین!

Marfat.com

نیاز حیدر

(۱۹۲۰-۱۹۸۹ء)

اردو اکادمی کے ''دلّی والے'' اس سمینار میں نیاز حیدر پر لکھنے کا دعوت نامہ ملا تو میں چونکا۔ نیاز حیدر تو دلّی والے نہیں تھے۔ وہ اس ''دلّی والے'' سمینار میں کہاں سے آ گئے؟ وہ تو رائے بریلی کے قصبے مصطفیٰ آباد کے بھی نہیں تھے جہاں وہ پیدا ہوئے تھے وہ نظام کی ریاست حیدر آباد کے بھی نہیں تھے جہاں انھوں نے تعلیم پائی اور جہاں انھوں نے سیاسی اور تہذیبی سطح پر اپنی تربیت کی تھی وہ تو بمبئی کے بھی نہ تھے جہاں انھوں نے ترسیل کے مقبول میڈیم سنیما سے خود کو وابستہ کیا جہاں پہلی بار سیاسی قیدی بنے اور نہ وہ دلّی کے تھے جہاں انھوں نے اپنی زندگی کی آخری تین دہائیاں گزارتے ہوئے شاعری کی اور تھیٹر کیا جلسوں اور جلوسوں کی ہنگامہ آرائیاں کیں اپنے سیاسی مسلک کی جی کھول کر تشہیر کی۔ اور بالآخر دلّی کی خاک کا پیوند بن گئے۔ سچ بات یہ ہے نیاز کسی ایک شہر کسی ایک علاقے کے نہیں تھے۔ سارا ہندوستان ان کی سرگرمیوں کا محور اور مرکز تھا انھوں نے خود کو اس ملک کے چاروں اطراف میں پھیلا دیا تھا۔ اسی لیے نیاز حیدر کہیں کسی جگہ خود کو اجنبی محسوس نہ کرتے تھے۔ وہ جہاں بھی جاتے، جہاں بھی قیام کرتے وہاں کا حصہ بن جاتے۔ وہ اپنی پہچان اور شناخت کے پھیلاؤ میں جیتے تھے۔ وہ محدود کے بجائے لامحدود میں سفر کرتے تھے۔ وہ دائروں اور حلقوں کے بجائے بیکراں ہو کے جینے میں سرخوشی محسوس کرتے تھے۔ نیاز حیدر ترتیب اور منظم زندگی اس کی زیبائش کے دشمن نہیں تھے اس سے بیزار بھی نہیں تھے انھوں نے زندگی کو بے نیازی اور اک شان قلندری سے جینے کا وعدہ خود سے کیا تھا سو اسے انھوں نے پوری سچائی کے ساتھ اس میں کانٹ چھانٹ کیے بغیر نبھایا بھی اور اسے پورا کیا۔

نیاز حیدر کی شخصیت کو زندگی دشمن اور دنیا بیزار کہنے والے یہ جتانا چاہتے ہیں کہ نیاز زندگی کی نعمتوں کے منکر تھے انھوں نے جس انداز میں جینے اور زندگی بسر کرنے کو اپنا شعار قرار دیا وہ اثبات سے کہیں زیادہ نفی کی حامل تھی۔ گویا نیاز کو بھی ایک نارمل زندگی گزارنی چاہیے تھی۔ چوں کہ وہ عام پسند اور مروجہ زندگی کے دائرے سے باہر تھے اس لیے ان کی طرزِ زندگی ایک بوہمین آدمی کا طرزِ زندگی تھا جو حسن، دلکشی اور سروسامانی سے خالی تھا۔ کچھ ایسا ہی میراجی کے بارے میں بھی کہا جاتا تھا۔ دراصل نیاز اور میراجی کے طرزِ زندگی میں اس جینے کی جھلک تھی جسے عموماً تخلیق کار اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔ غالبؔ نے فقیرانہ بھیس میں زندگی کے شب و روز کا تماشا کرنے کی بات یونہی نہیں کہی تھی وہ زندگی جو تکلفات اور سماجی مرتبے اور احساس کے ساتھ گزاری جاتی ہے وہ آسانی کے ساتھ زندگی سے ہم آغوش نہیں ہوتی۔ نیاز اور میراجی دونوں ہی مروجہ سماجی پیمانوں کے اعتبار سے ابنارمل زندگی جینے والے تھے گویا ابنارمل ہونا سماجی قانون کی ایک ایسی خلاف ورزی ہے کہ جس کی سزا یہ ہے کہ ابنارمل مخلوق کو زندگی سے خارج کر دیا جائے۔ یہاں دلچسپ اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ میراجی اور نیاز حیدر دونوں نے اسی غیر تسلیم شدہ زندگی کو اپناتے ہوئے اپنی تخلیقی ذہن کی آبیاری کی اور اس کے تقاضوں کو پورے اخلاص کے ساتھ پورا کیا۔

نیاز حیدر نے کئی بار اپنے بارے میں یہ بات کہی ہے کہ ان میں ایک سیلانی کی آنکھ سے اردگرد پھیلی اور بکھری ہوئی زندگی کا مشاہدہ کرنے اور ایک طرح سے ٹوٹ کر اس میں شامل ہونے اور اس کا حصہ بن جانے کا جو شدید اضطراب تھا وہ انھیں قریہ قریہ لیے پھرتا تھا اس کے لیے انھوں نے بے گھری اور بے دری اور بے سروسامانی کو ہنسی خوشی قبول کیا اور اپنے لیے زندگی کے مطالبوں اور ضرورتوں کو قلیل اور کم کرتے ہوئے نگری نگری پھرا مسافر کے مصداق وہ اچانک ہی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔

دلی میں نیاز حیدر کی ایک بڑی مصروفیت تھیٹر کرنا تھا۔ دلی میں قیام کے تیس سے زائد برسوں میں انھوں نے شکنتلا، امرپالی جیسے ڈرامے لکھے اور کئی ڈرامے ترجمہ بھی کیے۔ ایسا ایک ڈراما بریخت کا کاکیشین چاک سرکل بھی تھا یہ ڈراما 'سفید کنڈلی' کے نام سے ہندوستانی تھیٹر کی طرف سے کھیلا جانا تھا اور ایس ایم ستھیو کو ڈائرکٹ کرنا تھا۔ نیاز حیدر سفید کنڈلی کے

Marfat.com

مکالمے لکھ رہے تھے کہ اچانک لاپتہ ہوگئے۔ سارا کام رک گیا۔ چاروں کونے گھوڑے دوڑائے گئے مگر نیاز حیدر کہیں نہ ملے۔ شمع زیدی اور ستیو کو کسی نے میرا نام بتادیا کہ باقی اسکرپٹ وہ مجھ سے لکھوالیں میں نے ہامی بھرلی۔ کچھ دن بعد اچانک نیاز حیدر ہنستے کھیلتے سگریٹ کا دھواں اڑاتے آگئے۔ کسی کو حیرت نہ ہوئی۔ میں نے قلم جیب میں رکھا تو نیاز جو مجھ سے اچھی طرح واقف تھے اصرار کرنے لگے نہیں تم اپنا کام جاری رکھو۔ کیا معلوم کس سمت سے پھر کوئی بلاوا آجائے۔ نیاز نے جہاں سے اسکرپٹ لکھنا چھوڑا تھا وہیں سے پھر لکھنا شروع کیا اور یوں 'سفید کنڈلی' ڈراما میری پیوندکاری سے بچ گیا۔

نیاز حیدر نے اکثر ملاقاتوں میں یہ اعتراف کئی بار کیا ہے کہ انھوں نے حیدرآباد میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں مخدوم محی الدین کو اپنے آدرش کے روپ میں دیکھا تھا۔ نیاز حیدر کے ساتھ بے شمار ملاقاتوں اور صحبتوں میں میں نے انھیں مخدوم کو والہانہ انداز میں یاد کرتے پایا تھا۔ میرے لیے یہ ایک بڑی بات تھی کہ مخدوم میرا بھی آدرش تھے۔ میں تلنگانہ تحریک کے شدید اثرات لے کر ۱۹۵۲ء میں دلّی آیا تھا۔ دلّی میں میرے ابتدائی پانچ چھ سال اسی تحریک کے اثر کو اپنے اندر زندہ رکھنے میں گزرے تھے اور میں اس وقت کے بائیں بازو کے رنگ منچ کی سرگرمیوں میں اور انتخابی جلسوں میں بے حد سرگرم تھا۔ میں اس زمانے میں ایک طرف جامع مسجد کے اردو بازار میں مولانا سمیع اللہ کی دوکان پر حاضری دیتا تو کناٹ پلیس کے ٹی ہاؤس میں ترقی پسند اور نئے ادب کے شیدائی دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر ادب کے تازہ منظرنامے پر ہونے والی بحث میں حصہ لیتا۔ نیاز حیدر مجھے ہر جگہ نظر آتے۔ وہ ہر جگہ قہقہہ بردوش اونچی اور قطعی آواز میں اپنے ترقی پسند مسلک کا اعلان کرتے ہوئے برجستہ دلائل سے مخالف کو خاموش کردیتے۔

وہ نتائج سے بے پروا ہوکر سچ بولتے اور لکھتے تھے۔ نیاز حیدر کا یہی وہ وصف تھا کہ ان کے شعری لہجے میں بلا کی توانائی اور سربلندی تھی۔ وہ بھی بیانیہ لہجے کو ترجیح دیتے تھے مگر اس بیانیہ میں بھی گیرائی اور گہرائی ہوتی تھی۔ نیاز کا ایک اور بڑا وصف ان کا خلاق ذہن تھا وہ بیحد پرگو شاعر تھے اور انھیں اپنے موضوع سخن پر پوری دسترس ہوتی تھی۔ زندگی اپنے ان گنت مظاہر کے ساتھ ان کی نظموں میں راہ پاتی تھی ان میں اپنے شعری اظہار کو عوامی رنگ

Marfat.com

دینے کا شعوری احساس تھا وہ جانتے تھے کہ ان کا سامع اور قاری کون ہے۔ قاری اور سامع کی اس پہچان کے ساتھ انھیں اپنے شعری اظہار کو ہم آہنگ کرنے میں کوئی دشواری یا تردد نہیں ہوتا تھا کہ وہ شاعری کی عام آدمی تک رسائی کے قائل تھے۔ شاعری کے اسی تصور نے انھیں اس ضرورت کا احساس بھی دلایا کہ وہ اپنی شعری زبان کی سطح پر کچھ ایسی تبدیلیوں کو قبول کریں جس سے ان کی بات لوگوں تک پہنچ جائے۔ چند ایک نظموں کو چھوڑ کر نیاز نے اس بات کی کوشش کی کہ ان کا طرزِ اظہار خشک، بے جان اور کھردرا نہ بن پائے شاید ان کے اس شعوری احساس کی بنا پر ان کی شاعری نعرہ بننے سے بچ گئی۔ نیاز کے شعری مجموعہ ''شعلہ آوارگی'' میں کئی نظمیں ایسی ہیں جو ترقی پسند نظم میں اجتہاد کا درجہ رکھتی ہیں مثلاً زمین اور اس کا جلال و جمال ترقی پسند نظم کا دل پسند موضوع تھا اس پر وامق کی نظم بھی ہے مگر نیاز کی نظم سنو تو مجھ سے سنو نغمۂ جمال زمیں بڑی جہاں تاب نظم ہے:

حدیثِ غم ہے زمیں نغمۂ طرب ہے زمیں
شعلہ و شبنم و اشک و گہر عجب ہے زمیں

صبا کی موج ہے طوفانِ بے اماں ہے زمیں
مقام مرگ بہاراں ہے گلستاں ہے زمیں

کبھی ہے پیکرِ فردوسِ حسن و عشق و شباب
کبھی ہے دوزخ اسفل سے بھی زیادہ خراب

دیارِ خضر بھی گمراہ کا وطن بھی یہیں
خدا کا گھر ہے مکیں گاہِ اہرمن بھی یہیں

بدلتی رہتی ہے کردار کامیابی سے
زمیں زمیں ہے اسی خوبی و خرابی سے

اسپینی زبان کے شاعر پابلو نرودا کے کردار اور شخصیت کا ایک پہلو روپوشی، آوارہ مزاجی اور گردشِ پا کی مسافتیں تھیں نیاز بھی اسی قبیل کے شاعر تھے۔ نیاز نے اپنی گردشِ پا کو مشاہدے کا اضطراب کہا تھا اور اس اضطراب کے حوالے سے ہندوستان کے تہذیبی ماضی اور اس کی ہمہ جہتی کا سراغ پانے کا حوصلہ کیا تھا۔ پابلو نے قریہ قریہ اپنے فرار، روپوشی اور جہاں گردی کو آفاقیت کی جستجو اور اس کے عرفان سے تعبیر کیا تھا نیاز کے مقابلے میں پابلو اپنے مقصد کے حصول میں زیادہ سرخ رو رہا۔ اب یہاں اس بحث کو طول دینے کی گنجائش نہیں، لیکن کچھ موضوعات کو اپنے شعری اظہار کا حصہ بنانے میں یہ دونوں شاعر ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ امن کے موضوع پر نیاز کی نظم امن کے حق میں ایک طاقتور نظم کے طور پر یاد رکھی گئی:

بلند ہے زندگی کا یہ پرچم جہاں کا نقشہ بدل رہا ہے
وہ جنگ کی تیز تند آندھی میں امن کا دیپ جل رہا ہے

نیاز صحیح معنی میں خرقہ پوش تھے۔ وہ شخصیت کی تراش خراش اور اسے پرکشش بنانے سے بے نیاز تھے بلکہ یوں کہا جائے کہ انھیں زندگی کے اس تزئینی پہلو سے دلچسپی نہ تھی تو زیادہ صحیح ہوگا۔ وہ اپنے حلقے میں بے تکلف اور قلندروں کی طرح گھومتے۔ کہیں بھی صبح کر لیتے کہیں بھی شام کر لیتے۔ ہندوستان کے سارے شہروں میں انھیں بڑی حد تک دلّی ہی راس آئی تھی۔ وہ اس کے گلی کوچوں کے عاشق تھے۔ اس شہرِ بے مثال میں ان کے اپنے پسندیدہ ٹھکانے تھے۔ وہ نشے کو عیشِ دو جہاں سمجھتے تھے۔ حوض قاضی کے چوراہے پر وہ اپنے کسی بھی بھگت کے کاندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے گانجے کی دوکان پر ٹھہر جاتے۔ دو گلاس حلق میں ایک ساتھ انڈیل لیتے اور پھر ہتھیلیوں سے اپنی مونچھوں پر جمے قطروں کو صاف کرتے ہوئے 'الکھ نرنجن' والے انداز میں بھگتی اور تصوف کی گرہیں کھولتے ہوئے جامع مسجد کی طرف نکل جاتے۔

نیاز حیدر کے لیے کمیونسٹ پارٹی کے جلسوں اور جلوسوں میں شامل رہنا لازمی تھا وہ اپنے پورے وجود اور شخصیت کے ساتھ دلّی کے عوام میں گھل مل کر احتجاج، مزاحمت کا نعرہ لگاتے اور جبر و ظلم کے اور انسان کا استحصال کرنے والی قوتوں کے خلاف صف آرا

Marfat.com

ہو جاتے۔ وہ پوری طرح رزم کے شاعر تھے۔ وہ بے حد گرجدار اور آواز کی صلابت کے ساتھ مشاعرے میں کلام سناتے اور سامعین کو اپنا ہمنوا اور دیوانہ بنا کر داد سمیٹتے ہوئے کسی پاس کے میخانے میں تازہ دم ہونے پہنچ جاتے۔ بہت سرشار ہوتے تو نظم سنانے کے بجائے غزل سناتے اور کہتے تھے مسلمان بننے کے لیے جیسے ختنہ ضروری ہے ایسے ہی شاعر کہلوانے کے لیے غزل کہنا بھی ضروری اور پھر مطلع سناتے:

منبر تک آگئی ہے گھٹا شیخ اب تو پی
ایمان لوٹ آئے گا موسم نہ آئے گا

□□

Marfat.com

سکندر بخت : ایک مثالی شخصیت

سکندر بخت ۲۴/اگست ۱۹۱۸ءکونواب روڈ قریش نگر (قصاب پورہ) دلّی کے ایک حویلی نمامکان میں پیدا ہوئے تھے۔ان کے والد کا نام حافظ محمد یوسف، دادا کا نام الٰہی بخش ووالدہ کا نام نوشابہ بیگم تھا۔ اگر چہ ان کے والد کا تعلق قریش برادری سے تھا مگر ان کے بزرگوں نے برادری کا مروجہ کام چھوڑ کر تمبا کو کے کام کو اپنالیا تھا، اس لیے تمبا کو والوں کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا نام تاریخی رکھا گیا۔ ان کی وفات ۲۳/فروری ۲۰۰۴ءکو تریوندرم میں ہوئی جہاں وہ بحیثیت گورنر کیرالا مقیم تھے اوران کی تدفین ان کی وصیت کے مطابق شاہ ولی اللہ کی خانقاہ مہندیان دہلی میں ہوئی۔سکندر صاحب کی پیدائش جس برادری میں ہوئی تھی ان کے یہاں اس وقت دنیاوی تعلیم کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ان کے خاندان میں اگر کسی کا پڑھے لکھوں میں شمار کیا جاسکتا تھا تو وہ ان کی والدہ محترمہ تھیں۔ سکندر صاحب اپنی برادری میں پہلے گریجویٹ اور وہ بھی سائنس میں تھے۔وہ خود کہا کرتے تھے انھوں نے تعلیم بغیر کسی مقصد کو سامنے رکھ کر حاصل کی تھی۔ سائنس کا مضمون چنتے وقت بھی ان کے سامنے کوئی واضح مقصد نہیں تھا۔ایک رئیس زادے کو وقت گزارنے کے لیے کھیل کود کے علاوہ سرگرم رہنا تھا اس لیے تعلیم کو چن لیا۔ مقامی مدرسے و اسکول سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے دلّی کالج سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ان کے کالج کے زمانے کے ساتھیوں میں بہت سے نامور لوگ ہوئے ہیں۔علی سردار جعفری اور میر مشتاق احمد کے نام بھی ان میں شامل ہیں۔ کالج کی زندگی میں سکندر صاحب ادبی سرگرمیوں میں بھر پور حصہ لیا کرتے تھے مگراس میں کوئی اہم مقام حاصل کیا ہو اس کے آثار نظر نہیں آتے البتہ ہزاروں شعراان کو ازبر تھے۔شاید یہ ان ہی سرگرمیوں کی دین ہو اور ان

Marfat.com

شعروں کا استعمال وہ باموقع خوب تر کیا کرتے تھے۔ ان ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے ان میں مطالعہ کا شوق جنون کی حد تک پیدا ہو گیا تھا۔ وہ سونے سے پہلے جب تک ایک دو گھنٹے پڑھ نہ لیں ان کو نیند نہیں آتی تھی۔ ہر موضوع پر ان کے پاس کتابیں موجود تھیں۔ جن لوگوں نے ان کی کتابیں دیکھی ہیں وہ شاہد ہوں گے جتنی کتابیں ان کے پاس تھیں سلیقہ سے رکھنے کے لیے اتنی جگہ نہیں تھی۔ سوٹ کیسوں اور اٹیچیوں میں کتابیں رکھ چھوڑی تھیں۔ اس شوق کے شائقین جانتے ہیں یہ کتنا مہنگا شوق ہے۔ جب تک والد صاحب حیات رہے اور ان کا خاندانی کاروبار چلتا رہا اخراجات میں کوئی کمی نہیں آئی۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد انھوں نے اس شوق کو پورا کرنے کے لیے پرانی کتابیں خرید کر کام چلایا۔ کناٹ پلیس پلازہ سنیما بلڈنگ میں ایک پرانی کتابوں والا تھا جب بھی کسی موضوع پر کتاب کی ضرورت ہوتی اس سے کہہ دیتے یا ان کے مذاق کے مطابق کوئی کتاب آجاتی تو وہ ان تک پہنچا دیتا۔ کالج کے زمانے میں جس خوبی نے دلّی سے باہر ان کو شہرت دلائی وہ متعدد کھیلوں میں ان کی مہارت تھی۔ فٹ بال، کرکٹ، کبڈی اور ہاکی اس میں قابلِ ذکر ہیں۔ ہاکی میں تو ان کا ایک خاص مقام تھا اور اس کے کپتان بھی رہے تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کے علاوہ یورپ میں بھی اپنے شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا تھا اور داد بھی حاصل کی تھی۔ شطرنج، کبوتر بازی، پتنگ بازی اور گھوڑ دوڑ میں بھی ان کی دلچسپیاں مہارت کی حد تک پہنچی ہوئی تھیں۔ گھوڑے کی چال دیکھ کر بتا دیا کرتے تھے کہ کون سا گھوڑا اول آئے گا۔ کبوتروں اور کتوں کی نسلوں کو اس طرح بیان کرتے تھے جیسے پوری زندگی انہی کے مطالعہ میں گزاری ہو۔

سکندر صاحب کی شخصیت جوانی سے لے کر آخر تک بے حد جاذب نظر رہی ہے۔ بلند و بالا کسرتی بدن، دمکتا ہوا گول کلین چہرہ سفید سرخی مائل رنگ، ماتھے پر بالوں کی لٹیں ان کے حسن کو اور بھی دوبالا کر دیتی تھیں۔ ہمیشہ صاف ستھرے موزوں اور قیمتی لباس میں رہنے کے عادی تھے۔ گھر تک میں اس ادا کو چھوڑتے نہیں تھے۔ جاڑوں میں سوٹ اور اس پر میچ کرتی ہوئی ٹائی۔ گرمیوں میں کلر فل قمیض پینٹ اور کرتا پاجامہ اور کبھی کبھی اس پر واسکٹ ان کا پسندیدہ لباس تھا۔ چال میں شانِ بے نیازی تھی۔ اسکوٹر سے لے کر موٹر کار

Marfat.com

تک بڑے ماہر ڈرائیور کی طرح چلایا کرتے تھے۔ ۱۹۴۰ء کی دہائی میں دلی کی سڑکوں پر موٹر کار دوڑاتے نظر آتے تھے۔ اس وقت خال خال لوگوں کے پاس موٹر کاریں ہوا کرتی تھیں۔ شروع میں ان کو اسٹنڈرڈ کار بہت پسند تھی بعد میں فیٹ اور اپنی کاریں بھی ان کے پاس رہیں۔ بول چال انتہائی دلنشیں اور پرکشش تھی۔ جب کبھی پڑھے لکھے لوگوں میں بول رہے ہوتے تو سننے والوں کے کانوں میں رس گھول دیتے تھے۔ یوں بھی قدیم دلی والے اپنے لب و لہجے سے پہچانے جاتے ہیں پر سکندر صاحب کا لہجہ بہت ہی زیادہ سحر انگیز تھا۔ عجیب بات یہ تھی جب کم پڑھے یا بے پڑھے لکھوں میں بول رہے ہوتے تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اپنی قابلیت سے ان کو مرعوب کر رہے ہیں۔ الفاظ ان کی فہم کے مطابق مگر لہجہ میں مٹھاس بھری اپنائیت برقرار رہتی تھی۔ پرانی قدروں، تہذیب اور ثقافت پر جان دیتے تھے۔ نفاست پسندی ان کی زندگی کا اہم جزو تھی یہ ان کو اپنی والدہ سے وراثت میں ملی تھی۔ والدین صوفی مسلک کے پیروکار تھے۔ گجرات کی ایک خانقاہ سے تازندگی وابستہ رہے۔ اس کے سجادہ نشین کے مرید تھے۔ سکندر صاحب تقریباً ۳۵ سال کی عمر تک صوم وصلوٰۃ کے پابند رہے اپنے کھلاڑی دوستوں کو فجر کی نماز کے لیے اٹھایا کرتے تھے پھر پریکٹس کے لیے کھیل میدان میں سب مل کر جایا کرتے تھے۔ رمضان میں نماز تراویح وہ مولانا عبدالحلیم صدیقی کے پیچھے سنہری مسجد لال قلعہ کے سامنے پڑھا کرتے تھے۔ مولانا موصوف پانچ روز میں قرآن مکمل کیا کرتے تھے ان کا معمول تھا پہلی رکعت میں تین چار پارے پڑھا کرتے تھے ان کے پیچھے پڑھنے والے اکثر رکوع میں شریک ہوا کرتے تھے۔ تین چار لوگ ہی شروع ہی سے نیت باندھا کرتے تھے۔ ان میں سکندر صاحب بھی ہوتے تھے بعد ازاں یہ مذہبی رجحان برقرار نہیں رہا۔

سکندر صاحب فرمایا کرتے تھے ان کی زندگی حادثات اور حالات کے بہاؤ میں بہتی رہی ہے۔ ۱۹۴۷ء تک ان کی سیاسی سرگرمیاں نہ کے برابر تھیں۔ تقسیم ملک و تبادلہ آبادی کی وجہ جو فسادات برصغیر کے اکثر حصوں میں ہوئے دلی بھی اس سے اچھوتی نہیں رہی۔ پنجاب کے بعد دلی سب سے زیادہ متاثر ہوئی۔ مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا جا رہا تھا۔ جامع مسجد کے علاوہ کوئی بھی علاقہ محفوظ نہیں رہا تھا۔

Marfat.com

سبزی منڈی اور پہاڑ گنج، قرول باغ میں تو لاشوں کے انبار لگا دیے گئے تھے۔ مستورات کے ساتھ جو سلوک کیا گیا تھا اس کا ذکر نہیں کیا جائے تو بہتر رہے گا۔ قصاب پورہ اور سرائے خلیل ان دونوں علاقوں سے ملا ہوا تھا اور یہ مانا جاتا تھا کہ یہاں کے رہنے والے ہیکڑ اور طاقت ور ہیں اس لیے ان کو پوری طاقت جمع کر کے نشانہ بنایا جائے گا۔ ان پُر آشوب اور ہنگامی حالات کی وجہ سے سکندر صاحب کو عوامی زندگی میں داخل ہونا پڑا جب کئی بار قصاب پورہ میں حملے ہو چکے تو سکندر صاحب وہاں کے قوم پرست مسلمانوں کا ایک وفد لے کر مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کے لیے گئے اور قصاب پورہ باڑہ ہندوراؤ اور آس پاس کے تمام علاقوں کی صورتِ حال بتائی اور کہا کہ سرکاری مشینری خاص کر ڈپٹی کمشنر مسٹر رندھاوا اور پولیس سپرنٹنڈنٹ مسٹر جگن ناتھ کا جو رویہ ہے اس سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ ان علاقوں میں مسلمانوں کو رہنے نہیں دیں گے۔ اگر حکومت کی بھی یہی پالیسی ہے تو یہاں کے لوگ اپنا بستر باندھ کر پاکستان کی راہ لیں۔ کافی بحث کے بعد مدراس ملٹری کو ان علاقوں کی حفاظت کے لیے مامور کیا گیا۔ اس تمام صورتِ حال کی اطلاع پنڈت نہرو کو پہنچی تو شریمتی اندرا گاندھی اور شریمتی سبھدرا جوشی (جو اس وقت سبھدرا دت تھیں) کو اس علاقہ میں ریلیف کیمپ لگانے کو کہا گیا۔ چنانچہ اس کا دفتر سکندر صاحب کا نواب روڈ والا مکان بنایا گیا۔ حالات کے معمول پر آنے تک اندرا جی نے یہاں سے ریلیف کا کام جاری رکھا اور ان ہی کی تجویز پر دلّی کے مسلم علاقوں میں اسپیشل مجسٹریٹ مقرر کیے گئے۔ میر مشتاق احمد صاحب، عزیز حسن بقائی جامع مسجد کے لیے اور سکندر صاحب قصاب پورہ وغیرہ کے مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ یہ ان کی عوامی زندگی کی شروعات تھی۔ یہاں سے ہی وہ جمعیۃ علماء ہند اور کانگریس کے رابطے میں آئے۔ سکندر صاحب کو اوائلِ عمری سے شکار کا شوق تھا اس لیے ان کے پاس بندوق اور ریوالور بھی تھی جو اس دور میں فسادیوں پر قابو پانے میں متعدد مرتبہ کام میں آئی۔

اس کے بعد سکندر صاحب کا شمار دلّی کانگریس کے اہم کارکنوں میں ہونے لگا تھا انھوں نے قصاب پورہ سے دلی میونسپل کمیٹی کا الیکشن لڑ کر میونسپل کمشنر کی حیثیت سے قابلِ تعریف خدمات انجام دی تھیں مگر سیاسی گروپ بندی کی وجہ سے ان کو دو مرتبہ پارٹی ٹکٹ

Marfat.com

نہیں دیا گیا تو انھوں نے اپنی سیاسی طاقت کا احساس دلانے کے لیے جامع مسجد والا گھر جہاں آج وکیلا ہوٹل ہے بہت ہی کم قیمت پر اپنے دوست محمد وکیلا صاحب کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ دلّی پردیش کانگریس کمیٹی کے تیس میں سے پندرہ اپنے ہمنوا ڈیلیگیٹ منتخب کرا کر اس وقت کی صوبائی قیادت کو اپنی اہمیت کا احساس دلایا۔ اس وقت تک دلی میونسپل کمیٹی کی جگہ میونسپل کارپوریشن کا انعقاد عمل میں لا دیا گیا تھا چنانچہ ان کو حلقہ سوئیوالان سے ان کے کہنے سے کئی اور مسلمانوں کو میونسپل کارپوریشن کے ٹکٹ دیے گئے۔ ان سب نے شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ اسی دور میں ان کو دلی الیکٹرک سپلائی بورڈ کا چیئرمین منتخب کیا گیا جہاں پر انھوں نے اپنی بھرپور اہلیت کا لوہا اپنے دشمنوں سے بھی منوایا حالاں کہ اس سے پہلے ۱۹۵۳ء میں جب اسمبلی بنی تھی تو وزیر اعلیٰ چودھری برہم پرکاش کے پولیٹیکل سکریٹری کی حیثیت سے دلی والوں کا دل جیت چکے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں کانگریس کے دو حصے ہو گئے۔ ایک حصہ جو بہت بڑی تعداد میں تھا مسز اندرا گاندھی کے ساتھ رہا اور ان کی کانگریس کا نام کانگریس (آئی) رکھا گیا۔ دوسرا گروپ جو تعداد میں بہت ہی کم تھا کانگریس (او) کے نام سے مشہور ہوا۔ سکندر صاحب نے مسز گاندھی سے ذاتی مراسم کے باوجود کانگریس (او) کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تب سے سکندر صاحب مرکزی سیاست میں داخل ہو گئے اور آل انڈیا کانگریس (او) کے جنرل سکریٹری بنائے گئے۔ اسی کانگریس کے ٹکٹ پر انھوں نے سوئیوالان سے میونسپل کارپوریشن کا الیکشن لڑا مگر ناکام رہے۔ پھر چند ماہ بعد میٹرو پولیٹن کونسل کا الیکشن لڑا تو کامیاب رہے۔ اس دوران ایمرجنسی لگ گئی اور سکندر صاحب بھی پہلے ہی دن گرفتار کر لیے گئے اور پورے ۱۹ مہینہ تک جیل میں رہے۔ اور وہ جو کہاوت ہے سونا تپ کر ہی کندن بنتا ہے۔ سکندر صاحب پر یہ کہاوت پوری طرح صادق آتی ہے۔ جیل جانے سے پہلے سکندر صاحب عوامی جلسوں میں بہت دھیمے اور سیدھے سادھے انداز میں تقاریر کرتے تھے۔ ایمرجنسی ختم ہونے کے بعد جب وہ رہا ہوئے تو ان کی تقاریر پُر جوش اور پُراثر ہو گئیں، جس سے ان کی مقبولیت میں بے انتہا اضافہ ہو گیا۔ جیل کی تنہائی میں جو فرصت ملی انھوں نے اسے مطالعہ میں صرف کیا اس نے ان کی فکر میں بے انتہا گہرائی پیدا کر دی جو بعد ازاں عوام اور معاشرے کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔ پہلے ان کی گفتگو

Marfat.com

ایک عام سماجی کارکن یا سیاست داں جیسی ہوتی تھی مگر اب ایک مفکر جیسی ہوگئی۔

ایمرجنسی کے بعد جب سیاسی قائدین رہا ہونے شروع ہوئے تو انھوں نے متحد ہوکر جنتا پارٹی کے نام سے ایک سیاسی تنظیم بنالی اور اس کا مرکزی دفتر جنترمنتر کانگریس (او) کے پرانے دفتر میں رکھا گیا۔ اس میں کانگریس (آئی) اور کمیونسٹوں کے علاوہ تمام جماعتیں شامل ہوگئیں۔ سکندر صاحب بھی اس کے ایک جنرل سکریٹری مقرر کیے گئے۔ اس تنظیم کو باقاعدہ منظم بھی نہیں کیا جاسکا تھا کہ لوک سبھا کے انتخابات کا اعلان ہوگیا۔ جنتا پارٹی کے پاس انتخاب لڑنے کے لیے نہ سرمایہ تھا نہ ہی کارکن۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلے انتخاب تھے جس میں عام رائے دہندگان کارکنوں کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ خود ہی سرمایہ فراہم کرنے لگے۔ سکندر صاحب نے بھی دلی کے چاندنی چوک حلقہ سے انتخاب لڑا اور شاندار کامیابی حاصل کی۔ شریمتی سبھدرا جوشی جیسی لیڈر کی ضمانت ضبط ہوگئی۔ جنتا پارٹی کی تشکیل قواعد و ضابطے بنائے بغیر کی گئی تھی اس لیے ڈھائی سال میں اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ جب دوبارہ الیکشن ہوئے تو کانگریس (آئی) پوری طاقت کے ساتھ واپس آگئی۔ سکندر صاحب مسلسل تین مرتبہ اسی حلقہ سے ہارتے رہے اور اس کی وجہ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ کسی بھی انتخاب میں کامیابی کے لیے جن لوازم کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب موجود تھے۔ اس حلقہ میں ہزاروں گھرانے ایسے تھے جن سے ان کے گھریلو مراسم تھے اور اس سے بھی بڑھ کر ان کی برادری کے لوگ جو بڑی تعداد میں اس ہی حلقہ میں آباد ہیں ان کی موجودگی میں ہارنا کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ دراصل جمہوری نظام میں کام اور صلاحیت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ لوگ اپنے نمائندے کو ہر وقت اپنے قریب اور سامنے دیکھنا چاہتے ہیں۔ جنتا پارٹی کے دورِ حکومت میں جب سکندر صاحب وزیر بنائے گئے تو ان کے چارج میں نو اہم محکمے دیے گئے۔ سکندر صاحب افسر شاہی کو اپنے پر حاوی نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ افسروں کے نوٹس پر انحصار نہیں کرتے تھے۔ ہر فائل کو گہرائی سے دیکھتے پھر اس پر حکم لکھا کرتے تھے۔ کسی بھی انسان کے پاس ایک دن میں چوبیس گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوتے اس میں ہی اس نے فطری ضروریات بھی پوری کرنی ہوتی ہیں اس لیے سکندر صاحب اتنا وقت اپنے حلقے کے لوگوں کو نہیں دے سکے جتنا وقت

Marfat.com

کارپوریشن اور میٹروپولیٹن کونسل کی ممبری کے زمانے میں دیا کرتے تھے بعد میں جب انھوں نے بھارتیہ جنتا پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی تو یہ بات ان کے ووٹ بینک کے حلق سے نہیں اتری جس کی وجہ سے وہ انتخابات میں ناکام ہوتے رہے۔

جنتا پارٹی کے دورِ حکومت میں سکندر صاحب نے مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بھی نہ بھولنے والے کام انجام دیے تھے۔ لوک سبھا کے پہلے ہی اجلاس میں سابقہ حکومت کا پیش کردہ مسلم متبنّٰی بل جس کے لیے مسلمانوں کے ہر طبقہ کی جانب سے زبردست احتجاج کیے جارہے تھے۔ واپس لینے کا اعلان کردیا۔ کچھ ممبران کی طرف سے اس پر اعتراض کیا گیا تو انھوں نے بڑی بے باکی سے جواب دیا، جن لوگوں کے لیے یہ قانون بنایا جارہا تھا ان کے مذہبی قانون اس کی اجازت نہیں دیتے اور موجودہ حکومت کا ارادہ کسی کے مذہبی امور میں مداخلت کرنے کا نہیں ہے اس پر جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے اس کو صحیح اور تاریخ ساز قدم بتایا گیا تھا۔ ایمرجنسی میں صفائی کے نام پر جن علاقوں کو اجاڑا اور بلڈوز کیا گیا تھا اور وہاں کے باشندوں کو دور دراز غیر آباد علاقوں میں ڈال دیا گیا تھا، انھیں دوبارہ واپس لاکر ان ہی علاقوں میں نئی تعمیر کراکے آباد کیا گیا۔ ترکمان گیٹ کی آبادی کو تو کھچڑی پور کے کھلے میدان میں جہاں نہ پانی تھا نہ بجلی ڈال دیا گیا تھا ان کو منٹو روڈ اور ماتا سندری روڈ میں خالی پڑے کوارٹروں میں عارضی طور پر آباد کیا گیا۔ جب ترکمان گیٹ میں کوارٹر بن گئے تو ان کو مستقل آباد کیا گیا۔ ایسے ہی سرائے خلیل اور دوسرے علاقوں میں بھی کیا گیا۔ سکندر صاحب نے واضح اعلان کردیا تھا کہ حکومت کاروباری ادارہ نہیں ہے جو قیمتی زمینوں سے غریبوں کو بے دخل کرکے منافع کمائے۔ حکومت عوام کی فلاح اور خوشحال زندگی دینے کی پابند ہے۔ جب ان کی توجہ تبلیغی مرکز نظام الدین کی ضرورت کی طرف دلائی گئی اور بتایا گیا کہ مرکز کی ضرورت کو نظر انداز کرکے یہ تمام جگہ پولیس تھانے کے لیے مخصوص کردی گئی ہے تو انھوں نے تھانے کی الاٹ شدہ زمین میں سے مرکز کی ضرورت کے مطابق زمین کاٹ کر حکومت کی مقررہ قیمت ۴۰۰۰۸ روپے میں الاٹ کردی۔ اسی طرح آثارِ قدیمہ کی تحویل میں جتنی مساجد تھیں ان کو نماز کے لیے کھول دیا گیا وہ تو اس حق میں تھے کہ مندروں اور دوسری عبادت گاہوں کو بھی ان کے ماننے والوں کے حوالے کردیا جائے مگر

Marfat.com

وزیر اعظم نے ان کو ایسا کرنے سے روک دیا۔ جنتا حکومت میں انھوں نے پورے دبدبے اور وقار کے ساتھ وزارتی فرائض انجام دیے تھے۔ ان کی راہ میں کسی نے رکاوٹ نہیں ڈالی تھی۔ وزارتِ اوقاف بھی ان ہی کے پاس تھی۔ انھوں نے کم پڑھے نوجوانوں کے لیے اس وزارت کے تحت ووکیشنل ٹریننگ سینٹر کھولنے کا منصوبہ تیار کرایا۔ اس کا پہلا سینٹر دلی میں کھلنا تھا اس کے لیے زمین تیمار پور میں الاٹ کردی گئی تھی۔ اس کا سنگِ بنیاد وزیر اعظم نے رکھنا تھا مگر اس سے پہلے کہ سنگ بنیاد رکھا جاتا مرار جی بھائی کی حکومت گر گئی اور منصوبہ سرکاری فائلوں میں دفن ہو گیا۔ مرار جی بھائی حکومت کے خاتمہ کے سبب کئی فلاحی منصوبے مکمل نہیں ہو سکے۔ کمرہ بنگش، مٹیا محل میں لڑکیوں کی جدید تعلیم کے لیے ایک اسکول قائم ہونا تھا، اس جگہ چلنے والے زچہ بچہ سینٹر کے لیے میونسپل کارپوریشن کو دوجانہ ہاؤس میں جگہ بنا کر دے دی گئی تھی، لیکن سینٹر ابھی منتقل نہیں ہوا تھا کہ حکومت بدل گئی۔ کارپوریشن نے بنی ہوئی جگہ بھی لے لی مگر سینٹر تبدیل نہیں کیا وہاں آج بھی کستوربا گاندھی اسپتال کی نرسیں رہ رہی ہیں۔ اسی طرح کل ہند پیمانے پر ایک بیت المال قائم ہونا تھا جس کے لیے ملک و بیرونِ ملک کے مالدار لوگوں نے بڑی بڑی رقوم دینے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ کویت کے ایک شیخ نے سکندر صاحب کو پچاس ہزار دینار (اس وقت دینار کی قیمت ۳۵ روپے تھی) نذر کیے تھے۔ انھوں نے شیخ صاحب کو اس کو بطور امانت اپنے پاس رکھنے کے لیے کہا اور بیت المال کی تجویز کے بارے میں بتایا اور کہا اس کے قائم ہونے پر لے لیں گے مگر جب وہ وزیر نہیں رہے تو شیخ صاحب نے خط تک کا بھی جواب نہیں دیا اور یہی رویہ ملک کے دیگر مالدار لوگوں کا بھی رہا۔

۱۹۸۰ء میں جنتا پارٹی دوہری ممبر شپ کے سوال پر تقسیم ہو گئی۔ سنگھ پریوار کے لوگوں نے بھارتیہ جنتا پارٹی کے نام سے الگ پارٹی بنالی۔ اس وقت چند غیر سنگھی قائدین جن میں شانتی بھوشن، رام جیٹھ ملانی، پی این لیکھی اور سکندر صاحب بھی شامل ہو گئے۔ پہلے تینوں حضرات نے پارٹی کے ماحول سے بیزار ہو کر علیحدگی اختیار کر لی مگر سکندر صاحب سب کچھ اس لیے برداشت کرتے رہے کہ ان کا خیال تھا ان لوگوں کو ان ہندوؤں کی حمایت حاصل ہے جو مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہیں ان کے ساتھ رہ کر ان کی

غلط فہمیاں دور کی جاسکیں گی۔ دوسری وجہ ان کے وہ غیر سنگھی ساتھی تھے جو ان کی وجہ سے اس پارٹی میں شامل ہوئے تھے۔ ان کے سیاسی مستقبل کا سوال ان کے سامنے تھا۔ یہ لوگ بھی جب اپنے ساتھ ہو رہے سلوک کی شکایت کرتے تو وہ یہی فرمایا کرتے وسیع مقاصد کے لیے یہ زہر پینا ہی پڑے گا۔ جب کہ اصلیت یہ ہے سب سے زیادہ زہر خود ان کو پینا پڑا۔ سنگھ پریوار اپنے مقاصد کے لیے دوسروں کا استعمال کرتا ہے وہ کسی اس باصلاحیت شخص کو آگے بڑھتا ہوا دیکھ نہیں سکتا جو کسی وقت ان کے مقاصد کے آڑے آسکتا ہو۔ اس عرصہ میں سکندر صاحب کئی بار ان کا شکار ہوئے۔ تین مرتبہ تو انھوں نے اس کا عوامی طور پر بھی اظہار کیا۔ پہلی مرتبہ جب اٹل بہاری واجپئی دوسری بار صدر بنے ان سے بغیر صلاح کیے جنرل سکریٹری سے ہٹا کر نائب صدر بنا دیا گیا تو انھوں نے ابتدائی ممبرشپ کے علاوہ پارٹی کے تمام عہدوں سے استعفیٰ دے دیا۔ کافی یقین دہانیوں کے بعد ان کو منایا گیا۔ دوسری مرتبہ تیرہ دن کی حکومت میں ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ وہ خاموش ہو کر نامعلوم مقام پر جا کر بیٹھ گئے۔ حلف لیتے وقت یہ تاثر دیا گیا کہ ان کو وزیر داخلہ بنایا جا رہا ہے۔ ان کی رہائش گاہ میں راتوں رات وہ تمام آلات نصب کر دیے گئے جو وزیر داخلہ کے لیے لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ تیسری مرتبہ اس وقت جب ۱۹۹۸ء میں وزارت سازی کی گئی تو خوشا بھاؤ ٹھاکرے کے ذریعے پیغام بھجوایا گیا کہ ہائی کمان کا فیصلہ ہے کہ آپ کو کرناٹک کا گورنر بنا دیا جائے جس کو انھوں نے منظور نہیں کیا۔ بعد ازاں جب میڈیا والوں نے بہت اصرار کیا تو انھوں نے ایک آرٹیکل لکھ کر سوال کیا کہ بی جے پی کے قیام سے آج تک میں اس غلط فہمی میں رہا کہ ہائی کمان میں میرا بھی شمار ہوتا ہے مگر اب مجھے وہ جگہ تلاش کرنی پڑ رہی ہے جہاں بی جے پی کے فیصلے ہوتے ہیں۔ درحقیقت سکندر صاحب مرار جی بھائی حکومت میں ایک باوقار وزیر اور اپنے محکمہ جات کو چلانے کے مکمل اختیار کے عادی تھے۔ ۱۹۹۶ء میں ان کو بالکل الگ ماحول سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک واقعہ ان کی تکلیف کی پوری عکاسی کر دے گا۔ انڈسٹری منسٹری کے تحت ماروتی کمپنی آتی ہے۔ جاپان کی سوزوکی کمپنی کو حکومت کی پالیسی کے مطابق جب زائد شیئر دے دیے گئے تو آر ایس ایس کے سودیشی منچ کا وفد ان سے احتجاج کے لیے ملنے گیا۔ بات چیت کے بعد جب سب ان کے کمرے

Marfat.com

سے نکل گئے تو ان میں ایک سینئر لیڈر رک گئے اور اپنی جیب میں سے ایک پرزہ نکال کر کہنے لگے کہ یہ ہماری فیکٹری میں بنتا ہے اور ماروتی کے پیمانے کے مطابق ہے اس میں رتی بھر بھی فرق نہیں ہے۔ سکندر صاحب نے وہ پرزہ لے کر کہا میں دکھوالیتا ہوں تو پتہ نہیں کیا سمجھ کر انھوں نے کہا کہ اس کے منافع میں آپ کا حصہ بھی رہے گا تو سکندر صاحب نے ان کو بیٹھنے کے لیے کہا اور اسٹاف سے محکمہ کے سکریٹری اور دوسرے افسروں کو بلانے کا حکم دیا۔ جب سکریٹری اپنے سینئر آفیسر کے ساتھ آگئے تو سکندر صاحب نے وہ پرزہ ان کو دیتے ہوئے کہا یہ پرزہ ماروتی میں ضرور لگنا چاہیے کیوں کہ یہ آپ کی فیکٹری میں بنتا ہے اور انھوں نے اس کے منافع میں ہمارا حصہ بھی رکھ لیا ہے۔ یہ سنتے ہی ان کے ماتھے پر پسینہ آ گیا اور بوجھل قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئے۔

یہ تو آنے والا مورخ ہی بتائے گا کہ سکندر صاحب کا بی جے پی میں شامل ہونے کا فیصلہ صحیح تھا یا غلط۔ بظاہر تو یہی نظر آتا ہے ان کی شخصیت اور خدمات کو اس فیصلے سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ان کے قریبی لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ۱۹۸۰ء کا الیکشن تو ووٹوں کی تقسیم کی وجہ سے ہارے تھے بقایا دونوں الیکشن سنگھ پریوار کے لوگوں نے جان بوجھ کر ہروائے تھے، ریکارڈ اس کی تصدیق کرے گا۔ جن حلقوں میں سنگھ کے لوگوں کا غلبہ تھا وہاں سے سکندر صاحب کو بہت ہی کم ووٹ ملے۔ اقلیتی حلقوں میں ان کے حق میں زبردست پولنگ ہوئی۔ امام صاحب جامع مسجد تک ان کے حق میں گلی محلوں میں گھوم گھوم کر اپیل کررہے تھے۔ سنگھ پریوار غیر سنگھی امیدوار کو یہ باور کراتا رہتا ہے کہ عوام میں آپ کی حیثیت نہیں ہے آپ کی عوامی اور سیاسی اہمیت ہمارے رحم وکرم پر ہے۔ پہلے تو انھیں ٹکٹ نہیں دیتے ہیں اگر کسی مجبوری کی وجہ سے دینا پڑتا ہے تو کھلے عام ان کو ہرانے کا عمل کرتے ہیں۔ جن لوگوں کی ضرورت یہ اپنے مقاصد کے لیے محسوس کرتے ہیں ان کو نامزد جگہوں پر لاکر بٹھا دیتے ہیں۔ سکندر صاحب کیوں کہ استعمال ہونے والی چیز ثابت نہیں ہوئے تھے اس لیے قدم قدم پر یہ کوششیں کی گئیں کہ وہ بھی دوسرے غیر سنگھی لوگوں کی طرح پارٹی سے از خود الگ ہو جائیں۔ ۱۹۹۰ء میں جو کچھ ان کے ساتھ مدھیہ پردیش میں راجیہ سبھا ٹکٹ دینے کے بعد ہوا تھا ان کو تو اسی وقت پارٹی کو خیر باد کہہ دینا چاہیے تھا

Marfat.com

مگران کی اعلیٰ ظرفی اور فطری شرافت اس کی متقاضی نہیں ہوئی جو ایسا نہیں ہو سکا۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ دراصل سکندر صاحب دلی اور اس کی تہذیبی سرگرمیوں سے بے انتہا شغف رکھتے تھے، یہ بات سنگھ پریوار بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ جب راجیہ سبھا میں وہ اپوزیشن لیڈر منتخب ہوئے تو دلی والوں نے ان کے اعزاز میں وٹھل بھائی پٹیل کے لان میں ایک بہت بڑا جلسہ رکھا تھا۔ جلسے میں اتنی بڑی تعداد میں دلی والوں کو دیکھ کر ان کا دل بھر آیا۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکے" آج میں پھر دلی والا ہو گیا ہوں" جب ان کا ۷۵ واں جنم دن تال کٹورہ اسٹیڈیم میں منایا گیا اور اس میں بہت بڑا ہجوم اور وہ بھی مسلمانوں کا دیکھا تو واجپئی جی جیسا آدمی بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ کاش ہم کو بھی ایسے بے غرض چاہنے والے مل جاتے۔ ان کو ان کے محبوب دیار سے دور کرنے میں بھی یہی مصلحت تھی۔ اجنبی جگہ، اجنبی ماحول اور اجنبی لوگوں میں ہمیشہ ان کو ذہنی کوفت رہے گی۔ یہ سب جانتے تھے کہ غیر ادبی ماحول میں زیادہ دیر نہیں رہ پائیں گے چنانچہ ہوا بھی یہی جس وقت دلّی سے روانہ ہوئے تو معمول کے میڈیکل ٹیسٹ میں ہر چیز پرفیکٹ تھی۔ جب بھی دلی آتے احباب سے ملاقاتیں ہوتیں تو وہاں کی انتظامیہ خاص کر میڈیکل سہولیات کے بہت شاکی نظر آتے تھے پھر پیٹ کے آپریشن کے لیے وہاں کیسے تیار ہوئے دلّی کیوں شفٹ نہیں کیا گیا سب تجسس کا باعث ہے۔ چند گھنٹے پہلے خبر دی جاتی ہے پیٹ میں شدید درد ہو رہا ہے، تھوڑی دیر بعد خبر دی جاتی ہے آپریشن کر دیا گیا، سب ٹھیک ٹھاک ہے پھر رات کو حالات بگڑنے اور انتقال کی خبر دی جاتی ہے۔ سوال اٹھنے پر میڈیکل انکوائری بورڈ مقرر کیا گیا اس کی رپورٹ حسبِ معمول سرکاری فائلوں میں دفن ہو گئی۔ سکندر صاحب کے بارے میں کہنے کو بہت کچھ ہے اور انھوں نے خود بھی اپنے ہاتھ سے اپنی قبر پر لکھنے کے لیے فانی کا یہ شعر دیا تھا۔

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ مری بے زبانی دیکھتے جاؤ

سکندر صاحب کے بارے میں اتنا اور کہنا چاہوں گا کہ اپنوں نے انھیں غیر سمجھا اور جن کے لیے اپنوں کو انھوں نے ناراض کیا انھوں نے بہت تکلیف پہنچائی۔ □□

Marfat.com

نواب شبّیر میاں (کبوتر باز)

تہذیب کی داستان بڑی دردناک ہے۔ وقت کے ساتھ اس کے کچھ نشانات ضرور باقی رہ جاتے ہیں لیکن وہ اتنے مندمل ہوتے ہیں کہ انھیں پہچاننا بھی مشکل ہوتا ہے۔ کسی انگریز مصنف کا یہ قول بڑا جاندار ہے کہ زوال آمادہ تہذیبیں بگڑتے بگڑتے مضحکہ خیز ہوجاتی ہیں۔ فصیل کا اندرونی شہر شاہجہاں آباد جو پرانی دلّی بھی کہلاتا ہے اب باہر والوں کے لیے مذاق کا موضوع بن گیا ہے۔ بڑی بڑی حویلیاں، گہدار مکان، ان کے پائیں باغ، شاگرد پیشہ سب ختم ہوکر کٹڑوں اور چھوٹی چھوٹی کابکوں میں تبدیل ہوچکے، گھنی آبادی کی وجہ سے ہر جگہ حشر کے میدان کی سی بھیڑ بھاڑ دکھائی دیتی ہے۔ ایک شور ہے کہ دیتی نہیں کچھ سنائی بات۔ اللہ اللہ ایک زمانہ وہ تھا کہ جامع مسجد کے اردگرد امرا، رؤسا اور ارکانِ سلطنت کی حویلیاں ہوا کرتی تھیں۔ مسجد کے جنوبی دروازے سے جو بازار شروع ہوتا ہے اس میں مدرسہ حسین بخش اور مولوی اسحاق کے مدرسے سے گزر کر مٹیا محل، عزیز آبادی بیگم کی حویلی، حویلی صدر الصدور، پھاٹک نواب دوجانہ، حویلی اعظم خاں، حویلی کلو خواص، مہابت خاں کی حویلی غرض یہ کہ تراہا بہرام خاں تک ان ہی حویلیوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ اب سے دور، غدر کے زمانے میں دلی والوں پر جو آفتیں نازل ہوئیں انھوں نے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی نہ دلّی رہی نہ دلّی والے۔ مکین بے چارے کچھ تو تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے جو بچ رہے وہ خدا جانے کہاں چلے گئے سارا شہر ویران ہوگیا اور شہر آبادی کی داستان سنانے کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ آج تک چلا آتا ہے۔ اب تو انھیں اللہ غریق رحمت کرے، سنانے والے بھی نہیں رہے۔ اللہ بخشے یوسف دہلوی، خواجہ حسن نظامی، ملا واحدی

Marfat.com

زندہ ہوتے تو مرحوم دلّی کا افسانہ سناتے میں کیا عرض کروں گا۔ نہ زبان میں طاقت نہ لب و لہجہ درست، حافظہ باطل اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں کچھ کہوں گا تو ایسا لگے گا جیسے طوطا اودوان پر چڑھتا ہے۔ ایسے میں بس خاموشی بہتر ہے جو کچھ کہہ دیا وہ کافی ہے، عقلمند انھیں اشاروں کی مدد سے تصور میں دلّی مرحوم کے جلوے دیکھ لیں گے اور جن کے ہئے کی پھوٹ گئیں ان سے ہمیں کچھ سروکار نہیں جو کچھ سامنے ہے وہ تو اندھے کو بھی دکھائی دیتا ہے۔ آنکھوں والا تو وہ ہے جو غائب کو پہچانے، ماضی اور مستقبل کا نظارہ کرے۔ لال قلعہ دلّی والوں کے لیے سورج کے سمان تھا وہ اجڑا تو دلّی اجڑ گئی۔ دلّی والے جن سے سیکھ لیتے تھے وہ نہ رہے تو دلّی کہاں رہے گی۔ سچ ہے ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

ایک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

عزیزو! دلّی والے بڑے بے وقوف ہوتے ہیں۔ دماغ کے بجائے دل کی پیروی کرتے ہیں اور دل تو آپ جانتے ہی ہیں کہ لاکھ کا گھر خاک کرتا ہے۔ اس نے نہ جانے کتنے گھر کھا لیے ہیں امیر کبیر کو فقیر بنایا ہے سو ایسا ہی ہم دلّی والوں کے ساتھ ہوا۔ ہم نے اپنے گریبان بھول کر دوسروں کے گریبان سیے ہیں۔ شہر میں آج کل جو کاروباری سلسلے قائم ہیں وہ سب ان فسادات کی برکت کا نتیجہ ہیں جو آزادی کے بعد پھوٹ پڑے تھے۔ قتل و غارت گری میں جب دلّی کے محلے بھائیں بھائیں کرنے لگے تو ان چند دلی والوں نے جو یہاں پڑے رہ گئے تھے گاؤں گنویں کے پناہ گزینوں کو پریڈ کے میدان میں لا لا کر اپنے گھروں میں بسایا اور رفتہ رفتہ وہ صورت ہوئی جو اونٹ کی وجہ سے عرب کے ساتھ ہوئی تھی۔ خیر جو کچھ ہوا وہ سر آنکھوں پر، چاہا اور قبول کیا۔ اللہ کی مرضی کے آگے کسی کی نہیں چلتی مگر اب دلی میں رہ کے جو لوگ دلی کو برا کہتے ہیں وہ ہمارے کلیجے پر چھریاں چلاتے ہیں۔ گھر ہمارے کابکیں بن گئے، گلی محلے سکڑ کر سرنگ ہو گئے، بازار منڈیوں میں تبدیل ہوئے۔ کھانے پینے کی چیزوں کی وہ افراط ہے کہ خدا کی پناہ، کہیں بریانی پک رہی ہے کہیں مرغ کے تکے، کہیں باقر خانی، کہیں حلیم اور دہی بڑے، مچھلی کے کباب اور لوگ سڑک کے کنارے کھڑے پیٹ کی ہوس بجھا رہے ہیں۔ گھر کے چولہے ٹھنڈے ہو گئے جو ہے بازار میں چک چک لونڈے اڑا رہا ہے۔ شرم، غیرت، ادب آداب، قاعدے قرینے

سب کا جنازہ نکل گیا۔ اور لطف یہ ہے کہ ماتم کے بجائے بربادیوں پر واہ واہ کی جا رہی ہے۔ خیر چھوڑیے ان باتوں کو آپ شبّیر میاں کبوتر باز کی کہانی سنیے۔

مٹیا محل میں مسجد کے سامنے جو ایک پتلی سی گلی ہے وہ گلی ایس ایس میاں کہلاتی ہے۔ شبیر میاں کے والد سید ذوالفقار علی نے اس گلی سے سارے مکان خرید کر اپنے خاندان کے افراد میں بانٹ دیے تھے۔ ذوالفقار کاغذی کی دلی شہر میں اور بھی بہت سی جائیدادیں تھیں۔ چاوڑی بازار میں جامعہ ہوٹل اور میر عاشق کے کوچے کے درمیان میں بنگال پیپر مل کی جو ایجنسی تھی وہ انہی ذوالفقار میاں کی تھی۔ آمدنی ماشاءاللہ زیادہ تھی اس لیے شبیر میاں کو کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ شغل کے طور پر کبوتر بازی کو وقت گزاری کا ذریعہ بنایا۔ لیجیے میں کبوتر بازی کی بھی وضاحت کروں۔ دلّی کے گھروں میں اونچی اونچی چھتوں سے جو ہو ہاہا دوپہر سے شام تک دیکھنے میں آتی ہے وہ برے وقت کی کبوتر بازی ہے۔ لدھڑ کبوتروں کو آج کل کے کبوتر باز ٹین پیٹ پیٹ کر اڑاتے ہیں یہ پرانے کبوتر بازوں کا شیوہ نہیں ہے۔ پہلے تو کبوتر بازی صرف دولتمندوں کا شوق تھا۔ کبوتروں کو جو مقویات کھلائے جاتے تھے وہ غریبوں کے بس کی بات نہیں۔ شبیر میاں کے پاس بارہ سو کبوتروں کی ٹکڑی تھی سب کے سب اصل نسل کابلی صاف شفاف آنکھوں والے اڑنے میں باز، بہری اور شکرے سے زیادہ تیز، آسمان کی طرف جاتے تو زمین پر اترنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ تین تین دن ہواؤں پر بسیرا کرتے۔ رات کو چاند سے ذرا نیچے دیکھیے تو ان کی پرچھائیاں دکھائی دیتی تھیں۔ نواب شبیر میاں کبوتروں کی نسلوں کے بارے میں عجیب وغریب معلومات رکھتے تھے۔ جب کوئی کبوتر خریدتے تو اس کے حسب نسب کو یوں بیان کرتے جیسے ہندوستان کے مسلمان اپنے خاندان کا شجرہ بیان کرتے ہیں۔ کسی کبوتر کا سلسلہ ایران اور ترکی سے جا ملتا تھا، کسی کا سمرقند، بخارا اور قزاقستان سے اور کسی کا مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ سے۔ خالص کابلی نسل کے تو ان کے پاس سینکڑوں کبوتر تھے۔ وہ چھتری اور ٹھاٹھر باندھ کر کبوتر اڑاتے نہیں تھے بلکہ کبوتروں کو آسمان کی جانب چھوڑ کر کئی کئی دن ان کے واپس لوٹنے کا انتظار کرتے تھے۔ دیکھ بھال کے لیے، کھلانے پلانے کے لیے، ہوا دینے کے لیے انھوں نے ملازم رکھ رکھے تھے۔ چھت پر چڑھ کر ہو ہا کرنا انھیں گوارا نہیں تھا۔

Marfat.com

گوارا بھی کیسے ہوتا اونچے خاندان کے سیدزادے تھے، میر عاشق کے کوچے میں حاجی علی جان والوں کا جو بڑا مکان ہے، وہ ان کی سسرال تھی۔ چھت پر چڑھ کے جو سفیلیاں بجاتے اور ٹھپکی لہراتے تو سارے خاندان میں تھوتھو ہوتی وہ تو بس شریفوں کی طرح کبوتروں سے پیار کرتے تھے اور کبھی کبھی دیوان خانے میں چنندہ کبوتر منگا کر انھیں اس طرح پرکھتے تھے جیسے جوہری ہیرے کو پرکھتا ہے۔ ہر مہینے دو تین بوریاں باجرے کی آتیں اور نوکر چاکر کبوتروں کو کھلایا کرتے تھے۔ شبیر میاں اپنے کبوتروں کے لیے طرح طرح کے مرکبات تیار کرتے رہتے جو اس لیے چگائے جاتے تھے کہ وہ اونچی سے اونچی اور لمبی سے لمبی اڑان بھریں۔ مشک، عنبر، زعفران، مروارید ناسفتہ، پشپ کی تختیاں، زرمہرہ اور نہ جانے کیا کیا کھرل میں گھسا جاتا اور ان سب کی گولیاں بنا کر کبوتروں کو کھلائی جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ دواالمسک جواہر والی، خمیرہ آبریشم حکیم ارشد والا، جواہر مہرہ، مفرح شیخ الرئیس، حب جدوار، معجون مروح الارواح، فلک سیر اور اسی قسم کی دوسری محرک دواؤں کا اچھا خاصا ذخیرہ ان کے پاس موجود رہتا تھا۔ خدا نے جو دولت انھیں دی تھی اس کا بڑا حصہ وہ معصوم کبوتروں پر خرچ کرتے تھے۔

نواب شبیر میاں کو کبوتر بازی کے علاوہ بزم آرائی کا بھی شوق تھا۔ ان کے دیوان خانے میں مشہور موسیقار، شاعر، مترنم آواز والے نوجوان، بذلہ سنج فطرت اور وضع داروں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ شبیر میاں ان کی مدارات اپنے ہاتھ سے پکائے ہوئے کھانوں سے کرتے تھے۔ اللہ نے انھیں ذائقہ پہچاننے والی زبان دی تھی۔ اسی زبان کی بدولت ایسا کھانا پکاتے تھے کہ شاہی زمانے کے مطبخ کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ مرچ مسالے کثرت سے استعمال کرتے تھے۔ بکرے کی بوٹی بوٹی اور رگ رگ سے واقف تھے۔ کوفتوں میں قیمہ پردوں کا ہونا چاہیے یا چوٹیوں کا، ساگ کے ساتھ کس حصے کا قیمہ بنوایا جائے، قورمہ کا گوشت کیسا ہو، بریانی کے لیے چاپیں اچھی رہیں گی یا پٹ کا گوشت، بکرے میں کون سا غدود کہاں ہوتا ہے کس کے کیا فائدے ہیں اور کیا نقصان۔ غرض یہ کہ پوری اناٹومی سے واقفیت حاصل کی تھی۔ تیز آنچ پر کھانا پکانے کے قائل نہیں تھے دھیمی آنچ پہ ایسا کیمیا تیار کرتے کہ کھانے والے بے ساختہ داد دیتے تھے۔ گاجر کا حلوہ، ہلدی کا حلوہ، ادرک کا حلوہ، گھیکوار کا حلوہ،

Marfat.com

حبشی حلوہ، حلوہ سوہن، سب اپنے دستِ مبارک سے تیار کرتے اور مہمان بلا بلا کر کھلاتے تھے۔ خود تو ذرا ذرا سا چکھ لیتے تھے ورنہ داد کے ڈونگروں سے ہی ان کا پیٹ بھر جاتا تھا۔ وہ کہتے تھے کھانا مقدار میں کم اور غذائیت میں بھرپور ہونا چاہیے۔ پیٹ کو بوری کی طرح بھرنا تو جانوروں کا کام ہے۔ آدمی کی خوراک ہلکی اور مقوی ہونی چاہیے۔ واقعی وہ جو کچھ پکاتے اس کے چند لقموں میں وہ سیری نصیب ہوتی تھی جو سیروں کھا کر بھی نہیں ہوسکتی۔ ذائقہ ایسا کہ قیامت تک زبان کی نوک پہ رکھا رہے۔

شبیر میاں الہ آمین کی اولاد تھے۔ ان کی والدہ کے پیٹ سے کئی لڑکے پیدا ہوئے مگر زندہ صرف یہی رہے۔ ماشاءاللہ بہنیں چھ تھیں بھائی صرف ایک اس لیے سب کی آنکھ کے تارے بنے ہوئے تھے۔ نذر گزر کی غرض سے لباس میں پیلا کرتا اور سفید لٹھے کا پاجامہ بچپن سے بڑھاپے تک پہنا۔ کرتا عام طور پر بوسکی کا ہوتا تھا۔ جاڑے میں شیروانی بھی زیب تن کیا کرتے تھے مگر بے نیازانہ اس کے بٹن ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ شبیر میاں آزاد طبیعت کے مالک تھے لباس کی بندش سے گھبراتے ہوں گے اس لیے زیادہ چست لباس پسند نہیں کرتے تھے۔ کبوتروں کے علاوہ دوسرے پرندے بھی نزدیک دور سے خرید کر لاتے اور ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ ان کے پاس ہمیشہ آدمی کی طرح بولتی ہوئی بنگال کی مینا رہی۔ دروازے میں پنجرہ لٹکا رہتا اور وہ خواجہ سرا کی طرح آنے جانے والوں کا پیغام گھر کے اندر دیا کرتی تھی۔ ان کے والد کو پکارتی تو کہتی ''بڑے صاحب کوئی آیا ہے''۔ گھر کے نوکر چاکر کوئی بے جا حرکت کرتے تو کہتی تھی ''آقا دیکھو زرینہ کام نہیں کرتی''، ان پرندوں کے لیے وہ ہندوستان کے کونے کونے میں سفر کرتے اور ہزاروں روپے دے کر خرید لاتے تھے۔ پیسہ کی انھیں کوئی فکر تو تھی نہیں باپ نے جی بھر کے کمایا تھا اور جب وہ اسے بے دردی سے اڑاتے تو باپ کی پیشانی پر بل بھی نہیں آتا تھا۔ لاڈلے بیٹے تھے سب کچھ انھیں کے لیے تھا البتہ ایک مرتبہ کسی بزرگ نے سمجھایا کہ میاں باپ کا پیسہ ابھی کیوں اڑاتے ہو۔ انھیں تکلیف ہوتی ہوگی کل جب وہ نہیں رہیں گے تو خرچ کرنا۔ شبیر میاں نے بزرگ کی جانب غور سے دیکھ کر فرمایا ''حضرت آپ نے یہ بال دھوپ میں سفید کیے ہیں کیا؟ خرچ کرنے کا مزا تو جوانی میں آتا ہے۔ بڑھاپے میں تو میں خود بھی والد صاحب کی طرح

Marfat.com

کفایت شعار ہو جاؤں گا''۔ شبیر میاں خرچیلے تو تھے ہی مخیّر بھی تھے۔ جائیدادوں کا کرایہ لینے جاتے اور دیکھتے کہ کسی کے گھر میں ناہوتی کا ماحول ہے تو کرایہ لینے کے بجائے آٹا دال پہنچا کر آتے اور کچھ نقد بھی دے آتے تھے۔ وضعدار لوگ اپنی نیکیوں کا آج کل والوں کی طرح ڈھنڈورا نہیں پیٹا کرتے سو شبیر میاں نے جو بھلے کام کیے وہ ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھے یا ان کے دوستوں کی زبانی سنے ورنہ خاندان کے سب ہی لوگ انھیں نکما نواب، فضول خرچ آوارہ مزاج اور سر پھرا سمجھتے تھے۔ ان کے پاس بیٹھنے والوں نے البتہ ان کے مرنے پر جس غم واندوہ کا اظہار کیا اس سے ضرور پتہ چلتا تھا کہ کسی دردمند، اللہ والے، یاروں کے یار، غریبوں کے ہمدرد، اور روایت درست باوضع آدمی کا انتقال ہوا ہے۔ مٹیا محل اور اس کے آس پاس رہنے والے آج تک انھیں یاد کرتے ہیں اور ان کی صفات محمودہ کا ذکر محفلوں میں بیان کرتے ہیں۔

نواب شبیر میاں نے دلّی کے نامی گرامی بزرگوں کی صحبت اٹھائی تھی۔ وہ پیر فقیر اللہ والوں کے پاس بھی بیٹھے تھے اور ان لوگوں میں بھی جو پھکّڑ اور بے لگام کہلاتے ہیں۔ انھوں نے سب سے اچھی اچھی باتوں کا درس لیا تھا۔ کوئی سوال کیجیے تو بڑا معقول جواب دیتے تھے۔ بیگم صاحبہ سے ان کی زیادہ نہیں بنتی تھی اس لیے دیوان خانے میں سکونت اختیار کی تھی۔ ایک روز میں نے اسی کے بارے میں ذرا چبھتا ہوا سوال کر لیا۔ کہا'' آقا یہ تو بتائیے کہ جو عورت اپنے شوہر سے نہیں دبتی اسے بھی کوئی دبا سکتا ہے یا نہیں''۔ کہنے لگے ''ہاں دبا سکتا ہے''۔ اتنا کہا تو میرا اشتیاق بڑھا کیوں کہ میرے نزدیک ایسی عورت سب کے لیے وبال جان ہوتی ہے اور اسے سمجھانا کسی کے بس کی بات نہیں۔ آقا نے دو چار لمحے کی خاموشی کے بعد فرمایا'' میاں اسے گورکن دباتے ہیں''۔ جملہ میرے ذہن پر نقش ہو گیا۔ کتنی بڑی داستان پر کتنا مختصر اور جامع تبصرہ ہے۔ گھر میں راج مزدور بڑھئی یا کوئی اور کاریگر آتا تو اسے کام کے بارے میں اس طرح سمجھاتے تھے جیسے ہر کام کی رکان جانتے ہوں۔ مکان کی تعمیر میں کچھ ردوبدل کرانا چاہتے تھے۔ مستری آیا تو پہلے اسے خوب اچھی طرح اپنا پلان سمجھا دیا پھر بولے بھائی بتاؤ تمھیں کچھ نظر آتا ہے وہ بولا حضور بنے گا تو نظر آئے گا ابھی تو کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ نواب صاحب نے یہ کہہ کر اسے واپس کر دیا کہ بھائی

جسے تجویز دکھائی نہیں دیتی وہ تجویز پر عمل کیسے کرسکتا ہے۔ ان کی نظر میں ماضی، حال، مستقبل سب کچھ رہتا تھا۔ مجلسی زندگی نے انھیں دوربین اور دوراندیش بنا دیا تھا۔ تعلیم تو ان کی غالباً زیادہ نہیں تھی مگر تربیت ایسی تھی کہ اڑتی چڑیا کے پر گنتے تھے۔ پرندوں کے شوق نے ذہن کی اڑان بھی بلند کر دی تھی۔ دلی میں ہر شخص طبیعت کی موزونی لے کر پیدا ہوتا ہے سو وہ بھی موزوں طبیعت تھے۔ گھریلو محفل میں کبھی کبھی اپنے تخلیق کردہ اشعار سناتے تو ان کے پروازِ خیال کا اندازہ ہوتا تھا اور زبان، بیان، شعر اور نثر کی پرکھ کا تو یہ عالم تھا کہ ایک ایک فقرے ایک ایک صفت اور ایک ایک محاورے پر سر دھنتے تھے۔

مٹیا محل میں ان کا مکان بڑا سنگیں بڑا شاندار اور بڑا کشادہ تھا۔ ان کے والد نے ایک ہندو رئیس سے خریدا تھا اس رئیس نے اسے عیش محل کے طور پر بنایا تھا۔ ولایتی گارڈر اور ٹائل لگے ہوئے تھے۔ دیکھنے میں ایسا لگتا تھا کہ قیامت تک کھڑا رہے گا مگر ایک دن یکایک بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔ بیوی اور پوتا دب کر مرے۔ کبوتر رواں دواں پھرتے رہے۔ شبیر میاں کا ایسا دل ٹوٹا کہ گھر چھوڑ کر کبوتر بازار کے پاس سیلم پور ویلکم میں جا بسے۔ کچھ عرصے بعد ان کی بہن سمجھا بجھا کر انھیں گلی قاسم جان اپنے مکان میں لے آئیں مگر ان کا صدمہ کم نہیں ہوا اور آخر کچھ ہی دن بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ان کے ساتھ دلی سے کبوتر بازی کی وہ روایت جو علاء الدین خلجی کے زمانے سے چلی آتی تھی وہ بھی ختم ہوئی۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

□□

Marfat.com

بیگم حمیدہ سلطان: دہلی کی تہذیب کا آخری نمونہ

حمیدہ سلطان احمد دہلی کے ایک اعلیٰ خاندان کی فرد تھیں، جس خاندان کا ہر فرد، یہ کہیے کہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھا اور آپ کی ذات خود ایک ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ آپ نواب زین العابدین خاں عارف کی چوتھی پشت میں تھیں اور عارف خود الٰہی بخش خاں معروف کے نواسے اور غالبؔ و بیگم غالبؔ کے منہ بولے بیٹے تھے۔ نواب عارف کے دونوں بیٹے باقر علی خاں کاملؔ اور حسین علی خاں، غالبؔ اور بیگم غالبؔ ہی کے سایۂ عاطفت میں پلے بڑھے تھے اور ان کی ادبی نشو و نما ہوئی تھی۔ آپ کی نانی، معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کی دختر نیک اختر تھیں، اور غالب کی زندگی میں ان کے گھر باقر علی خاں کے دلہن بن کر آئی تھیں۔ یہ ان کے لیے بڑا اعزاز اور باقر علی خاں کاملؔ کے لیے فخر و ناز کی بات تھی کہ وہ اس عالی مرتبت امیر کے داماد اور اس نسبت سے جو ایک سے زیادہ رشتوں کے ساتھ انھیں حاصل تھی۔ حمیدہ سلطان، دہلی کے ایک مشہور محلے گلی قاسم جان کی اس حویلی میں ۱۷/ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئی تھیں جو نواب مرزا ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کی ملکیت تھی۔ نیر رخشاں، نواب احمد بخش والیٔ فیروز پور جھرکہ و لوہارو کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔

آزادی کے بعد جن لوگوں نے اردو زبان کے تحفظ کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردیا، ان میں حمیدہ سلطان جنھیں لوگ پیار سے حمیدہ آپا کہتے تھے کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ آپا نے صرف زبان کے تحفظ ہی کے لیے جدو جہد نہیں کی بلکہ اردو زبان و ادب دونوں کی ترقی و فروغ کے لیے بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ پچھلے پچاس سال

Marfat.com

کی دہلی کی ادبی تاریخ لکھتے ہوئے مورخ آپا کی بے لوث خدمات کو فراموش نہیں کر سکتا۔ آپا پچھلے پچاس سال سے (انجمن ترقی اردو، دہلی شاخ) کی سکریٹری تھیں۔ انھوں نے کوشش کر کے انجمن کے لیے علی منزل نام کی ایک عمارت حاصل کی۔ علی منزل کا باقاعدہ ایک ٹرسٹ ہے جو اس عمارت کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ آپا اس عمارت کے ایک حصے میں رہتی تھیں۔ پچھلی پانچ دہائیوں کے دوران علی منزل کی غیر معمولی اہمیت رہی ہے۔ اردو کا کون سا مشہور، ممتاز اور صفِ اول کا ادیب اور شاعر ایسا ہے جو دہلی میں رہتا ہو یا دہلی آیا ہو اور انجمن ترقی اردو (دہلی) کے زیر اہتمام پابندی سے منعقد ہونے والی ادبی محفلوں میں شریک نہ ہوا ہو۔ روشؔ صدیقی، پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ، جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ گورکھپوری، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، جسٹس آنند نرائن ملا، مجازؔ لکھنوی، پنڈت آنند موہن گلزار زتشی دہلوی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ، بہار برنی، ساغرؔ نظامی، ذکیہ ساغر، عزیز وارثی، بیگم ممتاز میرزا، اسلم پرویز، بسمل سعیدی، گوپال متل، مخمور سعیدی، رفعت سروش وغیرہ علی منزل کی ادبی محفلوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔

محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ ایک قابلِ عزت ادیبہ تھیں، وہ متعدد علمی و ادبی تصانیف کی مالک تھیں۔ انھوں نے ادب کی مختلف شاخوں میں یادگار تصانیف چھوڑی ہیں۔ خاندانِ لوہارو کے شعرا پر ان کی مشہور کتاب ہے جو غالب انسٹی ٹیوٹ سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔ اس میں لوہارو خاندان کے ۲۱ شاعروں کا مختصر حال درج ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں بڑا مستند مواد حاصل تھا، اس بنا پر یہ کتاب نہایت معتبر ہے۔ اس کتاب میں بعض ایسی معلومات ہیں جو کہیں اور مشکل ہی سے مل سکتی ہیں۔ آپ دہلی کی ان نادرِ روزگار ہستیوں میں شمار ہوتی تھیں جنھوں نے یہاں کی تہذیب و تمدن اور اردو زبان و ادب پر ناقابلِ فراموش نقش مرتسم کیے ہیں۔ غالب شناسی میں ان کا کارنامہ زرّیں الفاظ میں لکھنے کے لائق ہے کہ انھوں نے غالب کی یومِ وفات پر مزار پر پھول چڑھانے اور فاتحہ پڑھنے کی رسم کا آغاز کیا۔ یہ تقریب اب ہر سال ہوتی ہے اور امید ہے کہ صدیوں تک جاری رہے گی۔ اس سلسلے میں حمیدہ آپا کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انھوں نے اردو ادب میں بہت کم لکھا ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے خاصہ کی چیز ہے۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے اور ناول

Marfat.com

بھی۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ناول نویسی سے ہوا۔ ''ثروت آرا'' ان کا پہلا ناول تھا جو ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا اور اس زمانے میں خاصہ مقبول ہوا۔ ''رنگ محل'' ۱۹۶۰ء میں ان کا دوسرا ناول شائع ہوا تھا۔ اس پر سہیل عظیم آبادی نے ایک مفصل پیش لفظ لکھا تھا، جس میں اس ناول کی زبان کی خاص طور پر تعریف کی تھی اور لکھا تھا:

''... 'رنگ محل' ایک دلکش تصویر ہے ان رنگارنگ اقدار کی، اس تہذیب کی جواب کبھی واپس نہیں آئے گی''۔

ان کا آخری ناول جو زیورِ طبع سے آراستہ ہوا وہ ''بہار و خزاں'' ہے جو کئی سال پہلے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ وہ تنقید و تحقیق کی وادی سے بھی واقف تھیں۔ حمیدہ سلطان صاحبہ کا آخری مضمون جو میری نظر سے گزرا وہ ''آ کا بھائی'' ہے جو انھوں نے فخر الدین علی احمد مرحوم پر لکھا تھا اور یادگار نامۂ فخر الدین علی احمد میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے متعدد علمی و ادبی مضامین اور افسانے اردو کے مختلف رسالوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مدتوں وہ ''صبح'' نام کا ایک رسالہ بھی نکالتی رہیں۔

آپ کی ادبی خدمات کا درخشاں دور نصف صدی سے زیادہ عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس اثنا میں آپ نے اردو فکشن کو کچھ ایسے ادب پارے دیے جو آپ کے نام کی نسبت سے ایک عطیۂ حمیدہ بھی کہے جاسکتے ہیں۔

آپ کے افسانوں کا مجموعہ ''نیلجر'' بھی ہے، جو اس تہذیب اور ذہنی طریقہ رسائی اور فکر و فن کے دائرے میں ان ادبی فتوحات کا ایک آئینہ ہے جس میں آپ کا مطالعہ، مشاہدہ اور فکر کی جھلک اس طرح آتی ہے کہ اب اس کی سیر دہلی کی تہذیب و تاریخ کے اس دور کا منظر نامہ بن جاتی ہے جسے آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ادبی شعور کے ساتھ پرکھا۔ حمیدہ آپا جوانی ہی سے ایک بلند آواز کی مالک رہی ہیں۔ انھوں نے کسی بات کو بھی لاگ لپیٹ کے ساتھ نہیں کہا اور ہمیشہ صاف گوئی سے کام لیا۔ شاید اسی وجہ سے کچھ لوگ ان سے ناراض بھی رہتے تھے لیکن انھوں نے دل میں کبھی رنجش نہیں رکھی اور بہت جلد ہی ایسی باتوں کو بھول بھی جاتی تھیں۔ وہ نیک دل اور ملنسار خاتون تھیں اور سب کے دکھ سکھ میں شریک ہوتی تھیں۔ اس لیے وہ سب کے ساتھ بغیر کوئی عہدہ لیے وابستہ رہی ہیں۔

Marfat.com

غالب انسٹی ٹیوٹ میں غالب میوزیم کو شروع کرنے میں انھوں نے بھرپور مدد کی۔ غالب اور غالب کے دور کی کئی چیزوں کو اکٹھا کیا اور میوزیم کو سونپا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کی جتنی بھی ادبی محفلیں ہوتی تھیں ان میں خاص کر شریک ہوتی رہی ہیں۔ حمیدہ آپا کی یادداشت قابلِ تعریف تھی۔ غالب کے بارے میں انھوں نے جو باتیں اپنے بزرگوں سے آج سے ساٹھ ستر سال پہلے سنیں انھیں پشتوں کے لیے قلم بند بھی کیا۔ انھیں ان کی ادبی خدمات کے لیے دہلی اور اتر پردیش اردو اکادمی کی طرف سے انعامات بھی ملے لیکن انھوں نے انھیں یہ کہہ کر لینے سے منع کر دیا کہ جب تک اردو کو اس کا اپنا مقام نہیں ملتا وہ سرکاری اعزاز نہیں لیں گی۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بھی انھوں نے اپنی ادبی دلچسپی میں کوئی کمی نہیں آنے دی اور گاہ بگاہ وہ اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے ایسے بھی ملنے والوں سے بات کرتی تھیں اسی خدمات کے لیے ان کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ حمیدہ آپا کو غالب انسٹی ٹیوٹ سے بڑا قلبی لگاؤ تھا، جس کی دو وجوہ تھیں پہلی یہ کہ غالب انسٹی ٹیوٹ ان کے محترم برادر سابق صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد کی قابلِ ذکر یادگار ہے۔ دوم غالب ان کے محبوب شاعر تھے اور اس ادارے میں غالب پر کام ہو رہا ہے۔ وہ جب تک زندہ رہیں ادارے کی مختلف کمیٹیوں سے وابستہ رہیں۔ ادارے کی ترقی سے خوش ہوتیں۔ حمیدہ آپا کی شخصیت میں یقیناً ایک طرح کی سلطانی تھی۔ ان سے پہلی ملاقات میں ہر شخص مرعوب ہو جاتا تھا۔ چنانچہ اس کا ثبوت ایک غیر ملکی سیاح William Dalryple کی مقبول عام تصنیف Delhi: The City of Djinns جو اس نے ۱۹۹۳ء میں لکھی تھی اس نے حمیدہ آپا کے بارے میں اپنے تاثرات کو جن الفاظ میں قلم بند کیا ہے اس کا اردو ترجمہ پیشِ خدمت ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں:

> ''اکتوبر میں ایک دن میں اور اولیویا (جو اس کی بیوی تھی) اتفاقاً علی منزل جا پہنچے جو بیگم حمیدہ سلطان کا دولت کدہ تھا۔ یہ دہلی کی آخری حویلیوں میں سب سے اعلیٰ درجہ کی ہے جو اب تک پرانے انداز میں آباد ہے۔ بیگم حمیدہ سلطان اپنی سب سے چھوٹی بہن کے ساتھ بیٹھی تھیں جو

Marfat.com

خاموش تھیں۔ سامنے ساگوان کی ایک بڑی سی میز بچھی تھی۔ وہ موٹا سا سوتی پاجامہ پہنے تھیں۔ لیکن تن کر بیٹھی تھیں گویا ان کی رگوں میں مغلیہ خون کی باغیانہ رعونت کی رمق ابھی تک باقی تھی۔ ان کا رنگ گورا تھا اور چہرہ دلکش اور رئیسانہ جو کبھی یقیناً بہت حسین رہا ہوگا۔ پر اب اس پر غصہ کے پیچ و تاب کی شکنیں نمایاں تھیں۔ زمین پر کوڑے کرکٹ اور گرد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا، ہمارے ہاں کوئی ملازم نہیں۔ پچھلا ملازم دو سال ہوئے مر گیا۔ انھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، میں اور میری بہن گھوڑے والی شکرم میں کوئین میری اسکول(Qveen Mary's School) جایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں ہمارا گھر ادیبوں، گویوں، سیاست دانوں اور شاعروں سے بھرا رہتا تھا۔ آنے جانے والوں کو بیرونی صحن میں داخلہ کے لیے بھی پہلے سے وقت لینا پڑتا تھا۔ ہمارے یہاں کم سے کم پچاس ملنے والے روز آیا کرتے تھے اور اب، یہ کہتے کہتے ان کی آواز مدھم ہوتی گئی، اس تقسیم نے ہماری دہلی اور ہماری اردو کو تباہ و برباد کر دیا۔

میں نے پوچھا، کیا آپ کو تقسیم اب یاد ہے۔ انھوں نے جواب دیا ہم شیلانگ میں تھے جب واپس آئے تو دیکھا کہ ہمارا مکان بری طرح لوٹ لیا گیا تھا۔ باورچی بھاگ گیا، مالی مارا گیا، ہمارے عزیزوں میں صرف لوہارو خاندان اور نواب پٹودی بچے تھے باقی سب پاکستان بھاگ گئے۔" انھوں نے سر ہلایا اور کہنے لگیں مجھے دہلی سے محبت تھی لیکن اب دہلی مردہ شہر ہے۔

میں نے سوال کیا اس سے کیا مراد ہے آپ کی؟

انھوں نے جواب دیا" دہلی کے قدیم باشندے اب خال خال باقی ہیں۔ پردیسیوں نے شہر سنبھال لیا ہے۔ حتیٰ کہ اب ہماری زبان بھی مردہ ہے"۔

میں نے کہا" لیکن دہلی میں بہت سے لوگ آج بھی اردو بولتے ہیں"۔

انھوں نے کہا: '' اردو ایک مہذب زبان ہے کرخنداروں کی زبان نہیں ہے۔ اب جو باقی رہ گئے ہیں وہ کرخندار (دستکار اور کاریگر) ہیں اور کرخنداری بولی بولتے ہیں۔ شاعروں کی زبان اردو تو مردہ ہے''۔ ایک مریل سی بلی جو بیگم صاحبہ کے پیروں میں لیٹی بھوک سے میاؤں میاؤں کررہی تھی کود کر میز پر چڑھ گئی اور ناز و انداز سے ان کی انگلیوں کی ابھری ہڈیوں سے اپنا جسم سہلانے لگی۔ بیگم صاحبہ اسے پرے پٹخ کر بولیں ''تقسیم دہلی کے لیے ایک بڑا حادثہ تھا، جو رہ گئے وہ میری حالت میں ہیں اور جو بری حالت میں ہیں۔ دہلی کا امن وامان گیا۔ اب سب کچھ گیا۔

اولیویا (جو اُن کی بیوی تھی) نے پوچھا '' کیا ہم پھر آسکتے ہیں اور آپ سے مل سکتے ہیں اور کیا آپ کوئی دہلی سے کسی چیز کے منگانے کی ضرورت ہے۔ بیگم صاحبہ نے تمکنت سے جواب دیا: 'ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے'۔ وہ رکیں اور پھر بھرائی آواز میں سرگوشی کے لہجہ میں کہا '' میں بس یہ چاہتی ہوں کہ لوگ مجھے بھول جائیں''۔

اس انٹرویو سے اندازہ ہوگا کہ حمیدہ آپا کو ملک کی تقسیم، دلی کی تباہی اور اردو کی بربادی کا غم شدید تھا۔ ملک کی تقسیم کی وجہ سے اردو زبان کے نام اور ناموس پر جو قہر پڑا وہ اس کی بدنصیبی کا تاریک ترین باب تھا۔ اس دور میں دہلی کی لسانی زندگی اور روایت پر بھی بھاری اثر پڑا۔ اس کی روک تھام اور بچاؤ کے لیے دہلی کے جو چند باہمت اشخاص آگے آئے ان میں حمیدہ آپا پیش پیش تھیں۔ آپ جب تک زندہ رہیں اردو زبان کو بڑی دلسوزی اور رقت سے اجاگر کیا اور اس کام کے لیے قلم اور قدم دونوں سے پُر اثر کام کیا۔ آخر میں یہ کہہ کر اپنی بات ختم کروں گا کہ حمیدہ آپا جب تک زندہ رہیں اردو کے لیے بے حد مخلص رہیں۔ انھوں نے دلّی کی انجمن ترقی اردو کو ہمیشہ سرگرم رکھا اور دلی میں اردو کو اس کا حق دلانے کے سلسلے میں بھی وہ اپنے سماجی اور ادبی قدوقامت کا اثر ڈالتی رہیں اور لالہ شام ناتھ، گوپی چند امن، مرزا محمود بیگ، میر مشتاق، منشی عبدالقدیر، مہیشور دیال وغیرہ کو اردو کے لیے کچھ کرنے کے لیے آمادہ کرتی رہیں۔ □□

ڈاکٹر شریف احمد

مغیث الدین فریدی

مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی

اردو کے صاحبِ اسلوب نثر نگار قاضی عبدالغفار نے اپنی مختصر لیکن معرکے کی کتاب ''آثارِ ابوالکلام آزادؔ'' میں شکوہ کیا ہے کہ قارئین اکثر کسی ادبی فنکار کو، اس کی پیدائش اور انتقال کے درمیان ہونے والے واقعات و سانحات میں تلاش کرتے ہیں۔ جب کہ فنکار کی اصل شخصیت اس کی شاعری، تحریر، عمل اور ردِ عمل، پسند اور ناپسند، خواب اور شکستِ خواب اور امید و ناامیدی میں چھپی ہوتی ہے۔ زیرِ نظر صفحات میں قاضی مرحوم کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے، صاحبِ خاکہ کی شخصیت کے موٹے خطوط پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم سکریٹری اردو اکادمی کے امتثالِ امر پر، صاحبِ خاکہ کی خارجی شخصیت سے متعلق اہم امور بھی پیش کر دیے گئے ہیں۔ پہلے یہی سہی:

نام	:	مغیث الدین فریدی
والد کا نام	:	عظیم الدین فریدی
تاریخِ پیدائش	:	یکم جنوری ۱۹۲۶ء
مقامِ پیدائش	:	فتح پور سیکری (آگرہ)
تعلیم	:	بی۔اے (آگرہ)، ایم۔اے (علی گڑھ) پی ایچ ڈی (دہلی یونیورسٹی) ۱۹۷۵ء
ملازمت	:	سینٹ جانس کالج (آگرہ) استاد اردو، فارسی دہلی یونیورسٹی۔ استاد شعبۂ اردو ۱۹۶۲۔۱۹۹۱ء

Marfat.com

فریدی صاحب کے ایک شاگرد ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اپنی کتاب ''مغیث الدین فریدی اور قطعاتِ تاریخ'' (مطبوعہ ۲۰۰۴ - ۲۰۰۲ء) کے صفحات ۱۹ - ۱۸ - ۱۷ پر ان کانفرنسوں کا بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ جن میں فریدی صاحب نے وقتاً فوقتاً شرکت کی، اور ان علمی اور ادبی اداروں اور تنظیموں کا ذکر بھی کیا ہے جن سے ان کا تعلق رہا اور ان اعزازات کو بھی درج کیا ہے، جو انھوں نے حاصل کیے۔

اور یہ بات ہم میں سے بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ فریدی صاحب ۱۵/ جولائی ۲۰۰۱ء میں، کانپور میں، سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔

مغیث الدین فریدی جیسے کہ ۲۰۰۱ء میں نظر آتے تھے ۱۹۶۱ء میں ایسے بالکل نہ تھے۔ اب ان کے سر پر بال کم تھے اور جو تھے وہ برف کے گالے جیسے۔ سفیدی کا کچھ ایسا غلبہ شروع ہو گیا تھا کہ بھنویں بھی سفید ہو گئی تھیں اور پلکیں بھی۔ آواز نحیف اور جسم نحیف کے ساتھ نزار بھی۔ لیکن وقت کا لٹیرا ان سے ابھی دو چیزیں نہیں چھین سکا تھا: چمکیلی اور بولتی ہوئی آنکھیں اور شاداب چہرہ۔ چالیس سال پہلے، اکتوبر کے مہینے کی درمیانی تاریخوں میں میں نے انھیں اپنے بہت قریب بیٹھے ہوئے پایا۔ دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے دفتر سے ملے ہوئے ایک کمرے میں ''لیلائے روزگار'' کے مشتاقوں کے گروہ میں۔ من جملہ متعدد قسمت آزماؤں کے، ایک قسمت آزما فریدی صاحب اور ایک یہ خاکسار۔ مجھے یاد ہے کہ ہم لوگوں میں طے ہوا کہ انٹرویو کے بعد کافی ہاؤس میں کافی پی جائے گی۔ چنانچہ کچھ ہی دیر بعد ہم لوگ کافی ہاؤس میں تھے۔ میں نے دیکھا، میرے سامنے جو شخص بیٹھا ہے، مغیث الدین فریدی ہے۔ قد اوسط سے کچھ زیادہ، گھنے سیاہ بال، روشن آنکھیں، متبسم چہرہ، جسم پر پھبتی ہوئی شیروانی، بے تکلف، کھلا ڈلا انداز، باتیں، باتیں اور باتیں۔ ''بھئی! عجیب اتفاق ہے۔ آپ کشمیر یونیورسٹی میں لکچرر، میں سینٹ جونس کالج میں۔ آپ اس لیے دہلی آنے کے خواہش مند کہ ناسٹالجیا کا شکار ہیں اور میں دہلی آنے کا اس لیے متمنی اور اس خدشے میں مبتلا کہ کہیں چند سال میں، بی۔ اے کلاسوں میں اردو کے طالب علم ہی آنے بند نہ ہو جائیں''۔ فریدی صاحب کہے جا رہے تھے۔ ''اچھا صاحب!

Marfat.com

تقرر کسی کا بھی ہو۔ ایک بات طے ہے کہ ہم لوگوں کو ایک دوسرے سے رابطہ قائم رکھنا ہے۔ میں کشمیر آؤں گا۔ آپ آگرے آیئے"۔ فریدی صاحب ان تھک بولتے رہے۔ اردو کی زبوں حالی پر، جامعہ اردو علی گڑھ پر (اس لیے کہ اس ادارے سے ان کا پرانا تعلق تھا)، مسلمانوں کی زیردستی اور غیر مسلم متعصب جماعتوں کی زبردستی پر، فیض کی شاعری پر، کرشن چندر کی فکشن پر اور اس وقت کی اچھی فلموں پر۔ ایک سے زیادہ بار کافی منگائی گئی۔ میں بہت کم بول سکا، وہ بھی Mono Syllables میں۔ ہم لوگ اٹھے، تو فریدی صاحب نے باجبر بل کی ادائیگی کی۔ اور میں نے پرانی دہلی میں اپنے عزیز کے یہاں پہنچ کر سوچا: دہلی آنے کا حاصل یہ تو ہوا کہ اس شخص سے ملاقات ہوگئی، جسے فریدی کہتے ہیں۔ اس کی شخصیت میں کوئی بات ہے۔ شیروانی اس کے لیے ہی بنی ہے۔ بہت اچھا Table-Talker ہے۔ اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو ہے۔ یہ شخص مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ اردو کلاسیکی شاعری کا کیسا رچاؤ ہے اس کے یہاں۔ اس کی اردو کیسی صاف، ستھری، پر اثر، اصل و نسل کی کھری، بولی ٹھولی میں گندھی ہوئی۔ شعر کیسے کھپاتا ہے۔ مصرعے کیسے جڑتا ہے، بالکل فطری، قدرتی انداز میں۔ اے اللہ! اس کا تقرر کردے۔

بابِ قبول کھلا ہوا تھا۔ دعا مستجاب ہوئی، لیکن کس طرح؟ پندرہ بیس دن بعد سری نگر میں مجھے دہلی یونیورسٹی کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ تقرر میرا ہوا ہے۔

میں دلّی چلا آیا۔ اور پڑھنے پڑھانے میں مصروف ہوگیا۔ لیکن فریدی صاحب کا خیال دل سے نہ گیا۔ کبھی کبھی یہ بات دھیان میں چڑھتی، جسے مومن خاں نے ان دو مصرعوں میں بند کر دیا ہے:

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

لیکن قضا و قدر کے معاملات اس سے بہت زیادہ نرالے اور پُر پیچ ہیں، جتنے اور جیسے وہ انسانی عقل کو معلوم ہوتے ہیں۔ سال کا ایک چکر ابھی پورا نہ ہونے پایا تھا کہ شعبے میں ایک عارضی جگہ مشتہر ہوئی اور فریدی صاحب شبینہ کلاسوں میں تشریف لے آئے۔ اور یوں، میرا اور ان کا ساتھ کوئی چھ سال اوپر ایک پیڑھی رہا۔ میں نے انھیں دور سے بھی

Marfat.com

دیکھا، اتنی دور سے جہاں سے انسان محض گوشت اور پوست کا ایک ہیولیٰ معلوم ہوتا ہے، اور اتنے قریب سے بھی، جہاں آنکھ کی پتلی پھیل کر Magnigying Glass بن جاتی ہے اور چیزیں غیر متناسب نظر آنے لگتی ہیں۔ لیکن مجھے اطمینان ہے کہ میں نے بالعموم نظر اور منظور دونوں کو نارمل رکھنے کی کوشش کی ہے۔

فریدی صاحب دہلی تو آ گئے، لیکن ٹِک کر رہنا، انھیں ساڑھے تین سال کے بعد نصیب ہوا۔ اس میں دخل ان کے مزاج کی سادگی اور سہولت پسندی کو بھی تھا، اور '' کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا''۔ وہ آگرے سے دہلی آئے تھے، یعنی فتح پور سیکری سے آئے تھے۔ وہ شیخ سلیم چشتی کے خانوادے کے براہِ راست چشم و چراغ تھے۔ وہ کیا کرتے۔ قسامِ ازل نے معصومیت اور بے ریائی اور قناعت اس مٹی میں گوندھ دی تھی، جس سے ان کا خمیر اٹھا تھا۔ موجِ آب اور سراب میں ہر شخص فرق محسوس نہیں کر سکتا۔ سو اس وقت فریدی صاحب بھی نہیں کر سکے۔ ان کا صاف و شفاف لیکن قصباتی ذہن، شعبے میں موجود، دو بڑی طاقتوں کے تضاد اور تفاوت کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ وہ یہ تو جانتے تھے کہ '' افلاطون'' اور '' ارسطو'' میں استادی، شاگردی کا رشتہ ہے۔ لیکن یہ بھید ان پر ایک عرصے کے بعد کھلا کہ '' افلاطون'' کا اثر، اپنی ساری افلاطونیت کے باوجود، اپنی حدیں رکھتا ہے، اور جہاں یہ حدیں ختم ہوتی ہیں، وہیں سے '' ارسطوئے دوراں'' کا دور شروع ہوتا ہے اور چکی کے دو پاٹوں میں فریدی جیسا فردِ فرید آ گیا:

تفو بر تو اے چرخِ گرداں، تفو !

فریدی صاحب کے شاگردوں اور چاہنے والوں میں آج کتنے ہیں، جو یہ جانتے ہیں کہ فریدی صاحب جیسا لائق و فائق اور بے بدل استاد، دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ساڑھے تین سال، دیواری گھنٹے کے پینڈولم کی طرح ڈولتا رہا ہے۔ کبھی ایڈہاک، کبھی ٹمپریری اور کبھی کسی صاحبِ اثر کی عیوضی پر۔ لیکن معاملے کا یہ صرف ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے: بڑا خوش آئند اور قابلِ ذکر۔ یہ کہ '' ستم گر'' اور '' ستم زدہ'' دونوں روز ملتے تھے، منصبی فرائض جو نبھانا تھے۔ دنیا بھر کے مسائل زیرِ بحث آتے تھے، بجز '' موضوعِ ستم'' کے۔ فریدی صاحب اچھے خاصے اعصاب زدہ آدمی تھے۔ معمولی معمولی پریشانیاں ان

Marfat.com

کے لیے ایک مسئلہ بن جاتی تھیں۔ لیکن اذیت کے ان دنوں میں مجھے یاد نہیں کہ میں نے انھیں کبھی تلخ کلامی یا حدِ ادب سے تجاوز کرتے دیکھا ہو۔ ان کے کانوں تک قطعاً بے بنیاد اور پا در ہوا باتیں پہنچتیں بلکہ پہنچائی جاتیں۔ ''انڈر گریجویٹس کو پڑھانا ایک بات ہے، پوسٹ گریجویٹس کو پڑھانا بالکل دوسری بات ہے۔ فریدی ایم۔ اے کلاسوں کو نہیں پڑھا سکتے۔ وہ پان کھاتے ہیں اور کلاس میں طلبا کو اپنے شعر سناتے ہیں۔ وہ پروفیسر فاروقی کے آدمی ہیں اور ہم لوگوں کی مخبری کرتے ہیں''۔ وہ سنتے اور ہنس کر اڑا دیتے۔ بعض رفقائے کار نے ان کے اور میرے درمیان بھی رقابت اور حریفی کی ایک دیوار کھڑی کرنا چاہی۔ لیکن یہ کھڑی کس طرح ہوتی؟ اس کی بنیادیں سخت سست تھیں۔ لیکن شک و شبہ اور عداوت و کدورت کے یہ بادل چند سال میں چھٹ گئے۔ اس میں دو چیزیں کارفرما تھیں۔ ایک فریدی صاحب کی ملازمت کا مستقل ہونا، دوسرے فریدی صاحب کا تدریس کی طرف اپنا انہماک اور تندہی۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی ان تھک محنت اور کوشش سے شعبۂ اردو کی بڑی تیزی سے توسیع ہوئی۔ نئے نئے کورس جاری کیے گئے۔ نئی نئی علمی اور ادبی منزلیں سر کی گئیں۔ اس نئی فضا سے شعبے کے تمام ہی ساتھیوں کو ایک نیا ولولہ ملا۔ فریدی صاحب نے بھی بقدرِ حوصلہ اپنی علمی اور ادبی جہات کو وسعت دی۔ ان کی شخصیت پوری طرح برگ و بار اسی زمانے میں لے کر آئی۔

فریدی صاحب نے بتایا کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد، انھیں ڈاک اور تار کے محکمے میں ملازمت ملی تھی۔ ضرور ملی ہوگی۔ جلد ہی انھوں نے ملازمت چھوڑ دی۔ اچھا ہی ہوا۔ اگر رہتی تو نہ محکمے کا بھلا ہوتا نہ فریدی صاحب کا۔

کم کسی شاگرد نے اتنی دلچسپی اور ذوق و شوق کے ساتھ اپنے کسی استاد کا ذکر کیا ہوگا، جتنا فریدی صاحب نے بار بار پروفیسر حامد حسن قادری کا کیا ہے:

> ''قادری صاحب بچھرایوں کے رہنے والے تھے۔ سینٹ جونس میں اردو/ فارسی کے استاد تھے۔ قد بوٹا سا تھا۔ رنگ گورا، چٹا۔ خوش رو، سفید بارونق داڑھی۔ میرے شفیق استاد، استاد کیا سرپرست۔ میں نے جو کچھ سیکھا ہے انھیں سے سیکھا ہے۔ عالم، فاضل، محقق، نقاد، شاعر اور تاریخ

کو۔ اور سب سے بڑھ کر ایک مثالی کردار کے مالک''۔

محمد طاہر فاروقی کے نام اور کام کو بھی اکثر دہراتے تھے۔ ایم۔ اے انھوں نے علیگڑھ سے کیا۔ اپنے سارے ہی استادوں کا ذکر بڑے احترام اور محبت سے کرتے تھے۔ لیکن رشید احمد صدیقی کے ذکر میں علاوہ احترام اور محبت کے عقیدت اور ارادت بھی شامل ہوتی تھی۔ دہلی کے دورانِ قیام میں وہ ہوٹلوں میں بھی رہے۔ اور ہوسٹلوں میں بھی۔ کرائے کے عام مکانوں میں بھی رہے اور یونیورسٹی کے مکان میں بھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جس سکون کی تلاش میں وہ رہے، وہ انھیں کبھی میسر نہ آسکا۔ تاہم اس بے سکونی کی حالت میں بھی انھوں نے دو طرح سے ناموری حاصل کی، بحیثیت ایک معلم کے اور بطور ایک شاعر کے۔

ضروری اسناد حاصل کرنے کے بعد، سبھی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لکچرر ہو جاتے ہیں۔ لیکن کتنے ہیں جو پڑھانے سے پہلے خود پڑھتے ہیں۔ گھنٹوں خونِ جگر کھپاتے ہیں۔ شعر وادب کے معاملات اور مسائل پر آزادانہ غور وفکر کرتے ہیں۔ فن پارے کا نیا Interpretation پیش کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر ادب یا ادبیات سے تجربات، بصیرت اور مسرت کا خزینہ لفظوں کی شکل میں اپنے طلبا تک پہنچا دیتے ہیں۔ اگر ایک باہوش اور ذمہ دار ٹیچر اپنے شاگردوں میں ذوقِ صحیح پیدا کر سکے تو سمجھیے کہ اس نے اپنا سب سے اہم فرض ادا کر دیا۔ میں بہت زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ فریدی صاحب نے یہ فرض بڑی خوبی سے انجام دیا ہے۔ وہ ایک Inspiring استاد رہے ہیں۔ ایک فنکار ہونے کے باعث انھوں نے عوائد رسمیہ کو توڑا بھی ہے۔ چاہا تو کلاس روم میں پڑھایا، چاہا تو مرغزار پر، اور چاہا تو گھر پر۔ وہ طلبا کو موڈ آنے پر چائے خانے بھی لے جاتے تھے۔ انھوں نے جتنا پڑھا تھا، اس کو پوری طرح ہضم بھی کیا تھا۔ فارسی شعری ادب پر ان کی بہت اچھی نظر تھی۔ اردو کلاسیکی شاعری، خصوصاً غزلیہ شاعری پر وہ کاملانہ قدرت رکھتے تھے۔ پھر ذوقِ صحیح کے ساتھ ان کی بڑی قوت ان کا حیرت انگیز حافظہ تھا۔ کسی ایک شعر کی وضاحت کرتے ہوئے وہ ایک دو نہیں درجنوں ہم مضمون اشعار پڑھ دیا کرتے تھے اور ایسے ایسے نکات بیان کر جاتے تھے، جو اس سے پہلے نہ سننے میں آئے تھے نہ پڑھنے میں۔ ایسے مقامات پر

Marfat.com

طلبا ہی نہیں ہم لوگ بھی گزارش کرتے ''فریدی صاحب یہ سب باتیں لکھ دیجیے، آپ کا ہم پر احسان ہوگا۔ شعر و ادب پر احسان ہوگا''۔ اور وہ بڑی شدومد سے وعدہ کرتے ''جی ہاں، ضرور، ضرور''۔ لیکن فریدی شناس جانتے تھے کہ:

ترے وعدے پر جیے ہم، تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

اسی طرح وہ عروض پر حیرت انگیز قدرت رکھتے تھے۔ لیکن عام عروضیوں کے برخلاف تھے۔ اس لیے کہ دیکھا یہ گیا ہے کہ اگر آدمی ''ماہرِ عروض'' ہے، تو پھر اس کے باذوق ہونے، اچھا شعر کہنے اور کبھی کبھی تو اچھا آدمی ہونے کا خانہ بھی خالی ہوتا ہے۔ مجھے ایسے کئی مظاہرے یاد ہیں کہ کوئی ''عروضیت مآب'' عروضی، محفل میں بیٹھے بامروت اور مہمان نواز، میزبانوں کے درمیان دون کی لے رہے ہیں۔ فریدی صاحب بھی بیٹھے ہیں اور خاموش ہیں۔ کوئی مجھ جیسا عروض سے بے بہرہ سرگوشی کے انداز میں فریدی صاحب سے پوچھتا، کہ کیوں حضرت کیا ماہرِ عروض کا یہ دعویٰ صحیح ہے؟ فریدی صاحب کہتے کہ ''بالکل نہیں'' میں کہتا ''تو پھر مہمان کا ٹیوٹوریل لے لیا جائے''۔ (ٹیوٹوریل، فریدی صاحب کی وضع کردہ اصطلاحوں میں سے ایک اصطلاح تھی) اور ٹیوٹوریل اس طرح لیا جاتا کہ ماہرِ محترم یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا کہ ''ہاں، ایک پہلو یہ بھی ہے، اس پر بھی غور کیا جاسکتا ہے''۔ عروض پر پہلے تو کتابیں بہت کم ہیں، جو ہیں وہ پرانی ہو چکی ہیں اور ادق زبان میں لکھی گئی ہیں۔ فریدی صاحب کے رفیقوں نے فریدی صاحب سے جائز مطالبہ کیا ہے کہ عروض پر ایک عام فہم کتاب لکھیے۔ اس لیے کہ وہ ہی لکھ سکتے تھے۔ اور جب کتاب لکھنے کی بات آئی ہے تو یہ بھی سن لیجیے کہ تاریخ گوئی میں برِصغیر میں تاحینِ حیات ان کا کوئی مماثل نہیں تھا۔ ان کے قطعہائے تاریخ بے حد دلچسپی سے سنے گئے ہیں۔ مزے لے لے کر پڑھے گئے ہیں اور ان پر مبنی مضامین بھی لکھے گئے ہیں۔ تاریخ گوئی پر آسان زبان میں ایک کتاب، یعنی ''اس گرہ نیم باز کا قرض بھی'' فریدی صاحب کے ناخن پر رہ گیا۔

ان کی شخصیت کا سب سے حاوی اور تابناک پہلو، ان کی شاعری تھا۔ ان کا مجموعۂ کلام ۱۹۸۷ء میں ''کفرِ تمنا'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ غزل، ان کا میدانِ خاص

Marfat.com

ہے۔ تاریخ گوئی کی طرح تضمین نگاری میں بھی انھوں نے اپنے جوہر کا اظہار کیا ہے۔ نہ وہ مشرق سے بیزار تھے نہ مغرب سے حذر کرتے تھے۔ وہ کلاسیکی ادب کے سرچشموں سے سیراب بھی ہوئے تھے اور جدید عصری ادب کا بھی وقوف رکھتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی یہ امپریشن ضرور دیتے تھے جیسے ماضی کا حسن و جمال انھیں وہیں روک لیتا ہے۔ اور جب وہ حال میں واپس آتے ہیں تو حال کے تقاضے اور زیادہ بدل چکے ہوتے ہیں اور زیادہ نئے ہوگئے ہوتے ہیں۔ اور وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے بجائے، آنکھیں چرا کر نکل جاتے تھے۔ غزل کی توصیف میں وہ اپنے صاحبِ طرز استاد رشید احمد صدیقی سے اور آگے جاتے ہیں۔ یعنی غزل کو اردو ادب کی آبرو ہی نہیں، روحِ رواں بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ کلاسیکیت ان کے یہاں جامد اور سکہ بند نہیں ہوتی۔ پھر ان کا مزاج رومانی ہے۔ لیکن رومانیت ان کے یہاں خام، ادھ کچری اور ایک خاص سطح سے نیچے کبھی نہیں جاتی۔ ان کے نزدیک فیض بڑے غزل گو ہیں، بڑے نظم گو نہیں۔ وہ اختر الایمان کو بار بار پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن میرا جی کو نہیں۔ راشد کے ساتھ وہ بہت دیر تک نہیں رہ سکتے۔ قرۃ العین حیدر کو بڑی فنکارہ سمجھتے ہیں لیکن ''آگ کا دریا'' دوبارہ پڑھنے کے روادار نہیں۔

اکبرالہ آبادی نے جب اللہ کا نام لیا، تو رقیبوں نے تھانے میں جا جا کے رپٹ لکھوائی، لیکن مغیث الدین فریدی کو میں نے شروع ہی سے اللہ کا نام لیتے ہوئے دیکھا ہے اور اب تک ان کے خلاف کسی نے رپٹ نہیں لکھوائی۔ لکھوائے جانے کا امکان بھی نہیں، اس لیے کہ اللہ کا تصور، ان کے ذہن میں کچھ ایسا تھا:

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم

اس میں کہاں سے رقابت پیدا ہوگی؟ وہ خاصے مذہبی آدمی تھے۔ لیکن ظاہر نہیں کرتے تھے۔ صلح کل ان کا شعار تھا، جو انھوں نے سید اکبر حسین سے سیکھا، نہ جلال الدین محمد اکبر سے۔ یہ پودا ان کے بطون میں از خود پھوٹا تھا۔ ہاں، نم اسے فتح پور سیکری کے شیخ سے پہنچا ہے، جس کے آگے شہنشاہوں کے سر جھکتے ہیں۔

فریدی صوفی صافی تھے، اگرچہ مسند اور جبہ و دستار نہیں رکھتے تھے۔ تصوف ان کی زندگی میں طاقت بھی بنا ہے اور کمزوری بھی۔ کون سی نعمت ہے جو مبدأ فیاض نے ان پر ارزانی

Marfat.com

نہیں کی؟ روپ، رنگ، خدوخال، سیڈول اعضا، جوارح ایک طرف، تو دوسری طرف ذہانت، فطانت، حافظہ، شرافت وشائستگی، پھر کیا وجہ ہے کہ انھوں نے وقت پر اپنی چھاپ نہیں چھوڑی؟ میں نے دیکھا کہ ان کے اندرون میں بارہا کوئی بڑا کام کرنے کے لیے لہر اٹھی ہے، لیکن تساہل کے سنگلاخ سے ٹکرا کر معدوم ہوگئی ہے۔ قناعت، بہارِ بےخزاں سہی، لیکن اس کے بھیس میں آسان پسندی بھی چلی آتی ہے اور تقدیر پرستی بھی۔

لیکن میں کیوں Philosophice کر رہا ہوں؟ مجھے زمین پر آجانا چاہیے۔ مجھے یاد کرنا چاہیے کہ بقول مون تین: دوستی کو کلیت میں اپنانا چاہیے (A friend be taken in entirety, his merits and demerits together.) دوست کی قوتوں اور کمزوریوں کو یکساں حقیقت سمجھنا چاہیے۔ یوں ہے تو ہمیں فریدی صاحب کو فریدی صاحب سمجھ کر بات کرنی چاہیے۔ اس طرح، جس طرح وہ تھے۔ فریدی صاحب یوں ہوتے تو کیا ہوتا اور ووں ہوتے تو کیا ہوتا؟ کچھ بھی ہوتا، لیکن پھر فریدی صاحب، فریدی صاحب نہ ہوتے۔

فریدی صاحب چاہتے تھے کہ دوستوں سے ملا جائے۔ ادبی نشستوں میں مشاعروں میں شرکت کی جائے۔ کبھی کبھی بڑے پرزور اور پرشوق لہجے میں کہتے "بھئی، کل اتوار ہے، فلاں صاحب سے ملے ہوئے بہت دن ہوگئے ہیں۔ کئی بار ان سے کہا کہ اگلے اتوار کو آرہا ہوں، نہیں جا سکا۔ کل صبح اگر آپ آجائیں تو دونوں چلے چلیں گے"۔ اگلی صبح میں پہنچتا تو پہلے تو اپنی ناسازیِ طبع کی تفصیل بہ اصطلاحاتِ طبِ یونانی بیان کرتے۔ پھر کچھ حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ فرماتے۔ پھر چائے بنا کر لاتے، پھر کافی دیر کے بعد اچانک کہتے "بھئی فلاں صاحب کے یہاں بھی تو چلنے کا پروگرام ہے۔ کیا خیال ہے؟ کیوں نہ ٹال دیا جائے...اور یوں ہم لوگ، کسی کے یہاں گئے کم اور ٹالا زیادہ۔

تواضع اور خاطرداری ان کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ رفیقِ کار ہو، شاگرد ہو، یا کوئی اجنبی وہ بچھ جاتے تھے۔ اپنا گھر ہو یا ریسٹورنٹ، تواضع اسی شدومد سے ہوتی تھی۔

فریدی صاحب کو جاننے والے یہ بھی جانتے تھے کہ وہ اپنے بیوی بچوں، دوستوں اور رشتے داروں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ بڑا بیٹا شاہد، دماغی طور پر ماؤف تھا اور ہے۔

Marfat.com

فریدی صاحب اس سے دل و جان سے محبت کرتے تھے۔ کون سا طریقِ علاج ہے جو انھوں نے نہیں آزمایا؟ کون سا معالج ہے جس سے انھوں نے رجوع نہیں کیا؟ شاہد ہمیشہ نہیں تو اکثر ان کے لیے مسئلہ بن جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار علی گڑھ کے ایک پروفیسر صاحب نے فریدی صاحب کو Pragmatiosm پر ایک بھرپور لکچر دیا اور کہا کہ "آپ بچے کو فوراً دماغی اسپتال میں بھرتی کرادیجیے"۔ ان کے جانے کے بعد فریدی صاحب بولے" میں نے ان اسپتالوں میں مریضوں کی حالت دیکھی ہے۔ کچھ بھی ہو جائے شاہد میرے ساتھ رہے گا"۔ اور اس کے بعد ان کی آواز گلوگیر ہوگئی۔

اسی طرح چھوٹے بیٹے فیض کو انھوں نے سعودی عرب سے اس لیے بلا لیا کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ فیض کے وہاں رہنے کا مطلب کئی ہزار روپے مہینہ کی یافت تھا۔ چھوٹے بھائی معین الدین فریدی کی موت پر میں نے ہی نہیں بہت سوں نے انھیں بچوں کی طرح بلکتے ہوئے دیکھا ہے۔

ماڈل ٹاؤن میں فریدی صاحب کی سکونت کے باعث سی۔ ۱۲ مشہور ہوا تو ریڈس لائنز میں بی۔ ۱۳۔ رات کے چند گھنٹوں کے علاوہ فریدی صاحب کے یہاں ہجوم ہی نظر آیا۔ طالب علم، طالبات، ہم کار، دوست احباب اور اجنبی۔ ایک فقیر کا تکیہ تھا جہاں ہر طرح کا ضرورت مند آتا تھا۔ ان کی تنخواہ اگر چار گنا بھی ہوتی تو بھی پوری نہ پڑتی۔ کھاتے سب ہیں۔ کھلانے والے کم ہوتے ہیں۔ اور کھلا کر خوش ہونے والے اور بھی کم ہوتے ہیں۔ فریدی صاحب کا تعلق اسی اقلیت سے تھا۔ ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ جیب کبھی بھاری نہ ہوئی۔ مزاج میں سادگی اور لاپروائی تھی۔ کتابیں اور کاغذات کبھی مرتب نہ ہو سکے۔ مزاج اور مذاق میں بڑی نفاست تھی۔ دوسرے درجے کی چیز پر کبھی ہاتھ نہ رکھا۔ کپڑا، جوتا اعلیٰ درجے کا، لیکن پتلون، قمیض میں وہ سوتے ہوئے بھی ملے اور اسی طرح اٹھ کر سیدھے کلاس میں جاتے ہوئے بھی۔ قلم، کاغذ اور کتاب کے عاشق۔ مہنگے سے مہنگا فاؤنٹن پین ان کی جیب میں نظر آیا۔ لیٹر ہیڈ ہمیشہ دیدہ زیب ملا۔ خریدی تو اعلیٰ درجے کی کتاب خریدی۔ ملے تو شائستہ انسان سے ملے۔ ہلکا، چھچھورا اور خام شخص ہو یا شاعر ان کے دسترخوان پر کبھی نظر نہ آیا۔

ان کی ذات اور ذوق، عادات اور اطوار کو دیکھ کر کبھی کبھی ایسا لگا، جیسے وہ غلط زمانے

Marfat.com

میں پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ مصرعہ اکثر پڑھتے ہوئے پائے گئے'' الٹا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو''
پھر خود کہتے:

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

میں فریدی صاحب کے ساتھ چند منٹ بھی رہا ہوں اور چند پہر بھی۔ جب اٹھا ہوں، ملنے کی نئی خواہش لے کر اٹھا ہوں۔ میں نے انھیں گھنٹوں بولتے بھی پایا ہے اور خاموش اور گمبھیر بھی۔ وہ کبھی بارِ خاطر نہیں ہوئے۔ کبھی باسی نہیں ہوئے۔

اس شخص اور اس شخصیت کو ذہن میں رکھ کر میرؔ کی ایک رباعی سنیے اور مجھے اجازت دیجیے:

ملیے اُس شخص سے جو آدم ہووے
ناز اس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرمِ سخن تو گرد آوے اک خلق
خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

□□

Marfat.com

محترمہ ارونا آصف علی

بچپن کی کچھ یادیں ایسی ہوتی ہیں جو بظاہر ہم بھول چکے ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی وہ پرچھائیاں بن کر دماغ کے کسی گوشہ میں چپک کر رہ جاتی ہیں اور وقت آنے پر نہ جانے کس طرح چھم سے سامنے آجاتی ہیں۔ آج بھی مجھے یاد ہے جب میں چھوٹی تھی (شاید چھ یا سات سال کی) جب اپنی خالہ کے ساتھ کٹرہ گوکل شاہ ان کے ماموں زبیر قریشی کے گھر گئی تھی، جمعہ کا دن تھا گھر کی سبھی خواتین وعظ سننے سامنے کے مدرسہ میں جارہی تھیں (ان کے مکان اور مدرسہ کے درمیان ایک لکڑی کا پل تھا جو غالباً آج بھی ہے، کیوں کہ میں والد کی ملازمت کی وجہ سے اجمیر میں رہتی تھی، اس وجہ سے رشتہ داروں سے ملنے کے مواقع کم ہی ملتے تھے) مسجد میں پہنچے تو وعظ شروع ہو چکا تھا۔ مولوی صاحب نہایت جوش وخروش سے تقریر کررہے تھے کہ ایک صاحبہ سفید سیدھے برقعہ میں ملبوس تیزی سے اٹھیں اور ایک بنڈل نیچے مردانے میں اچھالا۔ تیز تیز چلتی ہوئی زینہ تک پہنچیں جھٹ پٹ برقعہ بدلا اور لپک جھپک پھرتی سے غائب میں دیکھتی ہی رہ گئی یا الٰہی یہ ماجرہ کیا ہے؟۔ کیوں درمیان سے غائب ہوگئیں۔ اتنے میں ہلچل مچ گئی اور چاروں طرف وہ ہینڈ بل بکھر گئے۔ مردانے میں لوٹ مچ گئی۔ اکثر وعظ بھول بھال اپنی پڑھنے میں لگ گئے۔ میری سمجھ میں خاک نہ آیا۔ خالہ سے پوچھا تو انھوں نے ڈانٹ دیا ''چپ بیٹھو' اور شاید ایک چٹکی بھی مروڑی اور میرا ہاتھ پکڑ کر فوراً ماموں کے گھر آگئیں۔ کچھ دیر بعد شور مچا کہ عورتوں میں زنانہ پولیس آئی ہے اور ان کی تلاشی لی جارہی ہے۔ خیر بات آئی گئی ہوگئی اور ہم اپنے گھر آگئے۔ دماغ میں کئی سوال گونجے مگر جواب نہ ملنے پر صبر کرلیا۔ کچھ دن بعد میرے منجھلے ماموں گھبرائے

گھبرائے آئے اور خالہ بی بی سے بولے جلدی ایک برقعہ دو ارونا جی کے خفیہ اڈے کا پتہ پولیس کو چل گیا ہے اور اپنی برقعہ اڑھا کر نکالنا ہے اگر چھاپہ پڑ گیا تو غضب ہو جائے گا۔ میرے کان کھڑے ہوئے۔دریافت کیا کون ارونا جی؟..اور یہ برقعہ کیوں۔میرے ماموں مجھے بہت چاہتے تھے بولے'' بیٹے کسی سے کچھ نہ کہنا میں ابھی آ کر بتاتا ہوں'' الغرض شام کو آئے تو بتایا ہماری تحریکِ آزادی کی ایک بہادر خاتون ہیں ارونا آصف علی۔وہ انگریزوں کے خلاف خفیہ تحریک بڑی سرگرمی سے چلا رہی ہیں وہ ''انگریزو بھارت چھوڑو'' کے نعرے لگا کر، گرفتاریاں دینے اور جیل جانے کے سخت خلاف ہیں۔ یہ ۱۹۴۲ء میں ''بھارت چھوڑو'' تحریک کا دور تھا تقریباً سبھی بڑے رہنما جیل جا چکے تھے مگر یہ بہادری سے باہر رہ کر تحریک چلانے کی حامی تھیں۔کہتی تھیں سبھی جیل چلے گئے تو تحریک کون چلائے گا۔پبلک کو محرک کون کرے گا؟ یہ جوش و خروش ٹھنڈا پڑ جائے گا اور تمام محنت بے کار جائے گی۔عوام کو بیدار رکھنا ہے تو غفلت نہیں برتنی چاہیے۔مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، مولانا آزاد، آصف علی اس وقت سبھی جیل میں ہیں ہمیں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھنا چاہیے۔اس دوران ان کے بھی وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔انگریز ان کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔پولیس تلاش میں تھی مگر وہ ٹھکانے بدل بدل کر اپنی مہم چلا رہی تھیں۔پریس میں کچھ دے نہیں سکتی تھیں اس لیے دیسی چھاپہ خانے چھپا چھپا کر رکھے ہوئے تھے اور ہاتھ سے یہ پیغام چھاپے جاتے تھے اور کچھ دلیر رضا کار اسے چپکے چپکے چھپ چھپ کر تقسیم کرتے تھے خاص طور سے نوجوانوں کو انھوں نے اپنا حامی بنا لیا تھا۔ان کے دلوں میں جوش و ولولہ بھر دیا تھا۔عورتیں عورتوں کی محفل میں اور لڑکے مردوں کے اجتماع میں یہ پیغام اچھال دیتے۔اپنی جان جوکھم میں ڈال کر راتوں کو اشتہار دیواروں پر چپکاتے، پولیس کے ہاتھوں پڑ جاتے تو چار چوٹ کی مار پڑتی اور جیل جاتے سو الگ۔مگر اپنی رہنما کے حکم پر جان نثار کرنے والے یہ رضا کار ہر دم تیار رہتے۔

آپ جانتے ہیں یہ نازک اندام حسینہ تھیں کون؟ جی یہ آصف علی کی چہیتی بیگم، گاندھی جی کی دلاری، پنڈت جواہر لعل نہرو کی لاڈلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی پیاری ارونا آصف علی تھیں۔

Marfat.com

آیئے اب ان کی ذاتی زندگی کا کچھ جائزہ لیں پھر سیاسی زندگی پر نظر ڈالیں گے۔
بچپن میں پیار سے اپنی کہلاتی تھیں نام ارونا گنگولی، بنگال کے باعزت گھرانہ میں اپندر ناتھ گنگولی اور امبیکا کی پہلوٹھی کی اولاد تھیں۔ ۱۹۰۷ء کو پیدا ہوئیں ان کے بعد تین بیٹے اور ایک بیٹی پورنیما جو سب سے چھوٹی تھیں۔ اگرچہ یہ خاندان بنگالی تھا مگر ان کی زندگی کا زیادہ حصہ بنگال سے باہر ہی گزرا۔ دونوں بیٹیوں کی ابتدائی تعلیم لاہور کے کونوینٹ اسکول میں ہوئی، ان کے والدین کی شادی اس زمانے کے دستور کے مطابق چھوٹی عمر میں ہوگئی تھی۔ والد نے ہوٹل انتظامیہ کی تربیت حاصل کی اور نینی تال میں ایک ہوٹل کھولا۔
ارونا جی بچپن سے ہی بہت ذہین تھیں ''پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آجاتے ہیں'' ہر جماعت میں اول آتیں۔ استانیوں کی بہت لاڈلی تھیں سبھی عیسائی یا اینگلو انڈین تھیں۔ اسکول میں بائبل کی تعلیم لازمی تھی ان کی ذہانت اور دلچسپی دیکھتے ہوئے انھوں نے بائبل کے علاوہ بھی عیسائی مذہب کی بہت سی کتابیں پڑھنے کے لیے دیں۔ اس سے یہ اس قدر متاثر ہوئیں کہ ''راہبہ'' بننے کو تیار ہوگئیں۔ والد کو جب علم ہوا تو وہاں سے نکال کر نینی تال میں ہی داخلہ دلوادیا۔ ذہانت کیوں کہ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کورس کے علاوہ دوسری کتابیں پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ وہاں گاندھی کے کارناموں اور ان کے خیالات سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ سیاست کی طرف رجحان ہوگیا۔
والد چاہتے تھے کہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق ارونا جی کی شادی کم عمری میں ہی کردی جائے۔ ذہین تھیں، حسین تھیں، تعلیم یافتہ تھیں اس لیے کئی اچھے بنگالی لڑکوں کے پیغام بھی آئے مگر طبیعت اس طرف مائل نہ تھی۔ والدین نے تھک ہار کر پہلے ان کی چھوٹی بہن پورنیما کی شادی کردی۔ اس وقت پورنیما کی عمر چودہ سال تھی۔
ارونا جی کو انگریزی ادب سے خاص لگاؤ تھا اور چاہتی تھیں کہ انگلینڈ جا کر انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کریں مگر والدین لندن کا خرچ برداشت کرنے سے قاصر تھے، وہ چاہتے تھے کہ ارونا جی کسی اچھے لڑکے سے شادی کر کے اپنا گھر بسائیں مگر انھوں نے مغربی طرز کی تعلیم حاصل کی تھی، بچپن سے ہی باغی ذہن پایا تھا۔ والدین کی پسند سے شادی کرنا منظور نہ تھا۔ جب کافی دباؤ پڑا تو گھر چھوڑ کر کلکتہ کے ایک اسکول میں ملازمت کرلی۔ سارا خاندان

کوشاں تھا کہ کوئی لڑکا ان کی نظر میں سمائے اور یہ شادی کرلیں۔ ان کے والدین اس سلسلے میں کافی ناراض بھی تھے۔ اسی دوران آصف علی صاحب ایک سیاسی کانفرنس کے لیے بنگال گئے۔ ان کی (ارونا جی کی) ایک رشتہ دار مایا گنگولی آصف صاحب سے واقف تھیں، ان کے دل میں خیال آیا اگر ان دونوں کی شادی ہو جائے تو شاید انگریزی تعلیم کا ان کا خواب بھی پورا ہو سکے۔ انھوں نے آصف صاحب کو اپنے گھر الٰہ آباد آنے کی دعوت دی تا کہ اروناجی سے تعارف کروا سکیں۔ وہ بھی ان دنوں ان کے پاس ٹھہری ہوئی تھیں۔ بہر حال آصف صاحب ان کے گھر پہنچے اور اروناجی سے ملاقات کی بات چیت کی تو ان کا ایمان ڈانوا ڈول ہونے لگا۔ یا تو سیدھے دلّی جانا تھا یا مایا گنگولی کے اصرار پر ایک دن اور ٹھہر گئے۔ دوسرے ہی دن انھوں نے اروناجی کے سامنے شادی کی تجویز رکھ دی اور انھوں نے بھی بلا پس و پیش قبول کر لی مگر شرط یہ رکھی کہ وہ اپنے والدین کی منظوری حاصل کر لیں۔ کہتے ہیں کہ ''جوڑے آسمان پر بنتے ہیں'' یہاں اس بات پر یقین کرنا پڑتا ہے۔ والدین کی اجازت چاہی تو خوب واویلا مچی۔ وہ اس بندھن کے سخت مخالف تھے ایک تو مذہب کا فرق دوسرے عمروں کا تقاضا۔ اس زمانہ میں ہندو مسلم شادی کے بھی خلاف تھے، اسے بری نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ سماج قبول نہ کرتا پھر یہاں تو عمر کا بھی اتنا فرق تھا۔ کہاں وہ اٹھارہ سال کی خوبصورت، نازک اندام دوشیزہ اور کہاں اکتالیس سال کا پختہ مرد۔ بھلا والدین کیسے اپنی پھول سی بچی کو ان کے حوالے کرنے کو تیار ہو جاتے۔ خاصی کوششیں ہوئیں مگر ان کے والد ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اسی دوران ان کا انتقال ہو گیا، تو اپنے چھوٹے بھائی کو وصیت کر گئے کہ ایسا ہرگز نہ ہونے دینا۔

ادھر دوسری طرف آصف علی صاحب کے یہاں بھی کچھ حالات ایسے ہی تھے۔ آصف صاحب اکتالیس سال کے ہو گئے تھے مگر سہرے کے پھول ابھی نہیں کھلے تھے۔ شادی کا سان گمان ہی نہ تھا والدہ نے لاکھ سر پٹکا، جگہ جگہ لڑکیاں دیکھیں، رشتہ دار لگے رہے، کتنی مشاطاؤں کی خدمات حاصل کی گئیں مگر آصف صاحب تو اپنی شادی سیاست سے کر چکے تھے۔ حیدرآباد کی ایک مالدار لڑکی سے سلسلہ بھی چلا مگر کچھ سیاسی کچھ مالی حالات ایسے تھے کہ رشتہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور بات درمیان میں ہی ختم ہو گئی۔

Marfat.com

والدہ نے اپنی حیثیت کے مطابق عمدہ بری تیار کر رکھی تھی۔ بھاری بھاری زیورات، تلواں جوڑے مگر سب لا حاصل۔ ادھر ارونا جی سے رابطہ قائم ہوا، خطوط کے ذریعہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ اور پرکھ لیا، عمر کے فرق کے باوجود ذہنی ہم آہنگی غالب آئی۔ والدہ سے ذکر کیا تو وہ صدمہ سے نڈھال ہوگئیں" چھوٹی آنکھ کا ایک ہی دیدہ یعنی بیوہ ماں کی اکلوتی اولاد اور وہ بھی اس طرح کی شادی۔ کس طرح اپنے ارمان نکالیں۔ نابالغ ہونے کی وجہ سے سول میرج کر نہیں سکتے تھے۔ ادھر چچا نے اخباروں میں شائع کروایا، عدالت میں درخواست دی کہ میری بھتیجی نابالغ ہے اسے شادی کی اجازت نہیں مل سکتی مگر "جب دو دل راضی تو کیا کرے گا قاضی؟" یہ شادی ہوئی اور ہو کر رہی۔ حل یہ نکالا گیا کہ ارونا جی اسلام قبول کر لیں، وہ مسلمان ہوئیں اور اسلامی نام "کلثوم زمانی" رکھا گیا۔ اگرچہ اس کی حقیقت کچھ نہ تھی۔ آخری دم تک ان کے گھر میں ایک مورتی رہی۔

اس وقت کے ایک مسلم سیاسی رہنما، آصف علی صاحب کے دوست اور پڑوسی مشہور عالمِ دین مولانا احمد سعید صاحب نے ان کا نکاح پڑھایا اور ۱۹۲۵ء میں ان کی شادی ہوگئی۔

دلّی آکر وہ آصف صاحب کی پرانی حویلی کوچہ چیلان میں ہی ٹھہریں (جہاں آس پاس سر سید احمد خاں، مومن خاں مومن، مولانا احمد سعید، ملا واحدی اور میر درد کی قیام گاہیں تھیں۔ ملا واحدی اور مولانا احمد سعید صاحب کے ساتھ آصف صاحب کے قریبی تعلقات تھے) اس شادی سے ان کی والدہ کافی ناراض اور دل برداشتہ تھیں۔ انھیں بے حد صدمہ پہنچا۔ سارے ارمان خاک میں مل گئے، خواب دیکھے تھے کہ دلہن پالکی سے اترے گی، بھاری سا سوٹ، تلواں دوپٹہ، زیورات سے لدی پھندی، پیروں میں پازیب کی جھنکار، لمبا سا گھونگھٹ نکالے جھکی جھکائی آئے گی وہ۔ واہ رے قسمت ایسا کچھ نہ تھا۔ معمولی سادا ساڑی، زیور سے بے نیاز منہ اٹھائے چلی آرہی ہیں مگر صورت دیکھی تو دیکھتی رہ گئیں۔ نہایت خوبصورت، سبک ناک نقشہ، گورا رنگ، مناسب قد و قامت، تراشا ہوا بدن، روشن آنکھیں جن میں بنگال کی جادوگری۔ ایسا لگتا جیسے ایک حسین مورتی۔ ساس کو ایک دم پیار آگیا۔ اس سادگی میں بھی پرکاری تھی۔ کہتے ہیں "ایک نور نور، دس نور کپڑا، سو نور زیور،

Marfat.com

ہزار نور نخرہ۔ مگر یہاں جسم پر نہ غرارہ تھا، نہ ماتھے پر جھومر، ٹیکہ، نہ گلے میں گلوبند، مالا، چمپاکلی، نہ ہاتھوں میں کڑے، دست بند، موگریاں یا پونچیاں۔ نہ پیروں میں پازیب اور نخرہ تو چھو کر نہیں گیا تھا۔ بس ایک نور ہی نور تھا جو ہر آنکھ میں کھپ جاتا۔

اپنی موہنی صورت اور خدمت کا جذبہ، دل موہ لینے والی مسکراہٹ اور میٹھی میٹھی باتوں سے ساس کا دل ایسا جیتا کہ وہ والہ وشیدا ہو کر رہ گئیں۔ ایک اینگلو انڈین ماحول میں پلی بڑھی لڑکی جس نے ہمیشہ کھلی ہوا میں سانس لیا ہو پرانی دلّی کی پرانی حویلی جہاں مردانہ، زنانہ الگ بالکل نیا ماحول تھا مگر وہ اسی میں آ کر رچ بس گئیں۔ اس کو اپنی پسند کے مطابق سجا سنوار لیا بلکہ آصف صاحب نے پیش کش بھی کی کہ سول لائنز میں الگ بنگلہ کرایہ پر لے کر انھیں لے جائیں مگر ساس کی دل شکنی کے خیال سے انھوں نے یہ تجویز نامنظور کر دی کیوں کہ ساس اپنے پرکھوں بلکہ میکہ کی حویلی کیسے چھوڑ سکتی تھیں؟ اور ارونا جی کا نرم و نازک دل یہ کیسے گوارہ کرتا کہ وہ بیٹے کو ماں سے الگ کر دیں۔ ہاں اگر آج کے زمانے کی بہو ہوتی تو وہ تو خوشی سے پھولی نہ سماتی۔

آہستہ آہستہ وہ اس ماحول میں گھل مل گئیں جو نہ کبھی مسلم ماحول میں گئی تھیں نہ ملی تھیں۔ ملنے جلنے والے آتے، بھانت بھانت کی بولیاں بولتے، منہ بناتے مگر ان کی تیوری پر کبھی بل نہ آیا۔ آصف صاحب کے رشتہ داروں اور دوستوں سے نہایت خنداں پیشانی سے ملتیں، خوب خاطر تواضع کرتیں کہ سبھی ان کے گرویدہ ہو کر اٹھتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد تو جب بھی دلّی آتے کوچہ چیلان انھیں کے گھر قیام کرتے۔ ایک دفعہ انھوں نے آصف صاحب سے کہا بھی کہ مولانا کو برلا ہاؤس میں ٹھہرنے کے لیے راضی کریں مگر مولانا ہرگز نہ مانے۔ اردو بولنے اور سمجھنے میں شروع میں انھیں خاصی دشواری ہوئی مگر آہستہ آہستہ ساس سے اردو بھی سیکھ لی کیوں کہ ذہین تھیں جلد ہی بہت عمدہ اردو بولنے لگیں۔

رفتہ رفتہ آصف صاحب کی صحبت میں سیاست سے دلچسپی پیدا ہوتی گئی۔ ان کے ساتھ جلسوں، جلوسوں اور کانفرنس وغیرہ میں شرکت کرتیں۔ ان کے گھر ہمیشہ سیاسی رہنماؤں کی محفلیں جمتیں۔ مولانا آزاد، پنڈت نہرو، گاندھی جی سے ملاقاتیں رہتیں۔ سب سے پہلے مولانا آزاد نے ان کی شادی کو تسلیم کیا پھر نہرو جی نے کچھ عرصہ بعد گاندھی جی نے

Marfat.com

بھی مان لیا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ جنھوں نے عورتوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا شروع میں ان سے اس قدر نفرت کرتے تھے کہ دیکھ کر منہ پھیر لیتے کہ ایک برہمن لڑکی نے مسلمان سے شادی کیوں کی۔ مگر جب ان کے گھر آئے، ملے جلے تو وہ بھی راضی ہو گئے کیوں کہ ذہانت، اخلاق اور بہادری نے سب کے دل جیت لیے۔ انھوں نے ایک سرگرم کارکن کی طرح آصف صاحب کے دوش بدوش چل کر نہایت جوش وخروش سے سیاست میں حصہ لیا۔ ان دنوں صرف چند خواتین ہی سیاست میں آگے آئی تھیں۔ بیگم حسرت موہانی، سروجنی نائیڈو، رامیشوری نہرو مگر یہ بھی کسی سے کم نہ تھیں۔ کافی عرصہ تو شوہر کی انگلی پکڑ کر کانگریس کا کام کرتی رہیں پھر اپنی راہ خود تلاش کرنے میں لگ گئیں۔ ان کا جھکاؤ سوشلزم کی طرف ہو گیا۔ اس میں بھی نام کمایا مگر ان کی طبیعت اس کی طرف بھی راغب نہ ہوئی مگر راہبر کو ابھی تک بھی نہ پہچان سکیں کہ کمیونزم پر دل آ گیا اور اسے خوب نبھایا اور اسی کی ہو کر رہ گئیں۔

وہ عوام میں رہ کر عوام اور خاص طور سے عورتوں کی خدمت کرنا چاہتی تھیں۔ اس طرح ان کا شوہر سے بھی اختلاف ہوا اور رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ درمیان میں ایک کھائی پیدا ہو گئی مگر آصف صاحب ان کو اس قدر چاہتے تھے کہ ہمیشہ تعریف ہی کرتے رہے۔

اکلوتے ہونے کی وجہ سے والدہ کو پوتا کھلانے کا بہت شوق تھا مگر ارونا جی کا خیال تھا کہ سیاست میں رہ کر بچے کی پرورش اور تربیت اچھی نہیں ہو سکے گی۔ اس سلسلہ میں آصف صاحب کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا۔ انھوں نے والدہ کے سامنے یہ الزام اپنے سر لے لیا۔ اگرچہ انھیں سخت صدمہ پہنچا کہ قدرت کا فیصلہ ہوتا تو شاید صبر بھی آ جاتا مگر اپنے ہاتھوں لیے ارادہ نے بہت مایوس کیا۔ آخر میں ارونا جی کو احساس ہوا کہ آصف صاحب کو بھی اولاد کا ارمان تھا مگر بیوی کی محبت میں پی گئے اور اپنا شوق قربان کر دیا، تب ارونا جی پچھتائیں اور اپنی دوسری شادی کا مشورہ دیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر میں اختلافات اس قدر بڑھے کہ لوگوں نے یہاں تک اڑا دیا کہ ارونا جی آصف علی صاحب کو چھوڑ کر اچھوت پٹوردھن سے شادی کر رہی ہے۔ یہ آصف صاحب کی برداشت سے باہر کی بات تھی۔ آخر شکوہ زبان پر آ ہی گیا مگر ارونا جی نے اس کی نفی کرتے ہوئے کہا اگر ایسا ہوتا تو سب سے

Marfat.com

پہلے آپ کو ہی بتاتی۔ آخر آصف صاحب کو پورا یقین ہوگیا کیوں کہ بیحد صاف گو اور نڈر تھیں، چھپا کر تو کچھ کرنا جانتی ہی نہ تھیں۔ ان کی سیاسی اور ازدواجی زندگی بھی نرالی تھی، پھر بھی محبت اپنی جگہ تھی۔ جب یہ روپوش ہوکر خفیہ تحریک چلا رہی تھیں سبھی نے انھیں سمجھایا کہ نہرو جی نے تو یہاں تک کہا کہ تم خود کو پولیس کے حوالے کردو۔ ان کی خوددار طبیعت کہاں یہ گوارہ کرسکتی تھی۔ مولانا نے انگریز حکومت سے ان کی اور آصف صاحب کی خرابی صحت کی وجہ سے رہائی کی درخواست بھی کی مگر یہ سخت ناراض ہوئیں پھر جب آصف صاحب بیمار ہوکر ولنگڈن اسپتال (موجودہ رام منوہر لوہیا) میں داخل ہوئے تو وہ ہر خطرہ مول لے کر انھیں دیکھنے اسپتال پہنچ گئیں۔ یہ اختلافات صرف نظریاتی تھے دلی نہیں دلوں میں دونوں کے چاہت تھی۔ آصف علی صاحب آزادی کے بعد گورنر، سفیر اور وزیر جیسے اعلیٰ عہدوں پر رہے مگر ارونا جی نے ان کے ساتھ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے بجائے وہی معمولی زندگی گزاری۔ سفید ساڑی، بکھرے بال، سردیوں میں بے ترتیبی سے پڑی شال اور پاؤں میں چپل۔ مستقل ان کے ساتھ سرکاری رہائش گاہ میں کبھی نہ رہیں۔

عمدہ مغلئی کھانوں اور خاطر تواضع کی بے حد شوقین تھیں۔ مچھلی تو خیر مرغوب تھی ہی اس کے علاوہ بریانی، قورمہ، شامی کباب بے حد چٹخارے لے لے کر کھاتی تھیں۔ جب بھی کوئی دعوت ہوتی آصف صاحب کی ماموں زاد بہن کو فون کر کے کھانے پکواتیں، کچھ اپنی ساس سے سیکھ لیے تھے خود بھی پکاتی تھیں۔

انڈین وومن فیڈریشن کی صدر دہلی اور عورتوں کی انجمنوں میں بھی دل و جان سے کام کیا اور انھیں چار چاند لگائے۔ روس گئیں اور لینن کا امن عامہ کا انعام بھی حاصل کیا۔

آخر میں آصف صاحب سوئیٹزرلینڈ بحیثیت سفیر بھیجے گئے تب بھی یہ ساتھ نہ تھیں مگر کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ ان کے انتقال سے ایک دن قبل یہ پہنچ گئیں۔ انھیں دل کا دورہ پڑا اور یہ اپنے پیارے شوہر کی لاش لے کر واپس آئیں۔ کہتے ہیں آصف صاحب جب جارہے تھے کسی نے پوچھا واپس کب تشریف لائیں گے تو مسکرا کر جواب دیا ”مہرباں ہو کے بلا لو مجھے جب چاہو۔ میں گیا وقت نہیں کہ آ نہ سکوں“۔ کسے پتہ تھا کہ وہ گیا وقت بن کر ہی واپس آئیں گے۔

Marfat.com

آصف صاحب کے انتقال کے بعد پنڈت جی نے انھیں بنگال کی گورنری اور کئی اعلیٰ عہدوں کی پیش کش کی مگر وہ عوام کی بے لوث کارکن تھیں، انھیں نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلہ کی پروا، ان کا مقصد تو کام۔ کام اور صرف کام ہی تھا۔ نہ عہدہ کا لالچ تھا نہ اقتدار کی چاہ۔ ہندوستانیوں کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد کرانا تھا سو کرالیا۔ بہ مشکل دلی کی میئر بننے پر راضی ہوئیں۔ یہ پہلی خاتون میئر تھیں جن کا انتخاب الیکشن کے ذریعہ ہوا۔ اس میں بھی انھوں نے بہت سے رفاہی کام کیے جو ضرورت مند پہنچا اس کی مدد کی حد ہے کہ کوچہ چیلان کا اپنا مکان بھی میونسپلٹی کو اسکول کھولنے کے لیے دے دیا جو آج بھی قائم ہے مگر بلڈنگ کی حالت مخدوش ہونے کی وجہ سے اسکول فیض بازار میں منتقل کر دیا گیا، اس کے لیے فنڈ منظور کروانے کے لیے علاقہ ایم۔ ایل۔ اے جناب شعیب اقبال صاحب نے بہت کوشش کی مگر کچھ قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے وہ ابھی تک بن نہ سکا۔

ہفتہ وار لنک اور روزنامہ پیٹریاٹ بھی ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے جس کے لیے انھوں نے جان توڑ محنت کی۔ اس میں کسی کی مدد لینا بھی گوارہ نہیں کیا اور روزنامہ اخبار کا افتتاح بھی پنڈت جواہر لعل نہرو جی کے ہاتھوں ہوا۔ کچھ لوگ ساتھ بھی آئے۔ بہادر شاہ ظفر مارگ پر لنک ہاؤس کی شاندار عمارت بھی بنوائی جس کے لیے ان کا زندگی بھر کا سرمایہ خرچ ہو گیا۔ حد ہے روس سے ملے لینن ایوارڈ کی رقم بھی اس میں صرف ہوگئی۔ بینک سے بھی قرض لینا پڑا۔ یہ کامیاب بھی ہوا مگر سیاست کی نذر ہو کر رہ گیا۔ اشتہار ملنے بند ہو گئے، جس کا اخبار پر برا اثر پڑا۔ راجیو گاندھی جب وزیراعظم بنے، ان سے ارونا جی نے اس کا مسئلہ حل کروانے کی درخواست کی اور انھوں نے وعدہ کیا کہ ان سے جو کچھ ہوگا ضرور کریں گے، فی الحال الیکشن کے دورہ پر جارہے ہیں واپسی پر کوئی نہ کوئی حل نکلے گا، مگر افسوس ان کا وہ دورہ آخری ثابت ہوا۔ ارونا جی بہت اداس اور پریشان ہوگئیں۔ عمارت بھی فروخت کرنی پڑی پھر بھی بینک کا قرض ادا نہ کرسکیں۔ اس صدمہ نے انھیں توڑ دیا۔ جس اخبار کو اپنا خون پسینہ ایک کر کے بچے کی طرح پالا تھا اس سے ہاتھ دھونے پڑ گئے اس سے ان کی صحت پر بہت برا اثر پڑا۔

۱۹۹۴ء میں فالج کا حملہ ہوا، کمزور تو پہلے ہی تھیں ایک ہاتھ اور پیر پر اثر پڑا۔ زبان

Marfat.com

بند ہوگئی آخر وقت میں بولتی بھی تھیں تو بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کافی عرصہ ولنگڈن اسپتال میں زیرِعلاج رہیں، اپنا گھر اسکول کو دے کر لنک ہاؤس میں رہیں۔ وہ چھٹنے کے بعد آصف علی روڈ پر جمنا داس بھون کے ایک کمرہ میں رہائش پذیر ہوئیں۔ کچھ عرصہ بعد وہ بھی خالی کروانے کی کوشش کی گئی۔ حد ہے کہ خالی کروانے کے لیے کمرہ میں بم بھی رکھوادیا گیا تھا، مگر ''جا کو راکھے سائیاں وا کو مارے نہ کوئی'' خدا کی طرف سے زندگی منظور تھی۔ ابھی لفٹ تک ہی پہنچی تھیں کہ بم پھٹ گیا اور وہ بال بال بچ گئیں۔ آخر حکومت نے انھیں وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں دو کمرے الاٹ کردیے۔ آخر تک وہیں رہیں۔ ۱۹۸۷ء میں بھی ان کی خدمات کے سلسلے میں ایک ایوارڈ ملا۔ تیسرا ایوارڈ جب ملا ہے تو وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں وہیل چیئر پر بیٹھ کر لیا ہے۔

۲۷ر جولائی ۱۹۹۶ء میں ولنگڈن اسپتال میں ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ ۱۹۹۷ء میں بعد از مرگ ''بھارت رتن'' کے خطاب سے بھی نوازا گیا جو ان کی بھانجی اُنو نے لے کر آصف صاحب کے بھانجے اسد علی صاحب کے حوالے کردیا۔ انتقال کے بعد ان کی لاش بھی ان کی بھانجی نے ہی حاصل کی اور ہندو رسم کے مطابق بجلی کے شمشان گھاٹ میں جلا کر آخری رسوم ادا کیں۔ نہ شوہر زندہ تھے نہ ساس، نہ اولاد کہ کوئی احتجاج کرتا۔ وہی حقدار تھیں جو چاہا کیا۔

سخت ناانصافی ہوگی اگر میں آخر میں سلطانہ بیگم صاحبہ کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے مجھے بہت تعاون دیا اور ان کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بتائیں جو مجھے معلوم نہ تھیں۔

عورتوں کی آزادی کی علمبردار، انجمنوں کی روحِ رواں آخر جل کر خاکستر ہوگئیں۔ انھوں نے ہمیشہ عوام سے رابطہ رکھا صرف تقریروں یا نعرے بازیوں پر یقین نہ رکھتی تھیں نہ محلوں میں بیٹھ کر بڑی بڑی باتیں کیں، ان کی شخصیت بے مثال اور منفرد تھی۔ نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ اور عورتوں کی ایک مثالی رہنما تھیں۔ انھوں نے بہترین رفاہِ عام کا سلیقہ سکھایا۔ شمع کی طرح خود پگھلتی رہیں مگر دوسروں کو راہ دکھائی۔ جہاں تک ہوسکا سسرالی رشتوں کو نبھایا۔ کہنے کو بہت کچھ ہے مگر وقت کم۔

Marfat.com

سعید خاں

مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں مرحوم سعید خاں، سابق میونسپل کونسلر پر اپنی چالیس سال پرانی دوستی کے سمندر کا منتھن کر کے اس میں سے یادوں کا امرت نکالنے کی کوشش کروں۔ تو سماعت فرمایئے۔

حضرات! سعید خاں مرحوم دہلی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ سعید صاحب کو میر امن کی زبان میں دلّی کا روڑا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیوں کہ ان کے آباؤ اجداد صدیوں سے دہلی میں آباد تھے۔ سعید صاحب کے والد رشید خاں صاحب پیدائشی کانگریسی اور تحریک آزادی کے سرگرم کارکن تھے۔ سعید صاحب کی پیدائش ٹھیک ٹھیک تو یاد نہیں لیکن وہ ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء میں اگست کے مہینے کی کسی تاریخ میں پیدا ہوئے تھے۔

انھوں نے جب نوعمری میں شعور کی آنکھ کھولی تو اس وقت پورے ملک میں آزادی آزادی کا نعرہ گونج رہا تھا۔ ہندو مسلمان سب کا ایک مقصد تھا ہندوستان کی آزادی۔ اس وقت ہندوستان کے سیاسی منظر نامے پر دو پارٹیاں براجمان تھیں کانگریس اور مسلم لیگ۔ سعید صاحب کا گھرانہ ہمیشہ سے کانگریسی رہا ہے لہٰذا سعید صاحب نے ہوش سنبھالا تو انھوں نے دیکھا ان کے والد تحریک آزادی کے مجاہد بنے سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ سعید صاحب کا گھر مجاہدینِ آزادی کا پوشیدہ مرکز تھا۔ یہاں پر تحریک آزادی کے حوالے سے پوسٹر، ہینڈبل اور پمفلٹ شائع کرنے کے لیے ایک چھاپہ خانہ پتھر کی سلوں کو تراش کر بنالیا گیا تھا جس پر ضرورت کے مطابق پوسٹر پمفلٹ وغیرہ کسی نہ کسی طور چھاپ لیے جاتے تھے اور کسی خطرے کو بھانپتے ہی اس پتھریلے پریس کو اِدھر اُدھر بکھیر دیا جاتا تھا۔

سعید صاحب کے والد کے علاوہ ان کی والدہ بھی اس کارِ خیر میں سرگرمی سے حصہ لیتی تھیں۔ ان کے بڑے بہنوئی ضیا صاحب مرحوم بھی حصہ لیتے تھے لیکن سعید صاحب چوں کہ نوعمر لڑکے تھے لہٰذا یہ سوچ کر کہ ان پر کسی کو شک نہیں ہوسکتا وہ شائع ہونے والا مواد جس شکل میں بھی ہو انہی کے ہاتھوں مختلف مجاہدین کے گھر بھیجا جاتا تھا۔ کوئی پوسٹر بازار میں چسپاں کرانا ہوتا تھا تو سعید صاحب کو الصبح کمند اندھیرے بھیج کر بازار میں کچھ مخصوص جگہوں پر وہ پوسٹر چسپاں کرادیا جاتا تھا اور سعید صاحب کسی ڈر وخوف کے بغیر مجاہدین آزادی کے اس مشن کو بخیر وخوبی کامیابی سے انجام دے دیا کرتے تھے۔ جب تک ملک آزاد نہیں ہوگیا سعید صاحب اپنے والدین کے ساتھ مل کر اپنی طاقت بھر اس تحریک میں ہاتھ بٹاتے رہے۔ اس کے علاوہ سعید صاحب کے گھر میں اس وقت کی اہم شخصیات کا بھی آنا جانا رہتا تھا۔ میٹنگیں ہوتی تھیں، جلسے جلوسوں کے پلان بنتے تھے۔ پوسٹر پمفلٹ شائع ہوتے تھے۔ ان سب باتوں کو بتانے کا مقصد یہ ہے کہ جس شخص کے بارے میں لکھا جارہا ہے اس نے ایسے ماحول میں آنکھ کھولی۔ ایسے حالات میں پرورش پائی اس وجہ سے اس کے مزاج میں بے خوفی، مقصد کی لگن، ملک کی محبت جیسی خوبیاں لازمی طور پر پائی جائیں گی۔

سیاسی لیڈر بننے کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے ان میں سے اکثر سعید صاحب میں بڑے بڑے لیڈروں سے زیادہ موجود تھے اور پیدائشی طور پر ماحول بھی سیاسی ملا تھا۔ سیاست ان کے خون میں رچی بسی تھی۔ سعید صاحب کے یہاں جو بیباکیٔ اظہار اور جرأتِ گفتار کی خوبیاں تھیں وہ ایسے ہی ماحول کی دین تھیں۔ ان میں جو بے ریائی اور بے غرضی تھی وہ اسی عہد میں ان کے مزاج کا حصہ بنی تھی۔ سعید صاحب سیاست داں ضرور تھے لیکن انھوں نے سیاست کو کبھی کاروبار نہیں بنایا کیوں کہ بے ضمیری کے اجزائے ترکیبی ان کے ضمیر کا کبھی حصہ نہ بن سکے۔ وہ اس نسل کے سیاست دانوں کی آخری کڑی تھے جو سیاست کو خدمتِ خلق کا ذریعہ سمجھ کر سیاست کیا کرتے تھے۔ وہ ایسے سیاست داں تھے جو سیاست کو عبادت سمجھا کرتے تھے نہ کہ تجارت اور اس عبادت کے ذریعے روحانی مسرت حاصل کرتے تھے۔ اس کے کھلے ثبوت ایسے سیاست دانوں کے مالی اور معاشی

Marfat.com

حالات دیکھ کر بخوبی مل سکتے ہیں۔ سعید صاحب بھی اسی قماش کے سیاست داں تھے نہ تو ان کے پاس روپے پیسے کی ریل پیل تھی اور نہ حاشیہ برداروں کی چہل پہل بلکہ انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کے لیے کچھ اصول وضع کیے ہوئے تھے، جن پر وہ ساری زندگی سختی سے عمل پیرا رہے۔ انھوں نے مواقع ملنے کے باوجود بھی سیاست کو سستی شہرت اور دولت کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا۔ یہ خوبی انھیں اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی۔ چودھری برہم پرکاش جب دہلی کے چیف منسٹر ہوا کرتے تھے تو انھوں نے مجاہدین آزادی کو دہلی کے مختلف مقامات پر رہائشی پلاٹ بہت سستی قیمت پر فراہم کیے۔ سعید صاحب کے والد کو آج جہاں سندر نگر جیسا سندر علاقہ ہے، یہاں پر ایک پلاٹ کی پیشکش ہوئی تو سعید صاحب کے والد رشید خاں صاحب نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ میں نے جنگ آزادی میں کسی پلاٹ ملنے کی خاطر حصہ نہیں لیا تھا۔ اسی طرح ایک واقعہ سعید صاحب کے حوالے سے پیش کر رہا ہوں۔ گزشتہ سرکار میں کیبنٹ سطح کے وزیر جگموہن صاحب کسی زمانے میں ڈی ڈی اے کے چیئرمین بھی ہوا کرتے تھے اور اس زمانے میں ان کے اور سعید صاحب کے درمیان اچھی خاصی دوستی تھی۔ کیوں کہ جگموہن جی شاہ جہاں آباد پر کچھ کام کر رہے تھے اور یہی Subject سعید صاحب کی دلچسپی کا خاص میدان رہا تھا، اس لیے دونوں اس سلسلے میں اکثر ملا کرتے تھے۔ انھوں نے بھی ازراہِ دوست نوازی سعید صاحب کو تیمور نگر میں ڈی ڈی اے کے فلیٹ کی پیشکش کی۔ (یہ تیمور نگر فرینڈس کالونی کے سامنے اور کالندی کنج کے پاس واقع ہے) لیکن سعید صاحب نے بھی والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے معذرت کرلی۔ میرے خیال میں اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ ایک تو سعید صاحب یا ان کے والد ماجد سیاست کے ذریعہ دولت کمانے کو اصولی طور پر پسند نہیں کرتے تھے اور دوسری بڑی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہ حضرات شاہ جہاں آباد یا پرانی دلّی کو کسی حال میں خیرباد نہیں کہنا چاہتے تھے۔ دلّی کی اسی محبت کے حوالے سے اکبرالٰہ آبادی نے حضرت خواجہ حسن نظامی کے لیے یہ شعر کہا تھا:

حضرت ابوہریرہؓ سے بلّی نہ چھٹ سکی
خواجہ حسن نظامی سے دلّی نہ چھٹ سکی

Marfat.com

میری رائے میں یہ شعر بہت سے دلّی والوں پر صادق آتا ہے انھی میں سے ایک سعید صاحب اوران کے والد ماجد بھی تھے۔

شاہ جہاں آباد کی نئی منصوبہ بندی یا Re development Plan میں سعید صاحب کا بھی اچھا خاصہ یوگ دان رہا تھا۔ انھوں نے حکومت کوتحریری شکل میں بہت سی مفید تجاویز بھیجی تھیں۔ اس ضمن میں انھوں نے جگموہن جی اور خواجہ سعیدالشفیع کے ساتھ مل کر بڑے اہم سمینار بھی کرائے اوراس میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے دلّی سوسائٹی کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار بھی نکالا اور شاہ جہاں آباد کی منصوبہ بندی کو ایک تحریک کی شکل دے دی اور پرانی دلّی کے رہنے، بسنے والوں میں اس حوالے سے بیداری پیدا کی۔ یہ ان کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ شاہ جہاں آباد کے حوالے سے آج حکومت نے بہت بڑا منصوبہ بنایا ہے۔ مگر ابھی اس پر عمل درآمد ہونا باقی ہے۔ اور اس عمل درآمد کرانے کے لیے آج پھر ایک اور سعید خاں کی ضرورت ہے جو حکومتِ وقت کو جھنجھوڑ سکے اور عوام میں اس ضرورت کا احساس بیدار کر سکے۔

وہ جب کسی کتاب کا مطالعہ کرتے تو قلم اپنے پاس رکھتے۔ جہاں کہیں جو بات پسند آتی یا کارآمد پاتے تو اسے نوٹ کر لیتے۔ اس طرح مختلف موضوعات کے لیے ان کے پاس مواد جمع ہوتا رہتا۔ اسی طرح وہ اپنی تحریروں کو بھی ایسے دیکھتے تھے جیسے ایک کامیاب مصور اپنی بنائی ہوئی تصویروں کو دیکھتا ہے، جہاں کوئی کمی پاتا ہے موئے قلم سے اسے درست کر دیتا ہے۔ وہ ایک سطر کو لکھ لکھ کر کئی بار کبھی ہلکی کبھی تیز آواز کے ساتھ ایسے دہراتے تھے جیسے کوئی عامل بھوت اتارنے کے لیے منتر پڑھ رہا ہو۔

ان کے پاس دہلی کی تہذیب وثقافت کے حوالے سے اقوام متحدہ کی سروے رپورٹ سے لے کر اردو کی قدیم سے قدیم کتاب موجود تھی اور یہ ساری کتابیں انھوں نے بڑی کاوش سے اکٹھا کی تھیں، جس میں کچھ تو انھوں نے اپنی زندگی ہی میں کسی لائبریری کو دے دی تھیں اور کچھ ان کے پاس ہی تھیں۔

لکھنے کا تذکرہ ہو رہا ہے تو سعید صاحب کی ایک اور عادت کا ذکر بھی کرتا چلوں اور وہ یہ کہ انھیں اپنے روزمرہ کے حالات اور معمولات لکھنے کا شوق تھا اور وہ پابندی کے ساتھ

Marfat.com

اپنی ذاتی ڈائری قلم بند کیا کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں قریب چالیس سال کی یادوں پر مشتمل ڈائریاں ہوں گی جو یقیناً بے شمار کام کی اور بڑے پتے کی باتوں سے مزین ہوں گی، بشرطِ اگران ڈائریوں تک ان کے اہلِ خانہ مطالعہ کرنے کی اجازت دے سکیں۔

سعید صاحب ایک دردمند اور رحم دل فطرت کے مالک تھے۔ وہ ساری زندگی اپنی طاقت بھرلوگوں کی مدد کرتے رہے۔ کسی کی روپے پیسے سے، تو کسی کی ملازمت دلا کر۔ کسی کو ضروریاتِ زندگی فراہم کرکے، کسی کے لیے تعلیم کا بندوبست کرکے اور کبھی کسی غریب اور نادارلڑکی کی شادی کرا کے۔ غرض نہ جانے کس کس طرح وہ لوگوں کے کام آتے تھے۔ ان کا دل انسانی ہمدردی سے معمور تھا۔ وہ کسی کی پریشانی دیکھ کر پریشان ہو جاتے تھے اور ایک کرب کی سی کیفیت ان کے اندر پیدا ہو جاتی تھی۔ لیکن ان کی زندگی کے اس پہلو کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ صرف انہی کو اس کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے جنھیں ان کے بہت قریب رہنے کا موقع ملا ہو اور جو ان کے مزاج سے پوری واقفیت رکھتے ہوں، دوسرے اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے کیوں کہ سعید صاحب اپنی زندگی کے اس پہلو کو ہمیشہ پوشیدہ رکھتے تھے۔ ان کی یہ عادت تھی کہ کوئی ان کے سامنے جا کر اپنی پریشانی کا اظہار کردے وہ یا تو اس کی سفارش کردیا کرتے تھے یا اسے خط لکھ کر دے دیا کرتے تھے۔ کبھی ٹیلی فون کرکے اس کی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ کبھی کام کی نوعیت اور نزاکت کو سمجھتے ہوئے ضرورت مند کے ساتھ خود جایا کرتے تھے اور ضرورت پڑنے پر بہت سوں کی خاطر بڑے سے بڑے افسر سے لڑائی مول لے لیا کرتے تھے۔

سعید خاں کٹر قسم کے مذہبی آدمی نہیں تھے لیکن وہ اسلام کے آفاقی پیغام اور دینی اساس کو زندگی کے لیے لازم و ملزوم بھی سمجھتے تھے۔ البتہ مذہب کے ٹھیکے داروں کو وہ ہمیشہ ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھتے تھے اور بالخصوص ایسے لوگوں کو جو مذہب کو ذاتی مفاد کے حصول کا ذریعہ بنا کر مذہب کے ذریعے سوداگری کرکے اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ تنگ نظر مولویوں سے وہ ہمیشہ بیزار رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ مذہب کا ایک محدود سا تصور پیش کرتے ہیں جو اسلام کی آفاقیت کی روح کے منافی ہے۔ سرسید اور اقبال ان کی مثالی شخصیات تھیں۔ صوفیائے کرام کے اندازِ تبلیغ کو وہ اسلام کی اشاعت و ترویج کے لیے

مثالی انداز مانتے تھے اور اکثر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت امیر خسروؒ اور حضرت شیخ کلیم اللہ شاہ جہاں آبادیؒ کے مزارات پر حاضری بھی دیا کرتے تھے۔ شیعہ سنّی کے تفرقہ کو وہ مضحکہ خیز سمجھتے تھے اور سخت ناپسندیدگی کا اظہار کرتے تھے۔

بے باکی، صاف گوئی، محنت اور جفاکشی، خلوص و صداقت، روشن خیالی اور کشادہ دلی ان کے مزاج کی جزو لاینفک خوبیاں تھیں۔ جو کچھ ان کے دل میں ہوتا تھا بڑے سے بڑے دِگج کے سامنے بے خوف و خطر منہ پر کہہ دیا کرتے تھے بلکہ میں نے تو یہ دیکھا ہے جب ان کے سامنے والا زیادہ طاقت ور اور زیادہ صاحبِ حیثیت یا صاحبِ اقتدار ہوتا تھا تو اپنی صاف گوئی اور بے باکی کا اظہار وہ کچھ زیادہ ہی کیا کرتے تھے۔ مرعوب ہونا انھوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ کتنی سخت بات ہو، نتیجے سے بے پروا ہو کر اس کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اس عادت کی وجہ سے انھیں بہت مرتبہ نقصانات بھی اٹھانے پڑے لیکن انھوں نے اسے کبھی اہمیت نہ دی۔ ان پر کسی امارت، منصب، مرتبے یا عہدے کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا بلکہ موقع آنے پر انھوں نے ایسے حضرات کو ہمیشہ آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ اس ضمن میں بہت سے نام اور واقعات بیان کیے جاسکتے ہیں لیکن ازراہِ مصلحت ذکر کرنا مناسب نہیں ہے کیوں کہ بقولِ شاعر:

افسوس کیسے کیسے سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

ان کی شخصیت میں ایک قسم کی سختی ضرور تھی لیکن یہ ان لوگوں کے لیے ہوتی تھی جو ان پر رعب ڈالنے کی کوشش کیا کرتے تھے ورنہ تو وہ بڑے مہذب انسان تھے۔ ملنے جلنے میں انھیں آداب اور حفظِ مراتب کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اپنے چھوٹوں تک کی بہت عزت کرتے تھے۔ ظاہری نمود اور دکھاوے کی ٹیپ ٹاپ سے وہ کوسوں دور تھے۔ تصنع سے دور بھاگتے تھے۔ قرینہ اور شائستگی کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ ریاکاری سے انھیں ازلی چڑ تھی یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت میں سادگی اور نفاست پسندی کا متوازن امتزاج ملتا ہے۔

ان کے مزاج میں ایک خاص طرح کی طرحداری تھی، جس میں بانکپن کے ساتھ

Marfat.com

شگفتگی اور تازگی بھی شامل تھی۔ لیے دیے رہنے کے انداز نے ان میں ایک منفرد آن بان پیدا کر دی تھی۔ ان کے مزاج میں تیکھے پن کے باوجود دبی دبی شوخی کا رنگ بھی جھلکتا تھا۔

ان کا دمکتا اور مسکراتا چہرہ ان کی سرمگیں اور مستعد آنکھیں گہری سانولی رنگت ہونے کے باوجود کشش اور جاذبیت رکھتی تھیں۔ سانولے چہرے پر ہنستے وقت موتیوں کی لڑی جیسی چمکتی بتیسی، سلیقے سے ترشے ہوئے چھوٹے چھوٹے بال، بالوں پر خضاب کی چمک، کشادہ پیشانی، درمیانی ناک اور کان، لمبی لمبی ٹانگیں اور لمبے ہاتھ۔ اکہرہ اور چھریرا بدن، سرو قامت، ہمیشہ ورق دم لباس، لباس میں سفید کھدر کا اسمارٹ کرتا، پتلی موری کا سفید پائجامہ، متانت بھری چال۔ ان اوصاف کے ساتھ وہ سو فیصدی آئیڈیل سیاسی شخصیت نظر آتے تھے۔ دیکھنے والا نظر پڑتے ہی مرعوب ہو جاتا تھا۔ اس پر طرہ ان کی باڈی لینگوئج بھی ایسی تھی جو سونے پر سہاگے کا کام کرتی تھی اور بچی کھچی کسر ان کا تیکھا اندازِ گفتگو پوری کر دیا کرتا تھا۔ یعنی ان کی شخصیت میں سیاسی وجاہت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ میں نے بے شمار موقعوں پر بڑے بڑے لیڈروں سے ان کو بات کرتے دیکھا ہے کیا مجال جو ان میں کسی طرح کی کسی کی کوئی مرعوبیت پائی گئی ہو یا کوئی احساسِ کمتری نظر آیا ہو۔ اس کے برعکس ہر لیڈر ان کو بڑی عزت اور احترام سے مخاطب کیا کرتا تھا۔ کبھی سعید صاحب کہہ کر اور کبھی سعید بھائی کہہ کر اور سعید صاحب بھی بڑے سلیقے سے دوٹوک الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا کرتے تھے۔ سننے والا بڑے غور اور انہماک سے ان کی گفتگو سنا کرتا تھا۔ میں اس خوبی کو ان کی ظاہری اور باطنی شخصیت کا کمال سمجھتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے انھیں بڑی فیاضی کے ساتھ عطا کیا تھا۔

سعید صاحب حد درجہ مہمان نواز تھے۔ ان کی مہمان نوازی میں ایسی صداقت اور خلوص تھا جو بہت کم لوگوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ مہمان کی خاطر مدارات میں وہ کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔ اکثر ایسا بھی دیکھا گیا کہ لذتِ کام و دہن کی آزمائش میں تمام سالن نذرِ مہمان ہو گیا مگر کیا مجال جو سعید صاحب یا رئیسہ بھابی کے ماتھے پر کبھی کوئی شکن آئی ہو۔ مہمان نوازی اور وہ بھی گرمجوشی اور خوشدلی کے ساتھ ان کے مزاج کا بنیادی عنصر تھا۔ اور اس روایت کو مرحوم نے نہ صرف مرتے دم تک بلکہ مرنے والے دن تک نبھایا۔ قورمہ،

بریانی، مچھلی، کوفتے، ہری مرچ قیمہ اور پائے ان کے پسندیدہ کھانے تھے۔ ان میں بریانی اور مچھلی کا سالن انھیں کمزوری کی حد تک پسند تھا۔

سعید صاحب نے شعور کی آنکھیں کھول کر جن سیاست دانوں کو دیکھا اور جن سے وہ متاثر ہوئے ان میں سے اکثر و بیشتر کا تعلق پرانی نسل کے سیاست دانوں سے ہے۔ ان میں مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی، آصف علی بیرسٹر، ارونا آصف علی، جگل کشور کھنہ، چودھری برہم پرکاش، لالہ شام ناتھ، میر مشتاق احمد، سبھدرا جوشی، بیرسٹر نورالدین احمد اور شیو چرن گپتا شامل ہیں۔ اس کے علاوہ قومی سطح کے کچھ رہنماؤں سے تو سعید صاحب کے تعلقات کی نوعیت قربت اور اپنائیت کی ہو گئی تھی۔ ان میں آئی کے گجرال، چندر شیکھر، سکندر بخت، وی پی سنگھ، ملائم سنگھ، عارف محمد خاں اور کئی دوسرے لوگوں کے نام گنائے جاسکتے ہیں۔ لیکن سعید صاحب نے اپنی قربت اور دوستانہ نسبت کا نہ تو کبھی کوئی ڈھنڈورا پیٹا نہ کبھی کوئی مالی منفعت حاصل کی اور نہ ہی کبھی حاشیہ برداری کی بلکہ ان تعلقات میں اپنی خودداری اور عزتِ نفس کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔

سعید صاحب ایک وطن پرست ہندوستانی ہونے کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کے بھی فرد تھے اور اس حیثیت سے وہ بڑے حساس واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے سینکڑوں بار برملا اس بات کا اظہار کیا کہ ان کی زندگی کا سب سے زیادہ تکلیف دہ واقعہ جس نے ان کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا وہ ملکِ عزیز کی تقسیم تھی۔ اور وہ بھی مذہبی بنیادوں پر۔ ان کے خیال میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اس سے زیادہ بدقسمتی کا واقعہ گزشتہ صدی میں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ تقسیمِ ملک کے وقت کی یادوں اور باتوں کو بیان کرتے وقت اکثر روہانسے ہو جاتے تھے۔ کیسے کیسے لوگ کیسے کیسے خاندان راتوں رات ہجرت کر کے چلے گئے تھے، کس طرح دیکھتے ہی دیکھتے خاندان کے خاندان تقسیم ہو گئے تھے وغیرہ وغیرہ۔

سعید صاحب نے ملک تقسیم ہونے کی وجہ سے پہنچنے والی اذیت کے ازالے کے لیے اور اس سے پیدا ہونے والے زخموں کی مرہم کاری کے لیے ایک مشن کو اپنا نصب العین بنالیا تھا اور اپنی ساری سیاست کو صرف اسی ایک نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے اپنی سیاست کو محدود کر کے اپنی ساری طاقت اسی مقصد کے حصول میں جھونک دی تھی۔

Marfat.com

سعید صاحب کا یہ نصب العین ہندو پاک کی دوستی تھی۔ ایسی دوستی جو نفرتوں کی دیواریں توڑ کر حقیقی محبت کی بنیادوں پر استوار ہو۔ جو ٹوٹے دلوں کو جوڑے اور بچھڑوں کو ملانے میں معاون و مددگار ثابت ہو سکے۔ اپنے اس مشن کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے انھوں نے سارے جتن کیے۔

آج سے پینتالیس سال پہلے انھوں نے ہندو پاک پریم سبھا کی بنیاد ڈالی۔ اُس زمانے میں اس پلیٹ فارم پر لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے انھوں نے جب اس پریم سبھا کے اغراض و مقاصد بیان کیا تو احباب نے اس مشن کو دیوانے کا خواب سمجھ کر زیادہ اہمیت نہ دی۔ پھر بھی سعید صاحب نے ہمت نہ ہاری اور بددلی کو غالب نہ آنے دیا۔ بلکہ پہلے سے زیادہ مضبوط ارادے کے ساتھ پھر سے کمر بستہ ہو گئے۔ روزانہ دو چار لوگوں سے ملاقاتیں کرتے اور انھیں اپنے مشن کی افادیت اور اہمیت کے بارے میں بتلاتے۔ آخر کار آہستہ آہستہ نیت ثابت منزل آسان کے مصداق لوگ آتے گئے اور قافلہ بنتا گیا اور یوں اس کارِ خیر کو انجام دینے کے لیے سیاست سے وابستہ، میڈیا سے وابستہ کچھ رائٹر کچھ ادیب غرض اچھے خاصے لوگ اس مشن کو آگے بڑھانے میں شامل ہو گئے۔

آج ہم سب مرحوم سعید خاں کی اس رائے سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن اس حقیقت کو وقت نے صحیح ثابت کر دیا ہے۔ آج وہ وقت آ چکا ہے کہ نہ صرف ہندوستان و پاکستان کو بلکہ دنیا کے تمام مہذب ملکوں کو ان دونوں ممالک کے درمیان امن و آشتی کی فضا سے پوری پوری دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ دنیا کا ہر ملک ان دونوں کے درمیان پیدا ہونے والے خوشگوار ماحول کو پسندیدگی کی نظر سے سراہتا رہا ہے۔ اس ضمن میں سعید صاحب کی طرح کوئی ملک دوا کر رہا ہے تو کوئی ملک دعا کر رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے گویا سعید صاحب نے بارگاہِ ایزدی میں جا کر اس مشن کی کامیابی کے لیے دعا بھی کی ہے اور دہائی بھی دی ہے۔ بزرگوں نے بجا فرمایا ہے کہ "نیت گیل برکت ہوتی ہے"۔ سعید صاحب کا مشن اپنی کامیابی کے لحاظ سے آج حقیقت کے جتنا قریب ہے اس سے پہلے اتنا قریب شاید کبھی نہیں ہوا تھا۔

اپنے مشن کو لے کر سعید صاحب ہندو پاک دوستی کے حوالے سے جب کبھی بھی کوئی

Marfat.com

پوسٹر نکالتے تھے تو ان کے ہر پوسٹر کے آخر میں ایک جملہ ضرور شامل ہوتا تھا اور وہ جملہ تھا ''آؤ دعا کو ہاتھ اٹھائیں''۔

آج کے خوشگوار حالات اور امید افزا ماحول میں ہندوپاک دوستی جو کل تک سعید خاں جیسے دیوانے کا خواب سمجھی جاتی تھی آج حقیقت میں بدلنے کے بہت قریب نظر آرہی ہے۔ مرحوم کی روح کو مسرور کرنے اور خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے اور ان کے مشن کی پوری طرح کامیابی کے لیے آیئے آج ہم سب بھی دعا کو ہاتھ اٹھائیں تا کہ سعید صاحب کا خواب حقیقت میں بدل سکے۔ بقول میر تقی میر:

بارے دنیا میں رہو، غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

□□

پروفیسر محمد مجیب

بات ابھی کل کی ہے مگر آج کہی جائے تو جھوٹ لگے گی۔ اسی شہر اور اسی نواح میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کی شاید ہر بات آج بے سر پیر کی اور دیوانے پن کی سی لگے گی۔ فرقہ وارانہ کشمکش کے عروج کے دنوں میں جب جامعہ ملیہ نشانے پر رہتی تھی ہماری پارلیمنٹ کا ایک رکن سوال کرتا ہے کہ جامعہ میں مسلم اور غیر مسلم اساتذہ کا تناسب کیا ہے۔ سوال وزارتِ تعلیم کی جانب سے شیخ الجامعہ کو بھیجا جاتا ہے۔ عرصے تک کوئی جواب نہیں جاتا، پھر خود وزیر تعلیم کے اصرار پر جواب دیا جاتا ہے: ہمارے ہاں طالب علم اور استاد ہوتے ہیں، مسلم اور غیر مسلم نہیں ہوتے۔ پارلیمنٹ کا سوال تھا معاملہ یوں کیسے ختم ہو جاتا۔ پھر پوچھا گیا داخلے کے فارم میں مذہب کا کالم دیکھ کر اعداد و شمار بتایئے۔ جواب جاتا ہے: ہمارے داخلے کے فارم میں مذہب کا خانہ نہیں ہوتا۔ یہ بات بھی قابلِ اطمینان نہ پائی گئی اور پھر پوچھا گیا کہ رجسٹروں میں نام تو لکھے ہوتے ہیں، انھیں دیکھ کر الگ الگ شمار کیجیے۔ کہا گیا: اساتذہ و طلباء کی ساری فہرستیں آپ کو بھیج سکتے ہیں۔ اگر کسی کے نام سے اس کے عقیدہ کا پتہ چل سکتا ہو تو آپ خود ہی زحمت کریں، ہم معذور ہیں۔

یہ شیخ الجامعہ تھے پروفیسر محمد مجیب۔ انکسار، شائستگی اور تحمل میں جن کا ثانی مشکل ہی سے ہوگا اور عزتِ نفس اور اعلیٰ اصولوں کی پاسداری میں بھی ہمیشہ سر اونچا رکھنے کے عادی۔ اس طرح کے نہ جانے کتنے واقعات ہیں جنھوں نے ہر اس فرد اور اس ادارے کا وقار بلند کیا جس سے مجیب صاحب کا تعلق تھا۔ وہ اپنی تمام انفرادیت کے ساتھ ایک عہد کی عظمت کی علامتوں میں تھے۔ جب کبھی آزادی کی جدوجہد کا رزمیہ لکھا جائے گا تو اس

Marfat.com

میں ایسے لوگ بھی بہت ہوں گے جو اپنے گوشوں میں بیٹھے ہوئے خاموشی کے ساتھ تعلیم و تربیت کے ذریعے نئی نسلوں کو ملک کی تعمیر کی ایک بڑی جدوجہد کے لیے تیار کر رہے تھے جو آزادی کے بعد دراصل شروع ہونے والی تھی: انسانیت کے اقدار کی بقا کی جدوجہد۔

مجیب صاحب ایک آرٹسٹ کا مزاج لے کر پیدا ہوئے تھے، حسن کے شیدائی تھے۔ شاعری، موسیقی، مصوری، مجسمہ سازی کے رمز آشنا تھے اور گہری تنقیدی نظر رکھتے تھے۔ مشرق و مغرب کے عالمی شہرت رکھنے والے فن کاروں کے بارے میں اہلِ مذاق کے ساتھ دیر تک گفتگو کرتے رہتے تھے۔ اور ان کے پاس بیٹھنے والے بھی ان کی باتوں سے تھوڑا بہت سیکھ لیتے تھے۔ کوئی کتاب یا مضمون لکھتے تھے تو وہ آج کل کے بہت سے بے بضاعت ادیبوں کی طرح شائع کرانے کے لیے بے چین نہیں رہتے بلکہ اشاعت سے پہلے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دکھا کر ان کی رائے معلوم کرتے اور محض تعریف کرنے والوں کا ہمیشہ مذاق اڑاتے۔ وہ چاہتے تھے کہ سنجیدہ مسائل پر بے لاگ بحث کی جائے۔ سلیقے اور حسن پسندی نے کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ان کے گھر کے حدود میں قدم رکھیے تو لگتا جیسے اچانک گلاب کے رنگوں کی یلغار ہونے لگی۔ قدرت نے اپنے حسن کا سارا خزانہ گویا 'نسیم باغ' میں لٹا دیا تھا۔ اسی خطے میں دوسرے کنارے پر ایک اور دروازے سے داخل ہوئیے تو دور تک اونچے اونچے پرانے درخت، بیلیں، گپھائیں، جھاڑیاں اور ان میں چڑیوں کے چہکنے سے اس جنگل کی خاموشی کے درمیان ایک سنگیت کا عالم۔ چمن بندی کے شوق کے ساتھ قدرت کی عطا کی ہوئی کھلی فضاؤں اور وسعتوں کا احترام ہم نے مجیب صاحب کے ارد گرد ہی دیکھا۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے اور پھر سارے کاموں سے فارغ ہو کر شام کو سورج ڈوبنے تک وہ اسی ماحول میں ٹہلتے ہوئے اکثر باغبانی کا کوئی اوزار ہاتھ میں لیے ہوئے پائے جاتے تھے۔ ایک بار ایک صاحب آئے اور کہنے لگے کہ ہم نے Bonsai کی بڑی اچھی نمائش دیکھی ہے۔ پیپل، برگد اور بعض اور بڑے بڑے پیڑوں کو بہت چھوٹا کر کے ذرا ذرا سے گملوں میں سجایا گیا ہے۔ بڑے عجیب و غریب اور ناقابلِ یقین لگتے ہیں۔ مجیب صاحب کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ کہنے لگے: کیا ظلم ہے جنھیں قدرت نے کھلی ہوا میں پلنے، بڑھنے، پھیلنے اور سایہ دینے کے لیے بنایا تھا، انھیں خود اپنی

Marfat.com

اوقات کے برابر حقیر بنادینا اور اس پر خوش ہونا کتنی شرمناک بات ہے۔ جو صاحب Bonsai کی نمائش کی تعریف کررہے تھے وہ مجیب صاحب کے دوست اور خود بہت اہم آدمی تھے، سناٹے میں آگئے۔

مجیب صاحب دولت کی ریل پیل میں پلے بڑھے تھے۔اودھ کے ایک خوشحال زمیندار خاندان میں عیش وعشرت کے جو وسائل وافر ہوا کرتے تھے وہ سب ان کی دسترس میں تھے۔ پھران کے والد چودھری محمد نسیم صاحب لکھنؤ کے سب سے کامیاب اور باا ثر قانون دانوں میں تھے۔ ان جیسے لوگوں کے شاندار ایوانوں کے اندر کی زندگی آج لکھنؤ کے بیتے ہوئے دنوں کی کہانیوں کا باب بن چکی ہے۔ مجیب صاحب نے دولت اور عیش و عشرت کو تو عنفوانِ شباب میں ہی خیر باد کہہ دیا تھا جب عام طور سے لوگ اس کی تمنا کرتے ہیں مگر شائستگی، علم اور نام ونمود میں خود ان کی اپنی ذات کی بدولت اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آکسفورڈ اور جرمنی میں تعلیم مکمل کرہی چکے تھے کہ یورپ میں ہی حکیم اجمل خاں سے ملاقات ہوئی۔ اور ذاکر صاحب اور عابد صاحب کے ساتھ انھوں نے بھی عہد کیا کہ ملک واپس جاکر ساری عمر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیے وقف کردیں گے۔ چنانچہ وہ جامعہ کے ان حیاتی اراکین میں تھے جنھوں نے عہد کیا کہ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو روپے بطور تنخواہ قبول کریں گے۔ مگر جامعہ کی حالت کے پیشِ نظر عملاً عام طور سے انھیں پچاس روپے ملتے تھے اور وہ بھی بسا اوقات مہینوں بعد نصیب ہوتے۔ مگر خیر! اس پہلو کا تو ذکر کرنا ہی غلط ہے کہ ان کی زندگی میں سب سے کم حیثیت پیسے کی تھی۔

جرمنی ہی میں انھوں نے طباعت کا کام سیکھا اور دیوانِ غالب کا پہلا سب سے خوبصورت اور غالب کے شایانِ شان ایڈیشن وہیں سے شائع کرایا۔ اس میں سب سے اہم اور بیش بہا غالب کی وہ تصویر ہے جو آج تک سب سے زیادہ مقبول ہے۔ یہ تصویر ایک جرمن مصور سے بنوائی تھی۔ انھوں نے اور ذاکر صاحب نے اس مصور کو غالب کے خطوط اور ان کا کلام سنایا اور سمجھایا تاکہ ان کی بنا پر وہ غالب کی شکل وصورت کا ایسا تصور قائم کرسکے جو ان کی اصل سے قریب تر ہو۔ یہ تصویر ان لوگوں کی غالب شناسی کا عجیب و غریب کرشمہ ہے۔

Marfat.com

مجیب صاحب انگلستان بہت کم عمری میں ہی گئے تھے۔ جب واپس آئے تو اردو تقریباً بھول چکے تھے۔ جامعہ میں آنے کے بعد پھر سے اردو کی طرف راغب ہوئے اور پھر رفتہ رفتہ تصنیفی وتالیفی سرگرمیاں بڑھتی گئیں یہاں تک کہ جلد ہی اردو کے صاحبِ طرزِ عملی نثر لکھنے والوں میں نمایاں ہوگئے۔ اور اس حیثیت سے ان کا نام ہمارے ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ خوش مذاقی مطالعے کی وسعت، فنونِ لطیفہ سے خصوصی شغف اور پھر شخصیت کا بے پایاں خلوص اور سادگی، سب نے مل کر ایک ایسے وجود کی نشوونما کی، جس کا اظہار ہر اس شے میں ہوتا تھا جو ان سے وابستہ تھی۔ ان کے علمی کارناموں کا پورا احاطہ تو وہی کر سکتا ہے جسے ان سارے موضوعات پر دسترس ہو جن پر انھوں نے لکھا۔ اردو میں ان کی ضخیم کتابوں میں تاریخ فلسفہ سیاسیات، تاریخِ تمدنِ ہند، روسی ادب کی تاریخ، متعدد مضامین، ڈرامے، افسانے، ترجمے اور ان کے علاوہ انگریزی کی کئی کتابیں جن میں Indian Muslims دنیا بھر کے علمی حلقوں میں ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ وتمدن پر مستندترین کتابوں میں مانی جاتی ہے اور اس کے کچھ فقرے تو پڑھنے والوں کی یادداشت میں محفوظ ہوگئے ہیں۔ نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام دہلی آئے تو مجیب صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ مجیب صاحب بیماری کے اثرات سے گزر رہے تھے، بات کرنے کے قابل نہیں تھے مگر عبدالسلام صاحب یہ کہہ کر ان کے پاس جاکر بیٹھے کہ جس نے ایسی کتاب لکھی ہے اسے دیکھ تو لوں۔ مگر ان میں سے زیادہ تر کتابیں جن سخت حالات میں لکھی گئیں ان کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ پچاس ساٹھ برس پہلے جب جامعہ نگر میں نہ بجلی تھی نہ پانی، لالٹین کی روشنی اور ہاتھ سے جھلے جانے والے بانس کے پنکھے کی ہوا میں ہزاروں صفحے جو لکھے گئے ان کے بغیر اس عہد کے اردو ادب کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

مجیب صاحب کا رجحان ابتدا سے ہی تصوف کی طرف تھا۔ جو دھیرے دھیرے بڑھتا گیا۔ زندگی میں سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود ساری ظاہری وآرائشی چیزوں سے اجتناب، آرام وآسائش کے سارے وسائل سے خود کو دور کرتے رہنے کی کوشش، علم وتعلیم کے ذریعے دوسروں کی خدمت اور اسی تپاک کی زندگی میں ہر لمحہ ایک عجیب سی سرشاری و سرخوشی کے عالم میں رہنا ان کا مزاج بن گیا تھا۔ اسی کیفیت میں انھوں نے حضرت مریم

Marfat.com

اور حضرت عیسیٰ کا ایک مجسمہ بنا کر ہولی فیملی اسپتال کو تحفے میں دیا جو وہاں اب بھی سب سے نمایاں جگہ پر آویزاں ہے۔ مجھ سے ایک بار انھوں نے پوچھا کہ تمھارا اس مجسمے کے بارے میں کیا خیال ہے۔ میں نے کہا اس میں مجھے ایک بات کچھ عجیب سی لگی۔ وہ کچھ اور سنجیدہ ہو گئے تو میں نے کہا کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ ماں کے قدموں سے اس کا بیٹا لپٹ رہا ہے، مگر ماں اپنے بیٹے کی طرف توجہ کرنے کی بجائے کہیں دور دیکھ رہی ہے۔ یہ کچھ ماں کی فطرت کے خلاف ہے۔ انھوں نے جواب دیا" ماں نے ہونے والے پیغمبر کو جنم دیا ہے اس کی نظر میں ساری انسانیت ساری کائنات ہے وہ صرف اپنے بچے کی طرف توجہ نہیں کر سکتی"۔

ان کا مجسمہ سازی کا شوق محض وقت گزاری کا بہانہ نہیں تھا۔ اس کے پیچھے بھی جدید و قدیم اور مشرق و مغرب کا ایسا توازن بھی ان لوگوں کے ہاں مشکل سے ہی ملے گا، جن کی تعلیم و تربیت زیادہ تر مغربی اثرات کے تحت ہوئی ہو۔ مجیب صاحب نے انگلستان جانے سے پہلے بھی لکھنؤ اور دہرہ دون کے انگریزی اسکولوں اور انگریز اساتذہ کی نگرانی میں عمر کے ابتدائی برس گزارے اور پھر یورپ میں تو ان کا واسطہ ان ہی لوگوں سے رہا۔ ویسے یہیں ان میں اپنی مشرقی روایات اور اقدار کے بارے میں تجسس پیدا ہوا، اس کے علاوہ ان کے گھر کے ماحول اور پھر جامعہ کی زندگی نے اس پر اور جلا کی۔ چنانچہ مغربی اور مشرقی نظامِ اقدار سے ان کی آشنائی سچی تھی۔ وہ خود دونوں قسم کے تجربات سے گزرے تھے اس لیے ان کے طرزِ فکر اور طرزِ زندگی میں ایک توازن آ گیا۔ اپنے ملک، مذہب اور قوم کے تاریخی ورثے کی علمی تحقیق اور اس سے جذباتی لگاؤ کے ساتھ ساتھ وہ جدید عہد کے تمام تقاضوں سے واقف، مغرب کی خوبیوں کے قائل تھے اور وہاں کے دانشوروں اور اداروں سے مسلسل رابطہ رکھتے تھے۔ وہاں بھی وہ احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ جرمن زبان و ادب پر ان کو جو عبور تھا، وہاں کے فنونِ لطیفہ کی باریکیوں پر جو ان کی نگاہ تھی اس کے قدردان مغرب میں خصوصاً جرمنی میں بہت تھے اور اب بھی ہیں۔

ان جیسے دبلے پتلے چھوٹے سے قد والے انسان کو قدرت نے بلا کی قوتِ ارادی بھی عطا کی تھی اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب ان کے دماغ پر فالج کا شدید حملہ ہوا۔ اپنے

تاریخ کے طالب علموں کو دہلی کی ایک قدیم عمارت میں لے گئے، وہاں لیکچر کے دوران اچانک ان کی یادداشت جاتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ لوگوں کو پہچاننا بھول گئے۔ یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس وقت وہ کہاں تھے۔ اسپتال لائے گئے۔ فوراً دماغ کا آپریشن کیا گیا، جب گھر آئے تو معلوم ہوا کہ دماغ کی ساری قوتیں ختم ہو چکی ہیں، نہ اپنے گھر کو پہچانتے ہیں نہ بیوی بچوں کو۔ بولنے کی صلاحیت بھی سلب ہو چکی ہے۔ جس شخص کی تمام عمر زبان وقلم کے گرد گردش کرتی رہی ہو، اس پر تو جو گزری ہوگی سو گزری ہوگی مگر انھیں دیکھنے والوں کی حیرت اور دکھ کا بھی آج اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی انھوں نے بچوں کی طرح دھیرے دھیرے آوازیں نکالنا سیکھا۔ الف۔ بے اور ABC لکھ لکھ کر پھر سے لکھنا اور پڑھنا سیکھا۔ یہ مشق وہ شروع میں صرف چند سیکنڈ کر سکتے تھے اور تھک جاتے تھے۔ پھر یہ وقت بڑھتا گیا اور دو سال کے اندر انھوں نے پہلے کی طرح پھر لکھنا پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے میری دنیا، میرا دین جیسا مضمون لکھا، جس میں اپنا خاکہ وہ خود یوں پیش کرتے ہیں:

> ''میں قد میں چھوٹا، شکل میں معلوم نہیں کیسا۔ پیچش میں بچپن سے مبتلا، دنیا کے کئی ملکوں میں پھرتا رہا، اور تہذیبوں کا شوق اور لطف اٹھاتا رہا۔ میں کیوں پیدا ہوا، میں نہیں کہہ سکتا۔ اور پیدا ہونے کے بعد مجھے مرجانا چاہیے تھا، اس لیے کہ خاندانی بیماریاں تھیں۔ لیکن ایک ہومیوپیتھ کا اصرار تھا کہ میں بچ جاؤں''۔

□□

Marfat.com

نازش انصاری

شہرِ علم و دانش علی گڑھ کے اپر کورٹ میں آج سے ساٹھ سال پہلے ایک نابغۂ روزگار شخصیت نے آنکھیں کھولیں جس کا نام والدین نے فتح محمد رکھا تھا جو آگے چل کر نازش انصاری کے قلمی نام سے مشہور ہوا۔ نازش انصاری کا آبائی وطن دہلی ہے۔ ان کے اجداد فراشخانہ اور سرائے خلیل میں رہا کرتے تھے۔ تقسیم ہند سے پہلے ان کے والد نے علی گڑھ میں رہائش اختیار کر لی اور وہیں تالا سازی کا کارخانہ لگا لیا جو ان کی سسرال بھی تھی۔

نوجوانی میں نازش صاحب نے مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کی جدوجہد میں سرگرم حصہ لیا اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ان پر دوسری چیزوں کے علاوہ مارپیٹ کرنے اور اس وقت کے وائس چانسلر علی یاور جنگ کی انگلیاں توڑنے کا الزام بھی تھا۔ اس زمانے میں وہ علی گڑھ سے ہی اپنا اخبار ''نئے زاویے'' ہفت روزہ ''انحراف'' اور ''دشمن'' وغیرہ نکال رہے تھے جس کے خود ہی سب کچھ تھے۔ وہ ایمرجنسی کے دوران دہلی آ گئے اور یکے بعد دیگرے مختلف ماہناموں سے وابستہ ہوئے اور کئی ماہناموں کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ جن میں بیسویں صدی، محل، روبی، تیز گام، فلمی ستارے، گلفام، آتش گل اور خواب محل قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں ہفت روزہ سیکولر قیادت سے وابستہ ہوئے اور آخری دنوں تک اس سے وابستہ رہے۔

نازش صاحب سے میری پہلی ملاقات حاجی انیس دہلوی مرحوم کے ماہنامہ فلمی ستارے کے دفتر میں ہوئی۔ یہ ۸۸۔۱۹۸۷ء کی بات ہے۔ نازش صاحب اپنی شادی کے جوڑے کی خریداری کے لیے برائے مشورہ ان کے پاس آئے تھے۔ اس وقت نازش

Marfat.com

صاحب جرائم کے ایڈیٹر تھے۔اس کے بعد اکثر و بیشتر ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ۱۹۹۷ء میں میں بھی سیکولر قیادت سے وابستہ ہوا تو روزانہ پانچ چھ گھنٹے ان کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا موقع ملتا رہا اور ان کی شخصیت کی خوبیاں دھیرے دھیرے مجھ پر منکشف ہوتی رہیں۔ وہ بڑے بے باک اور ذہین صحافی تھے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کہنے اور سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے فن میں طاق تھے۔ اردو زبان و ادب اور تہذیب کے بڑے والا اور شیدا تو تھے ہی اس کی ثقافت اور تمدن پر بھی جان چھڑکتے تھے۔ اردو صحافت میں چمک دمک اور گلیمر کے موضوع پر ان سے جب کبھی بات ہوئی انھوں نے سلامت علی مہدی مرحوم کا نام ضرور لیا کہ اردو صحافت کو گلیمرائز کرنے میں سلامت صاحب کا رول ناقابلِ فراموش ہے۔ اردو کی ترویج و ترقی، اس کے قارئین کی دلچسپی، اردو اخبار و رسائل کی سرکولیشن اور اس کے پھیلتے سمٹتے دائروں پر اکثر گھنٹوں گفتگو ہوا کرتی تھی۔ وہ ریڈر شپ کو بڑھانے کے لیے شمع گروپ کی تقلید کے قائل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بچوں میں اگر اردو کے تئیں دلچسپی پیدا کر دی جائے، انگریزی اور ہندی میں نکلنے والے کامکس سے بہتر کامکس اگر اردو میں پیش کیے جائیں تو وہی بچے آگے چل کر اردو کے دوسرے سیاسی، ادبی، نیم ادبی اخبار و رسائل کے مستقل قاری بن سکتے ہیں۔ وہ اس جستجو میں بھی تھے کہ بچوں کا ایک رسالہ نکالیں لیکن ناگہانی موت نے ان کے اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

اللہ بخشے نازش صاحب میں بڑی خوبیاں تھیں۔ ان کا قد جتنا چھوٹا تھا ارادے اتنے ہی بلند اور عزائم اتنے ہی مضبوط تھے۔ انھوں نے اپنے کیریئر کی ابتدا ایک تالا ساز اور بعد میں اخبار نویس کی حیثیت سے کی اور مرتے دم تک اخبار نویس ہی رہے۔ علی گڑھ سے جب وہ اپنا اخبار دشمن اور انحراف نکال رہے تھے تو اسے خود ہی مرتب بھی کرتے تھے، چھپواتے بھی تھے اور خود ہی بیچتے بھی تھے۔ ایک پرانی سائیکل پر اخبار لاد کر اپر کوٹ سے یونیورسٹی تک آتے آتے سارے اخبار ہاتھوں ہاتھ بک جایا کرتے تھے۔ اخبار کو زندہ رکھنے کے لیے سنیما کے اشتہاروں کے علاوہ بیکری کے اشتہار بھی چھاپا کرتے تھے۔ ایک بار کسی بیکری والے نے نازش صاحب کو اشتہار دینے سے انکار کر دیا تو نازش صاحب نے

Marfat.com

اس کے خلاف پورا محاذ کھول دیا۔ مجبور ہوکر اس نے اشتہار بھی دیے اور معافی بھی مانگی۔

ایک بار انھوں نے دوستوں کے بہکاوے میں آ کر کسی طالبہ کے خلاف کوئی نازیبا بات شائع کردی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ اس کے کردار پر حرف گیری کی گئی ہے تو اس نے نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ نازش صاحب کو جب یہ پتہ چلا تو وہ بڑے نادم ہوئے اور اس طالبہ سے اسپتال میں جا کر نہ صرف معافی مانگی بلکہ ان دوستوں سے بھی تعلق قطع کرلیا جنھوں نے اس قسم کی اوچھی حرکت پر اکسایا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے زندگی بھر کسی کے کردار پر انگلی اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔

یہ بات ۷۶-۱۹۷۵ء کی ہے۔ اس وقت ٹی وی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ چھوٹے شہروں میں لوگ جب بھی کسی مشاعرے کے نشر ہونے کی خبر سنتے ریڈیو کے گرد بیٹھ جایا کرتے تھے۔ علی گڑھ کے ایک مشہور شاعر نے نازش صاحب سے پوچھا کہ فلاں مشاعرے کی ریکارڈنگ آپ نے سنی ہے تو نازش صاحب نے اثبات میں جواب دیا اور کہا کہ اس میں تو آپ کا نام نہیں تھا۔ ان صاحب نے بڑے رسان سے جواب دیا میں شعر پڑھنے میں کب تھا میں تو تالیاں بجانے والوں میں تھا۔ یہ لطیفہ بہت دنوں تک علی گڑھ میں گردش کرتا رہا۔

ایک واقعہ اور سن لیجیے۔ یہ بات خود نازش صاحب نے بارہا مجھے بتائی کہ جب ان کی عمر کوئی ۱۳۔ ۱۴ برس کی تھی۔ اس وقت دہلی میں کوئی بہت مشہور فلم لگی ہوئی تھی۔ اس کی شہرت سن کر وہ گھر سے چپکے سے دہلی آ گئے۔ پرانی دہلی اسٹیشن کے قریب فلم دیکھ کر آگرہ کی طرف کوچ کر گئے۔ وہاں یہ کئی دنوں تک رہے۔ اس دوران انھوں نے خوب فلمیں بھی دیکھیں اور فلموں کے اشتہاری قافلے میں کام بھی کرنے لگے۔ انھوں نے ہنڈے بھی اٹھائے اور ڈھول بھی بجائے۔ بریانی کی دوکان پر کام بھی کیا اور سنیما کی کھڑکی پر پولیس کی گرفت میں بھی آ گئے۔ پولیس نے انھیں جیب تراش سمجھ کر گرفتار کرلیا تھا لیکن جب نازش صاحب نے یہ بتایا کہ بائیں انگوٹھے پر زخموں کے جو نشان ہیں وہ پیاز کاٹنے کی وجہ سے ہیں جیب تراشی کے لیے بلیڈ چلانے کے نہیں تو پولیس آفیسر نے انھیں چھوڑ دیا۔ اتفاق سے کسی نے نازش صاحب کے والد کو خبر دے دی کہ وہ آگرے میں دیکھے

گئے ہیں تو وہ آگرہ آپہنچے اور تاج محل کے قریب پارک میں نازش صاحب کو نیند کی حالت میں جا پکڑا۔

نازش صاحب کو عزتِ نفس کا ہمیشہ خیال رہا۔ اسی وجہ سے انھیں تنک مزاج بلکہ بدمزاج تک سمجھا جاتا ہے۔ اپنی شان کے خلاف وہ ایک لفظ برداشت نہیں کرتے تھے۔ جب وہ دہلی کے ایک مشور رسالے کے ادارتی شعبے میں کام کررہے تھے تو ایک دن رسالے کے مالک نے ان کی شان میں ایسی بات کہہ دی جسے انھوں نے اپنی ذات پر حملہ تصور کیا اور پھر قلم کے اس سپاہی نے چپل اتاری اور جلدی جلدی حریف پر تین چار وار کر کے چپلیں ہاتھ میں لیے چلتے بنے اور رسالے کا مالک میز کی دراز سے اپنا پستول نکالتا ہی رہ گیا۔ اردو میں جرائم کے موضوع پر نازش صاحب نے سب سے پہلے سلطان اختر اور فاروق ارگلی کے مشترکہ رسالے قانونی دنیا میں کام کیا۔ رسالہ بے حد کامیاب رہا لیکن چار پانچ شماروں کے بعد وہ میگزین شرکت داروں کے اختلاف کے باعث بند ہوگیا تو انھوں نے اپنے این آر آئی دوست کے لیے ''ماہنامہ جرائم'' کا آغاز کیا اور بہت جلد جرائم اردو کا کثیرالاشاعت ماہنامہ بن گیا جو آج تک جاری ہے۔ ۱۹۸۱ء میں جب فاروق ارگلی نے شمع کے ادارہ سے نکلنے والے ''آئینہ'' کے بعد اردو کا خوبصورت ترین جریدہ ''تیز گام'' شروع کیا تو انھوں نے نازش صاحب کی خدمات حاصل کیں اور انھیں پوری طرح اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کی آزادی دی۔

راقم السطور نے فاروق صاحب سے نازش صاحب مرحوم کے ساتھ کام کرنے کے ڈھائی تین برسوں کی رفاقت کے بارے میں بات کی تو انھوں نے کہا'' وہ تیز گام کے ملازم نہیں مالک کی طرح تھے۔ میں اپنے آپ کو بہت تجربے کار قسم کا صحافی سمجھتا تھا لیکن یہ کہنے میں مجھے کوئی جھجک نہیں کہ مرحوم کی تخلیقی صلاحیتوں کا میں معترف اور قائل رہا۔ میں نے ان کے مشوروں سے بہت کچھ سیکھا۔ عظیم صحافی سلامت علی مہدی کے بعد مجھے اس میدان میں نازش صاحب کے علاوہ کسی نے متاثر نہیں کیا''۔

اردو کے علاوہ کسی اور زبان پر ان کو دسترس بہت کم تھی لیکن اس کے باوجود دنیا کے ہر موضوع پر بے تکان لکھ سکتے تھے۔ اس طرح وہ ایک فطری صحافی اور نہایت باخبر انسان

Marfat.com

تھے۔ اردو کے کلاسیکی اور جدید ادب پر اپنا ایک الگ نظریہ رکھتے تھے۔ میں نے قدیم روایات، جدید رجحانات اور تخلیقی رویوں پر موجودہ عہد کے کئی نامور دانشوروں سے انھیں تبادلۂ خیال اور بحث ومباحثہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اسلامیات اور ملکی سیاسیات پر ان کے اداریے پڑھنے کے بعد میری یہ ذاتی رائے ہے کہ نازش صاحب اگرچہ تفریحی، سیاسی یا نیم سیاسی صحافت سے وابستہ رہے لیکن اگر وہ باقاعدہ ادبی اور علمی صحافت سے رشتے استوار رکھتے تو یقیناً برصغیر میں اپنی منفرد شناخت کے مالک ہوتے۔

نازش صاحب کا قد درمیانہ، رنگ گندمی، چہرہ کتابیں اور بدن متناسب تھا۔ ان کے ہاتھ بہت نرم و نازک تھے۔ کلین شیو رہتے، سر پر قدرے لمبے بال تھے۔ پیشانی کشادہ، آنکھیں روشن اور ناک ستواں تھی اس پر بہت ہی نازک اور خوبصورت سا چشمہ لگاتے تھے۔ زبان دھلی ہوئی اور لہجہ شریفانہ تھا۔ آواز میں قدرے نرمی اور آہستہ خرام تھے۔ زینہ چڑھنے، اترنے میں انھیں بڑی تکلیف ہوتی تھی اور دو چار لمحے ستاتے ضرور تھے۔ کسی کام کو منع نہیں کرتے تھے لیکن یہ بھی ہوتا تھا کہ جو کام انھیں پسند نہ ہوتا اس میں خاصی تاخیر ضرور ہو جاتی تھی۔

نازش صاحب میں رواداری، غم گساری، وسیع القلبی کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ وہ علاقائی عصبیت اور تنگ نظری کے قائل نہیں تھے لیکن اردو کے معاملے میں اکثر اپنے اصولوں کو طاق پر رکھ دیتے تھے۔ ایک بار ایک اشتہاری کمپنی نے نازش صاحب سے رابطہ قائم کیا اور براہِ راست ایک چبھتا ہوا سوال ان سے کیا کہ آپ کے ماہنامہ ''جرائم'' کو اشتہار کیوں دیا جائے جب کہ اردو کے پرچوں کی کوئی خاص ریڈرشپ نہیں ہے۔ اردو کے قارئین میں نہ خریدنے کی قوت ہے نہ جذبہ تو پھر ہم اپنی مصنوعات کا اشتہار اردو پرچوں کو کیوں دیں جب کہ دیگر زبانوں کے قارئین خوشحال بھی ہیں اور ان میں خریدنے کا جذبہ بھی۔ نازش صاحب نے تاریخی اور مسکت جواب دے کر نہ صرف اسے قائل کر لیا بلکہ اسے اردو کی عظمت کا معترف بھی بنا دیا۔ انھوں نے کہا: ''اردو کے اخبار و رسائل بنگال میں کثرت سے پڑھے جاتے ہیں اور وہاں اس کا مقابلہ بنگالی اور انگریزی سے ہے اسی طرح پنجاب میں پنجابی سے، آندھرا میں تیلگو سے، کیرل میں ملیالم سے، گجرات میں

Marfat.com

گجراتی سے، مہاراشٹر میں مراٹھی سے، گوا میں انگریزی اور کوکن سے، آسام میں اسی اور بنگالی سے، تمل ناڈو میں تمل اور انگریزی سے، کرناٹک میں کنڑ سے جب کہ دہلی، بہار، یوپی، مدھیہ پردیش اور راجستھان میں اس کا مقابلہ ہندی سے ہے۔ کشمیر کی تو سرکاری زبان ہی اردو ہے اس لیے انگریزی کے علاوہ کسی بھی دوسری زبان کے رسالے پورے ملک میں نہیں پڑھے جاتے۔ یہ ساری زبانیں کسی ایک یا چند ریاستوں تک محدود ہیں۔ انھیں آپ چاہیں تو علاقائی زبان کا نام دے سکتے ہیں لیکن اردو وہ واحد زبان ہے جو پورے ملک میں، ہر ریاست میں کسی نہ کسی سطح پر موجود ہے۔ گویا اردو ہی اس اقلیم کی تنہا تاجدار ہے"۔

نازش صاحب شیرِ میسور حضرت ٹیپو سلطان کے بہت مداح تھے۔ جب دوردرشن پر سنجے خاں کے سیریل سورڈ آف ٹیپو سلطان کی ابتدائی قسطیں دکھائی جارہی تھیں تو ان کے آنگن میں بھی ایک نومولود نے آنکھیں کھولیں۔ نازش صاحب نے اس بچے کا نام ٹیپو سلطان کے والد حیدر علی کے نام پر شہاب حیدر رکھا۔ بذاتِ خود نازش صاحب کا اصلی نام ٹیپو سلطان کے نام فتح علی سے بہت حد تک ملتا تھا۔

نازش صاحب ایک فرض شناس اور ذمہ دار صحافی ہونے کے علاوہ دوستوں پر جان چھڑکنے والے ایک ہمدرد اور باغ و بہار انسان بھی تھے۔ ان کے دوستوں کی فہرست بہت طویل ہے ان میں علی گڑھ کے الطاف حسین فریدی، ناول نگار عارف مارہروی، دہلی کے انیس مرزا، فاروق ارگلی اور ان کے دو بیٹے کنور خورشید اور کنور غلام محمد کے علاوہ مبارک علی، عتیق الرحمٰن، بزرگ ادیب و شاعر جناب اظہار اثر کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حاجی انیس دہلوی اور سلطان اختر سے بھی ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ خاتونِ مشرق کے ایڈیٹر توفیق فاروقی، کرکٹ اسٹار کے لو ایرانی، سلیم شیرازی، مودود صدیقی، سہیل انجم، معصوم مرادآبادی اور وضاحت حسین عالم سے بھی بڑے خوشگوار تعلقات تھے۔ لطیفہ پڑھنا، سننا اور سنانا انھیں بہت پسند تھا اور دل کھول کر قہقہے لگانا ان کی عادت تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جایا کرتے تھے۔ وہ خوش مزاج، خوش گفتار اور خوش لباس تو تھے ہی خوش خصال بھی تھے۔ وسیع النظری اور وسیع القلبی نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو مزید ابھارا

Marfat.com

اور نکھارا تھا اس لیے ان کے قلم میں بیحد شگفتگی تھی۔ انھوں نے صحافت کے علاوہ شاعری اور افسانہ نگاری میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔

نازش صاحب ۲۰۰۰ء سے سانس اور قلب کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ شروع میں انھوں نے کئی ماہرین امراضِ قلب سے رجوع کیا اور پھر ہومیو پیتھ کے مشہور معالج ڈاکٹر قاسم سے مستقل علاج کراتے رہے اور جلد ہی ان کی حالت سدھر بھی گئی تھی۔ ان تین برسوں میں سیکولر قیادت کے چیف ایڈیٹر اور قومی اقلیتی مالیاتی وترقیاتی کارپوریشن کے چیئرمین الحاج قاری محمد میاں مظہری، ان کے پارٹنر جناب نیر الاسلام اور جنتا کوآپریٹیو بینک کے چیئرمین جناب حکیم انیس الرحمٰن نے نازش صاحب کا ہر طرح سے خیال رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ سابق ممبر پارلیمنٹ جناب م۔ افضل صاحب نے تو رام منوہر لوہیا اسپتال کے ایک ڈاکٹر سے نہ صرف ان کا چیک اپ کروایا بلکہ علاج کے لیے ان کی مالی مدد کر کے اپنی دیرینہ دوستی کا حق بھی ادا کرنے کی کوشش کی اور ان کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ کے لیے اردو اکادمی سے پنشن بھی جاری کروائے۔

نازش صاحب لباس کے معاملے میں بڑے حساس تھے۔ جمعہ کے دن کرتا پاجامہ پہن کر دفتر آتے تھے۔ اس معمول میں کبھی تبدیلی نہیں آئی لیکن عجیب اتفاق ہے کہ ۱۲ رجون ۲۰۰۳ء کو جس دن ان کا انتقال ہوا وہ کرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھے اور یہ جمعہ نہیں بلکہ جمعرات کا دن تھا۔ اس روز صبح سے ہی ان کی طبیعت ناساز تھی۔ شام کو پانچ بجے اپنے سالے اور بیٹے کے ساتھ آٹو رکشا میں سوار ہو کر رنجیت نگر سے بستی حضرت نظام الدین کے لیے روانہ ہوئے۔ وہ ڈاکٹر قاسم سے دوا لینے کے لیے ہی جا رہے تھے کہ اچانک راستے میں ہی شہنشاہ ہمایوں کے مقبرہ اور دلوں پر حکومت کرنے والے محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ کی درمیانی سڑک پر روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور دل کی حرکت ہمیشہ کے لیے تھم گئی۔ لال بتی پر اسکوٹر رکا ہوا تھا، بنگلے والی مسجد اور درگاہ کی طرف جانے والے لوگوں کا جمِ غفیر روڈ کراس کر رہا تھا اور قلندر صفت نازش انصاری جو قلم کا بادشاہ بھی تھا کے لیے دنیا کے غم سے نجات پانے کی اس سے بہتر جگہ بھلا اور کیا ہو سکتی تھی۔

انتقال سے دس پندرہ دن قبل انھوں نے اپنا ایک تازہ شعر سنایا تھا، جسے میں نے فوراً

Marfat.com

لکھ لیا تھا۔ شعر یہ تھا:

پھر کوئی حادثہ نہ ہو جائے، دل کو اس وسوسے نے گھیرا ہے
جل رہا ہے چراغ منزل پر اور رستے میں گھپ اندھیرا ہے

لگتا ہے انھیں اپنی ناگہانی موت کا احساس ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں کو معاف فرمائے اور انھیں ان کی حسنات کی خلد بریں میں بلند مقام عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین بجاہ سید المرسلین۔

□□

Marfat.com

شیر سنگھ جین نازؔ دہلوی

ہماری عوامی زندگی میں عقیدے کی حدوں کو چھو لینے والی صدیوں پرانی ایک کہاوت مشہور ہے کہ علم اور دولت کی دیویوں میں جنم جنم سے بیر ہے، ایک جگہ جمع ہونا تو کجا ایک دوسرے کی پرچھائیوں کی بھی روادار نہیں۔ ایک آتی ہے تو دوسری دبے پاؤں کسی دروازے سے نکل جاتی ہے۔ لیکن میری اور آپ کی اسی دلّی میں علاقہ باڑہ ہندوراؤ کی تاریخی گلی پہاڑی دھیرج میں ایک ایسا بھی خاندان ہے جہاں پچھلے تقریباً ڈیڑھ سو برسوں سے لکشمی اور سرسوتی ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آج بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ براجمان ہیں۔

گئے زمانے میں اس جین گھرانے کی شان و شوکت اور علم دوستی آنجہانی پیارے لال جین اور ان کے صاحبزادے لالہ گردھاری لال جین کے دم سے عبارت تھی۔ اور آج دہلی ہائی کورٹ کے جسٹس آنریبل جسٹس وجیندر کمار جین عدل و انصاف کی اہم ترین ذمے داریوں کے ساتھ اپنے اجداد سے ورثہ میں ملی ہوئی علم دوستی کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔

آنجہانی شیر سنگھ جین نازؔ دہلوی جن کو اردو کے اربابِ نقد و نظر کے تجاہلِ عارفانہ نے دبستانِ دہلی کا ایک گم شدہ ورق بنا دیا ہے، اسی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ جناب نازؔ ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے جدامجد جناب ہٹی مل جین ۱۷۸۰ء میں کاروباری سلسلے میں فرخ نگر سے دہلی آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ آنجہانی ہٹی مل جین گرچہ بنیادی طور پر تجارت کے پیشے سے تعلق رکھتے تھے لیکن قسامِ ازل نے ان کو گوناگوں خوبیوں اور صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ تجارتی سوجھ بوجھ، معاملہ فہمی، دور اندیشی، ذہانت اور رکھ رکھاؤ کی

Marfat.com

بدولت وہ اس شہر کے رؤسا میں شمار کیے جانے لگے تھے۔

اُس زمانے میں دہلی کی ہندو مسلم برادریاں گنگا جمنی تہذیب میں گتھی ہوئی تھیں، شرفا اور رؤسا کے گھروں میں اردو کا چلن عام تھا اور زندگی کے صبح و شام اردو تہذیب کے آئینہ دار تھے۔ جنابِ نازؔ نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی اور خالص اردو کے ماحول میں پرورش پائی۔ اسی دور کے مروجہ نظام کے مطابق اردو اور فارسی کی مستند و معتبر اساتذہ سے گھر پر تعلیم حاصل کی۔ ان کے والد آنجہانی لالہ گردھاری لال جین ابوالمعظم نواب سراج الدین خاں سائلؔ دہلوی کے بے تکلف دوست تھے اور شعر و ادب کا کافی ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ اپنے گھر پر شاعر دوستوں کو مدعو کرنا اور شعری نشستیں منعقد کرنا ان کا شوق تھا۔ سائلؔ صاحب کی گھر میں آمد و رفت اور آئے دن کی شعری نشستوں نے شیر سنگھ جین کی تخلیقی صلاحیتوں کو تحریک دی اور شیر سنگھ خاندان کی روایتوں کو نبھانے اور ایک کامیاب تاجر بننے کے بجائے شعر و شاعری کے کوچے میں ایسے داخل ہوئے کہ زندگی بھر کاروبار کی طرف رُخ نہیں کیا اور صرف لیلائے غزل کے گیسو ہی سنوارتے رہے۔

جناب نازؔ نے ابتدائے شاعری میں نواب سراج الدین خاں صاحب سائلؔ دہلوی جیسے قادرالکلام اور مسلم الثبوت استاد کا تلمذ اختیار کیا اور رموزِ شاعری سیکھے لیکن کچھ عرصہ گزرنے کے بعد حضرتِ سائلؔ سے منشی مہاراج بہادر برقؔ دہلوی کو کلام دکھانے کی اجازت چاہی تو جنابِ سائلؔ نے نہ صرف بخوشی اجازت دے دی بلکہ خود لے جا کر حضرتِ برقؔ دہلوی کے سپرد کر آئے۔

شیر سنگھ نازؔ دہلوی خالص غزل کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری دہلوی رنگِ شاعری کی امین ہے۔ سلیس اور سادہ زبان میں ان کے خوبصورت اشعار دل میں اتر جاتے ہیں۔

اپنے استادِ اول یعنی ابوالمعظم نواب سراج الدین خاں سائلؔ دہلوی کی طرح نازؔ صاحب کے پڑھنے کا انداز بھی نہایت ہی موثر اور دل آویز تھا۔ وہ غزل پڑھتے ہوئے سامعین پر چھا جاتے اور اپنے خوبصورت اور دلوں کو گدگدا دینے والے اشعار سے مشاعرہ لوٹ لیتے تھے۔ ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو جناب نازؔ کی شاعری اور ان کے طرزِ ادائیگی کے مداح تھے۔ تقسیمِ وطن کے بعد دہلی کے بہت سے

Marfat.com

سرکاری مشاعروں میں پنڈت نہرو کے ایماء پر نازؔ صاحب کو خاص طور پر مدعو کیا جاتا تھا اور اگر پنڈت جی اپنے مصروف ترین شیڈیول سے وقت نکال کر ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے تو جنابِ نازؔ کی غزل ضرور سنتے تھے۔

نازؔ صاحب زندگی بھر آسودہ حال رہے، روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی، عوام اور خواص کے پسندیدہ شاعر تھے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے کلام یا مجموعے کی اشاعت پر کبھی توجہ نہیں دی۔ یہ اُس زمانے کے شعرا کا عام مزاج تھا۔ اور شعرائے کرام مجموعے کی اشاعت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اس رویہ کی وجہ سے اردو دنیا ابوالمعظم نواب سراج الدین خاں سائلؔ دہلوی جیسے بلند قامت شاعر کے کلام سے محروم رہ گئی۔ سائلؔ صاحب کے انتقال کے بعد ان کے وارثین کی شعروادب سے عدم دلچسپی کی وجہ سے سائلؔ کا تمام کلام طاقِ نسیاں ہو گیا۔

۱۹ر مارچ ۱۹۶۲ء کو جنابِ نازؔ کے انتقال کے بعد ممکن ہے ان کا کلام بھی ضائع ہو جاتا لیکن ان کی علم دوست رفیقۂ حیات محترمہ گن مالا دیوی نے پہلی فرصت میں اس امانت کو اردو والوں تک پہنچا دیا اور ''خدنگِ نازؔ'' کے عنوان سے اپنے شوہر مرحوم کا مجموعہ شائع کیا جسے ان کے خواجہ تاش جناب طالب دہلوی نے مرتب کیا تھا۔

حضرتِ نازؔ کا یہ مجموعہ ان کے انتقال کے چند ماہ بعد ہی شائع ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اب یہ مجموعہ بھی ناپید ہے، لیکن ان کی غزلیں ہندوستان و پاکستان کے بہت سے مقبول گلوکار حضرتِ نازؔ کا حوالہ دیے بغیر گاتے ہیں اور موسیقی کی محفلیں لوٹتے ہیں۔ یہی نہیں کچھ نام نہاد شاعروں نے تو ان کی غزلوں پر ہی ہاتھ صاف کر دیا ہے اور حضرتِ نازؔ کی غزلیں یا ان کے متفرق اشعار بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اپنے نام سے مشاعروں میں پڑھتے ہیں۔

لیکن اب جنابِ نازؔ کی شخصیت اور ان کی شاعری کی بازیافت کا دور شروع ہو چکا ہے۔ دہلی کے چند ادب دوست حضرات نے اس طرف سنجیدگی سے توجہ کی اور حضرتِ نازؔ کے نبیرہ آنریبل جسٹس وجیندر کمار جین کے بھرپور تعاون سے ''خدنگِ نازؔ'' کی اشاعتِ ثانی پر کام ہو رہا ہے تاکہ دبستانِ دہلی کے اس خوبصورت شاعر کا کلام وقت کی دھول میں گم نہ ہو جائے۔ □□

Marfat.com

اشرف صبوحی

نام سید ولی اشرف، تخلص صبوحی، ولد حاجی حافظ علی اشرف۔ والد عالم دین، محکمہ ریلوے میں ملازم تھے۔ نو حج کیے تھے اور پیر تھے۔ پیری مریدی کا سلسلہ اس خاندان میں آج بھی جاری ہے۔ اشرف صبوحی ۱۱ر مئی ۱۹۰۵ء کو بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ان کا دادھیالی رشتہ معروف مصنف، مترجم، مقرر اور اردو کے اولین ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کے خاندان سے بہت قریبی ہے۔ مولوی بشیر الدین مصنف تاریخ دار الحکومت ہند خلف ڈپٹی نذیر احمد اشرف صبوحی کے پھوپھا تھے۔ اشرف صبوحی نے ۱۹۲۲ء میں اینگلو عربک اسکول سے میٹرک پاس کیا، بعد ازاں منشی فاضل کے امتحان کی تیاری کے لیے مسجد فتح پوری کے اسکول میں داخلہ لیا۔ یہاں ناصر نذیر فراق دہلوی اور مولانا سعید احمد جیسے صاحبِ علم وقلم سے استفادہ کیا۔ ۱۹۲۹ء میں محکمہ ڈاک وتار میں ملازمت اختیار کی۔ صبوحی کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ مولوی بشیر الدین نے تحریر وتخلیق کی تربیت کی اور ادبی زندگی کا آغاز تقریظ نگاری سے کیا یہ مولوی بشیر الدین کے دیوان ''دیوانِ بشیر'' پر تقریظ تھی۔ ۱۹۳۰ء میں شاہد احمد دہلوی نے ''ساقی'' کی اشاعت شروع کی۔ اشرف صبوحی نے بھی ماہنامہ ''ارمغان'' کی اشاعت شروع کی تو خواجہ حسن نظامی، ناصر نذیر فراق، ملا رموزی، شوکت تھانوی، میر ناصر علی، ''صلائے عام'' والے بے خود دہلوی، مضحک دہلوی، شاہد احمد دہلوی، ظہور احمد وحشی، شفیع الدین نیّر جیسے معروف ومعتبر صاحبِ علم وقلم نے ارمغان کے ذریعے اشرف صبوحی کی حوصلہ افزائی کی۔ شفیع الدین نیر، اشرف کے ہم جماعت اور ہم عمر تھے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اشرف صبوحی کے نین نقش کا ذکر درجِ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

Marfat.com

''لمبا قد، دوہرا بدن، گول چہرے پر خشخشی داڑھی، عینک کے شیشوں سے جھانکتی ہوئی تیز اور روشن آنکھیں، ہونٹوں پر مسکراہٹ، سر پر کرٹی کی سخت ترکی ٹوپی، شیروانی کے سارے بٹن کھلے ہوئے، علی گڑھ کاٹ کا پائجامہ، انداز میں انکسار اور حلم، وضع قطع اور چلنے سے پورے مولوی صاحب معلوم ہوتے تھے''۔

(دلّی کی چند عجیب ہستیاں، ص: ۱۰-۹، ۱۹۸۹ء، مکتبہ جامعہ، دہلی)

اشرف صبوحی نے تقریظ نگاری کا ساتھ جلد ہی چھوڑ دیا، شاعری بھی طبیعت کو راس نہیں آئی البتہ نثر نگاری میں جولانیِ طبع اور جدت طرازی کے ساتھ تخلیقی صلاحیتوں کے مظہر ناول، ناولٹ، افسانے، خاکے اور انگریزی ناول کے اردو تراجم ہیں۔ تا حال تین مجموعے خاکوں کے ہیں۔

۱۔ دلّی کی چند عجیب ہستیاں (دو ایڈیشن، ایک ہندوستان میں اور ایک پاکستان میں)
۲۔ جھروکے (افسانے اور خاکے)
۳۔ غبارِ کارواں (خاکے)
۴۔ بن باسی دیوی (وحشیانہ زندگی کی انسانی حالت، پُر لطف پیرائے میں انگریزی سے ماخوذ)
۵۔ سلمٰی یا بغداد کے جوہری (ناول، انگریزی سے ماخوذ)
۶۔ موصل کے سوداگر (انگریزی سے ماخوذ)
۷۔ دھوپ چھاؤں (انگریزی ناول کا ترجمہ)
۸۔ ننگی دھرتی (انگریزی ناول کا ترجمہ)
۹۔ بزمِ آخر (مصنف فیاض مرحوم) مرتبہ اشرف صبوحی، جسے مشکل الفاظ کی فرہنگ کے ساتھ مجلس ترقی ادب پاکستان نے شائع کیا۔

غیر مطبوعہ اثاثے میں:

۱۔ کہاوتوں کی کہانیاں

Marfat.com

۲۔ نجف کے موتی

۳۔ نورِ اسلام کی جھلکیاں

۴۔ دیو کے دیس میں

۵۔ بونوں کے دیس میں

۶۔ ایک مزاحیہ مضامین کا مجموعہ۔

ان کے علاوہ مختلف مضامین اور خاکے اور افسانے متفرق رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ اشرف صبوحی کی ایسی تخلیقات کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

نمبر شمار	عنوان	نام رسالہ	تاریخ و سن
۱۔	مختصر حالاتِ زندگی (مولانا بشیر الدین احمد)	ساقی	اپریل ۱۹۳۰ء
۲۔	اسے کیوں ہم نے دیا دل	ساقی	اپریل ۱۹۳۱ء
۳۔	وانٹرلیس	ساقی	اپریل ۱۹۳۱ء
۴۔	خواب تھا جو کچھ دیکھا جو سنا افسانہ تھا	ساقی	اکتوبر ۱۹۳۱ء
۵۔	رزم بزم	ساقی	مارچ ۱۹۳۷ء
۶۔	تمسخرِ حیات	ساقی	جون ۱۹۳۷ء
۷۔	فولادی عشق	ساقی	جولائی ۱۹۳۷ء
۸۔	نئی روشنی کا اندھیرا	ساقی	دسمبر ۱۹۳۷ء
۹۔	قلعہ معلّٰی کی ایک جھلک	ساقی	جنوری ۱۹۳۸ء
۱۰۔	ریل کا ایک سفر	ساقی	اپریل ۱۹۳۸ء
۱۱۔	خدائی خوار	ساقی	جولائی ۱۹۳۹ء
۱۲۔	تاریخ کا ایک صفحہ	ساقی	اگست ۱۹۴۰ء
۱۳۔	اردو	چمنستان	جنوری ۱۹۴۱ء
۱۴۔	برق کی شاعری	الہام (دلّی)	جنوری ۱۹۴۲ء
۱۵۔	داڑھی کی بپتا	چمنستان	سالنامہ جنوری ۱۹۴۲ء
۱۶۔	الف لیلیٰ کی ایک رات	چمنستان	اکتوبر ۱۹۴۲ء

Marfat.com

۱۷۔	ایرانی شہزادے کی داستانِ عشق	آجکل (دلّی)	فروری ۱۹۴۴ء
۱۸۔	حاجی ہریل	سالنامہ مشہور	جنوری ۱۹۴۶ء
۱۹۔	بہو کی علالت	ساقی	جنوری وفروری ۱۹۴۷ء
۲۰۔	گلی	آجکل (دلّی)	جنوری وفروری ۱۹۴۸ء
۲۱۔	داستانِ عشق	جمیل	نومبر ۱۹۴۸ء
۲۲۔	میرزا طاؤس	ماہِ نو کراچی	ستمبر ۱۹۴۹ء
۲۳۔	شیخ زیٹیے	ماہِ نو کراچی	دسمبر ۱۹۴۹ء
۲۴۔	کا جی جی	ماہِ نو کراچی	مئی ۱۹۵۰ء
۲۵۔	نواب آسماں قدر	ماہِ نو کراچی	جولائی ۱۹۵۰ء
۲۶۔	بدھو	آجکل (دلّی)	سالنامہ ۱۹۵۰ء
۲۷۔	خانصاب کے گھر	ماہِ نو کراچی	اگست ۱۹۵۱ء
۲۸۔	دیوؤں کے دیس میں	رہنمائے تعلیم (دلّی)	جنوری وفروری ۱۹۵۲ء
۲۹۔	کوئی صورت نظر نہیں آتی	ماہِ نو کراچی	ستمبر ۱۹۵۳ء
۳۰۔	مجھے کچھ کہنا ہے ان کی زبان میں	ماہِ نو کراچی	اگست ۱۹۵۴ء
۳۱۔	حاجی بغلول (لاہور میں)	ماہِ نو کراچی	نومبر ۱۹۵۴ء
۳۲۔	دوستی نادان کی ہے	ماہِ نو کراچی	جون ۱۹۵۵ء
۳۳۔	خواب پریشاں	ماہِ نو کراچی	اپریل ۱۹۵۶ء
۳۴۔	کنج خرابات (فکاہیہ)	ماہِ نو کراچی	فروری ۱۹۶۱ء
۳۵۔	کل کی بات	ماہِ نو کراچی	ستمبر ۱۹۶۱ء

اس فہرست کو ہرگز ہرگز مکمل تصور نہ فرمائیں اگرچہ حتی الوسع یہ کوشش کی گئی ہے کہ زیادہ مکمل فہرست پیش کی جائے۔

بچوں کی کہانیاں

۱۔ صبر بادشاہ زادہ

۲۔ لعل شہزادہ

۳۔ شہزادہ نے نواز

۴۔ ٹھوڑی تارا ماتھے چاند

بچوں کے لیے نظمیں، چند غزلیات، تاریخ گوئی، قصے سجع یا برمحل اشعار کا ورثہ بھی اشاعت کا منتظر ہے۔

اشرف صبوحی کامیاب ریڈیو مقرر تھے۔ دلّی میں ریڈیو کی ابتدا ہوئی تو اشرف صبوحی، چند مقررین میں سے ایک تھے۔ مبینہ بیگم نے لکھا ہے:

"صبوحی صاحب نے ریڈیو کے لیے تقریروں کے علاوہ ڈرامے، فیچر، عورتوں کے لیے پروگرام، بچوں کی کہانیاں اور بچوں کے لیے ڈرامے لکھے جن کا سلسلہ تقسیم کے بعد پاکستان میں بھی جاری رہا"۔

(اشرف صبوحی ایک مطالعہ، مبینہ بیگم، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی ص:۱۸)

دہلوی نثر کے ابتدائی نمونے زبانِ قلعہ معلّٰی اور میر امن کی نثر، خطوطِ غالب، دہلی کالج کی نثر، شاہ برادران کے تراجم قرآن، شاہ ولی اللہ کے خطبات ہیں۔ اگر متذکرہ بالا کو دہلوی نثر کا سنگ میل مان لیا جائے تو قلعہ معلّٰی کی زبان سے قطع نظر میر امن کی نثر، دہلی کالج کی نثر اور شاہ برادران کے تراجمِ قرآن ترجمہ کی کامیاب کوششیں ہیں۔ ان میں خطوطِ غالب تخلیقی نثر کا نمونہ ہے۔ حالاں کہ ترجمہ کے ابتدائی عہد میں، ہر زبان میں ترجمہ کا عمل تخلیقی ہی ہوتا ہے خصوصاً مذہبی اور فلسفیانہ و سائنسی تراجم تخلیقی صلاحیتوں کا متقاضی ہوتا ہے اور ترجمہ نثر کی ترقی میں غیر معمولی کردار ادا کرتا ہے۔ متذکرہ تراجم سے دہلوی نثر کو فروغ ہوا۔ ترجمہ انگریزی اور فرانسیسی نشاۃ ثانیہ کی اہم قوت رہا ہے۔ زبانوں کے علمی پہلو اور لسانی وسعت میں ترجمہ ناگزیر کردار ادا کرتا ہے جس سے ذہنی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ میر امن کی باغ و بہار اور گنج خوبی میں جو صفاتی بعد ہے وہی فرق ہمیں ڈپٹی نذیر احمد، مولوی بشیر الدین، ذکاء اللہ، اشرف صبوحی، داغ دہلوی، شاہد احمد دہلوی، ملا واحدی، راشد الخیری، خواجہ عبدالمجید دہلوی، مرزا سعید دہلوی اور بے خود دہلوی کی نثر میں نظر آتا ہے۔ یعنی طبع زاد یا تخلیقی نثر میں جو تخلیقی آزادی میسر ہوتی ہے وہ ترجمہ کے عمل میں میسر نہیں ہوتی خواہ اخذ (Adaptation) ہی کیوں نہ کیا جائے۔ دہلوی زبان اور لب

Marfat.com

ولہجہ کو برتنے کے سلیقے کی منفرد پہچان رہی ہے۔ اس کے لہجے میں احساسِ تفاخر، انانیت اوراحساس برتری کی کھنک ملتی ہے۔ اسی کے ساتھ حلیمی، انکساری اور اپنائیت کا عنصر بھی ہوتا ہے۔ دہلوی تہذیب کی تشکیل میں ترک، ایران و عرب کے علاوہ ہندوستان کی ریاستوں، شہروں، گاؤں اور مضافات کے اہلِ ہنر وفن، علم وادب کی صدیوں کے سماجی تہذیبی، معاشی لین دین کا عمل بھی پنہاں ہے جس سے دہلوی تہذیب وزبان کا خمیر تشکیل پذیر ہوا۔ دہلویت میں عالمگیر اقدار انسانیت، باہمی ہمدردی، غربا پروری، وسیع القلبی، وسیع النظری اور غیروں کو اپنانے کی غیر معمولی مثبت صلاحیتیں جیسی اقدار شامل ہیں۔ اصل میں ہم بھول جاتے ہیں کہ جس طرح کوئی زبان، الفاظ کا سطح پر خالص دیسی نہیں ہوتی بلکہ اس میں اسی نوے فیصد الفاظ دوسری زبانوں کے ہوتے ہیں اسی طرح کوئی تہذیب خالص دیسی نہیں ہوتی بلکہ مختلف تہذیبوں کے عناصر غیر محسوس طور پر جذب ہوتے رہتے ہیں، جس طرح الفاظ ڈوبتے ابھرتے ہیں اسی طرح سماجی سیاسی و معاشی سرگرمیوں سے جو تبدیلی رونما ہوتی ہے اس کے اثر سے تہذیب کے روپ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ آج اہلِ دہلی، دہلوی روایتی تہذیب سے اس لیے بھی انجان ہیں کہ صدیوں کے سفر اور تاریخ کی جدلیت نے، دہلی کا روپ رنگ بدل دیا ہے۔ نقشے بدل گئے، رہائش ،لباس، غذا، رہن سہن کے آداب بین الاقوامی تہذیب کی طرف گامزن ہیں۔ دنیا کسی متحدہ تہذیب کی طرف بڑھ رہی ہے۔ دنیا کے بیشتر حصے میں ایک ہی طرح کے لباس، غذا، مکان (فنِ تعمیر) اور رہن سہن اختیار کرلیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں تہذیب کی چھوٹی چھوٹی علامتیں (Micro- Culture) گمنام ہورہی ہیں۔ جب (Macro) بڑی تہذیب (Micro) چھوٹی تہذیب پر اثر انداز ہوتی ہے تو یہ المناک صورتحال پیدا ہونا فطری عمل ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں وسیع النظر، تعلیم یافتہ، مستقبل شناس افراد (Micro) چھوٹی تہذیب کو کہانی، ڈراما یا دستاویز کی صورت میں یا ادب و تاریخ میں محفوظ کرتے ہیں اور انجان تنگ ذہن افراد کم علمی کی بنا پر اس کا مضحکہ بناتے ہیں۔ آج بھی قدیم یونان میں نئی تعمیرات کے لیے گہری بنیادیں نہیں کھودی جاتیں، وہاں یہ مذاق عام ہے کہ ایسا کرنے سے آثارِ قدیمہ نکل سکتے ہیں۔

دلّی جغرافیائی حیثیت سے ایسے خطے میں آباد ہے جہاں اسے مرکزی حیثیت حاصل ہے، اس لیے اکثر فاتح اور حکام نے دلی کو راجدھانی بنایا۔ دلی کی اسی سیاسی معاشی مرکزیت نے یہاں کی مشترکہ تہذیب کی تشکیل کی۔ شاہجہاں آباد کی تعمیر وتشکیل کے بعد بادشاہِ وقت نے دنیا بھر کے اہلِ علم و ہنر، عالم و فاضل، ہرفن وعلم کے یکتائے روزگار کو یہاں مدعو کیا اور ان کی ہر طرح سرپرستی کی۔ آج بھی ان پیشے اور ناموں پر گلی محلے بازار اور حویلیاں موجود ہیں۔ ان یکتائے روزگار اہلِ علم وہنر کی سرپرستی اور سرگرمیوں سے مخصوص سماجی عمل ظہور پذیر ہوا جس نے دہلویت کی تشکیل کی۔ ان کے علاوہ اولیائے کرام، صوفیائے کرام، علمائے دین، حکیم، وید، عطار، مفتی، مولوی، منجم، ماہر جفر ورمل، سنت، جوگی، موسیقار، رقاص، مصور، نقاش، سنگ تراش، معمار، اوزار، ہتھیار ساز، درزی، حلوائی، سنار، ملمع ساز، پاپوش گر، رنگریز، سبزی فروش، پھل فروش، نانبائی، بھٹیارے، سرائے والے، خوانچے والے، قصائی، کبابی، بہشتی، شکاری، کپڑا بننے والے، قالین باف، سپاہی، فوجی، ماہرینِ جنگ، چوکیدار اور جملہ اہلِ حرفہ کی معاشی سماجی سرگرمیوں اور بے مثال ہنرمندی کے جوہر دکھانے کی وجہ سے تخلیقی جدتوں کا اثر، زبان، رہن سہن، رکھ رکھاؤ، لباس اور فنِ تعمیر پر پڑا جس سے دہلویت کو کمالِ عروج ملا۔ یہ فطری عمل تھا کہ ہنر کی قدرافزائی کا صلہ بادشاہِ وقت، وزرا، روٴسا، جاگیرداروں سے بہ قدرِ کمالِ ہنر ملنا یقینی تھا۔ ہنرومحنت کا صلہ مثبت ہو تو اہلِ ہنر کی تخلیقی صلاحیتوں کو تقویت ملتی ہے۔ اسی قدردانی کے ماحول نے اہلِ دہلی میں فخر وانانیت کے جذبے پیدا کیے۔ سیاسی بے چینی اور بے سکونی نے، انکساری، حلیمی اور لب ولہجہ میں شیرینی اور اپنائیت پیدا کی۔ متحدہ قومیت اور مشترکہ وراثت کی قدر دہلویت کی خوبی ہے۔ ذرا نظر اٹھائیے جامع مسجد، جین مندر، لال قلعہ، چرچ، مسجد فتح پوری، گوردوارہ، پارسی عبادت گاہیں، فنِ تعمیر کے مشترکہ ورثہ اور متحدہ قومیت کی جاگتی مثالیں ہیں یہ دہلوی تہذیب کی روح ہیں۔

متحدہ قومیت، مشترکہ وراثت کی تشکیل میں قلعہ معلیٰ کی تہذیب اور زبان اردو ناگزیر ہیں۔ سب ہی مذاہب اور نسل کے لوگ اردو بولنا فارسی لکھنا اور قلعہ کی تہذیب اور اخلاقیات برتنا باعث فخر سمجھتے تھے۔ معاشی معیار کے بجائے تہذیب واخلاق اور پیشے میں

Marfat.com

ہنرمندی دہلوی افراد کا سرمایۂ افتخار ہوتا تھا۔ ہمہ وقت، ہندوستان کی دور دراز ریاستوں کے نوابین، راجہ، رؤسا، جاگیردار، سوداگر اور اہلِ ہنر کے علاوہ ممالک غیر سے سفرا، بادشاہ کو نذریں گزرانے دلّی آتے، یہ قافلے اپنے ساتھ اپنی تہذیب کے عنصر چھوڑ جاتے اور دلّی کی تہذیب کے عناصر ساتھ لے جاتے۔ اس طرح دلّی کی تہذیب عالمگیر حیثیت اختیار کرتی گئی۔ کوئی تہذیب، فصیل بند شہروں کی مقید نہیں ہوسکتی، یہ تو خوشبو کی مانند پھیلتی ہے۔ صرف جغرافیائی پہچان بطور مقامِ پیدائش یا نشو ونما ہوتی ہے۔ تہذیب جو علاقائیت یا صوبائیت سے کہیں زیادہ وسیع تر معنویت کی حامل ہوتی ہے۔ کھانے پکانے کا طریقہ، برتن، اوزار، کھانے کے آداب، گفتگو اور بول چال کا سلیقہ اور الفاظ برتنے کا ہنر، لباس کا ڈیزائن اور پہننے کا سلیقہ یا فنِ تعمیر کی نوعیت کسی تہذیب کی اولین پہچان ہوتی ہے۔ دہلوی تہذیب اور ادب کو ہمیں ان ہی عناصر کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔

اشرف صبوحی کے تخلیقی سوتے اسی تہذیب سے پھوٹتے ہیں۔ وہ جدی دلّی والے اور دہلی کی صدیوں کی تہذیبی میراث کے قابلِ قدر وارث تھے۔ محکمۂ ڈاک و تار میں ملازمت کرتے ہوئے وہ ہمدرد دواخانے کے قریب ڈاکخانے میں مقرر تھے۔ حکیم عبدالحمید مرحوم و حکیم سعید مرحوم سے رفاقت تھی۔ اسی زمانے میں مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو کا دفتر دلّی میں دریا گنج لے آئے اور اشرف صبوحی کو مسودات کی نظر ثانی کی ذمہ داری دی۔ اسی دور میں مولوی عبدالحق نے انجمن سے اشرف صبوحی کے خاکوں کا مجموعہ شائع کیا تھا۔ یہ مجموعہ اشرف کی بہترین تحریروں پر مشتمل ہے۔ تقسیم کے بعد اشرف صبوحی پاکستان چلے گئے جہاں ڈاک وتار میں ملازمت ملی اور حکیم سعید کے مراسم کی وجہ سے بعد ازاں ہمدرد میں ملازمت اختیار کی۔ حکیم سعید نے اشرف صبوحی سے دیرینہ مراسم نبھاتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ ان کی تمام تصانیف ہمدرد شائع کرے گا۔ یہ اشرف صبوحی کی زندگی کا آخری دور تھا جب ان کی بینائی جاتی رہی تھی۔ تا حال معلوم نہیں، یہ وعدہ وفا ہوا یا نہیں۔ اب نہ حکیم سعید ہیں نہ حکیم عبدالحمید۔

اشرف صبوحی کی تصانیف کو چار حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ اول تراجم، دوم تخلیقی نثر، سوم بچوں اور خواتین کے لیے تحریریں، چہارم مذہبی تصانیف۔ اشرف کو ادبی وقار تو

Marfat.com

''ارمغان'' کی اشاعت سے ہی حاصل ہو گیا تھا لیکن بحیثیت ادیب ''دلّی کی چند عجیب ہستیاں'' سے سند اور شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی تمام تصانیف میں متذکرہ کتاب میں تخلیقی صلاحیتیں بھرپور ظاہر ہوتی ہیں۔ اس کتاب میں پندرہ خاکے اور اسلم فرخی کا پیش لفظ ہے۔ ان خاکوں کے کردار دلی کے عام کردار ہیں گویا دلی کی نشانیاں محفوظ کی گئی ہیں۔ یہ وہی جذبہ ہے جس نے سرسید سے آثار الصنادید لکھوائی، میر امن نے باغ و بہار لکھی، ظہیر دہلوی نے داستانِ غدر، شرر نے گزشتہ لکھنؤ لکھی یا بعد کے دور میں ناصر نذیر فراق، فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، راشد الخیری، رازق الخیری، مرزا محمد سعید دہلوی، عبدالرحمٰن دہلوی، قاری سرفراز حسین، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی اسحاق دہلوی، مولوی بشیر الدین دہلوی، حالی، داغ دہلوی، بے خود دہلوی، محمد غالب دہلوی، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی، حکیم ذکی احمد دہلوی، سائل دہلوی، ملا واحدی، آغا حیدر حسن دہلوی، خواجہ محمد شفیع دہلوی، احمد علی، لالہ مہیشور دیال، حمیدہ سلطان، خار دہلوی، گلزار دہلوی، مولانا احمد سعید دہلوی، رسا دہلوی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر اسلم پرویز، سید ضمیر حسن دہلوی، جمیل الدین عالی نے دہلوی لب ولہجہ اور زبان وادب واسلوب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ ان کے علاوہ بے شمار باکمال ہیں جنھوں نے دہلوی تہذیب کی جغرافیائی حدوں کو توڑ کر دہلوی اسلوب کا چراغ روشن کیا اور عالمگیریت کو برقرار رکھتے ہوئے، مٹتی ہوئی تہذیب کے عناصر کو زندۂ جاوید رکھنے کی سعی جمیل کی۔ اہلِ دہلی کا محاورہ قلعہ معلٰی کی ٹکسال سے نکلتا تھا۔ قلعہ معلٰی کے زوال کے بعد دہلی کے باشندوں نے اس کو زندہ رکھا، اب ٹکسال قلعہ معلٰی کے بجائے دلی کی گلیاں، مجلسیں اور عوامی محفلیں بن گئی تھیں۔ اشرف صبوحی نے چند عجیب ہستیاں میں ایسے ہی کرداروں کے توسط سے دلی کے اخلاقی اور لسانی ورثہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔

۱۸۵۷ء کے غدر نے دلّی والوں میں احساسِ غیر محفوظیت پیدا کر دیا تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی کے رائج کردہ نظام نے نیا معاشی نظام تشکیل دیا، اس نظام سے لٹی ہوئی دلی کی نئی تہذیب کی سفاکی کا سامنا کرنا پڑا اور زبان تہذیب، مذہب رسم و رواج پر کمپنی کے حملوں نے تہذیب کا برقرار رہنا مشکل کر دیا، خطوطِ غالب اور ظہیر دہلوی کی داستانِ غدر میں یہ المناک حادثے رقم ہیں۔ اشرف صبوحی نے 'خواجہ انیس' خاکے میں اس صورتحال کو دلدوز

Marfat.com

انداز سے بیان لیا ہے۔

''میر صاحب، کیا پوچھتے ہو، دلی کو دیکھو گے تو پہچاننا مشکل ہو جائے گا... یہاں تو ایسے اولے پڑے کہ پھر پنپنے کی امید نہیں، جتنے آبرودار تھے ایک ایک کو چن کر پھانسی پر چڑھادیا، میں تو کئی برس کے بعد، آج گھر سے نکلا تھا، سر پیٹ پیٹ لیا، اگلی سی کوئی بات نظر نہ آئی۔ پھر حاکم ہیں تو عجب، نہ دربار نہ بات چیت میں سلیقہ، انعام نہ اکرام، گفتگو دیکھو تو پہاڑی کے پتھر لڑھک رہے ہیں۔لباس ہے تو تلنگوں سے بدتر۔نہ جامہ نہ دستار، ننگے سر، ول ول(Well- Well) کے سوا دوسرا کلمہ نہیں، بھیا افسوس تو یہ ہے کہ ہم پر کوئی گولہ کیوں نہ پڑ گیا، قلعہ میں سنا، گورے رہتے ہیں کیسی کیسی حویلیاں تھیں۔ کیسے کیسے نامی نامدار امیر تھے۔ نجیبوں، شریفوں سے گلی گلی کوچہ کوچہ بھرا پڑا تھا۔ آج یہ بھی سنسان ہے، جن کو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں، قبرستان میں بھی ان کا پتہ نہیں، زمین کھا گئی یا آسمان۔کس سے پوچھیں!''۔

(دلّی کی چند عجیب ہستیاں، ص: ۴۴، اشرف صبوحی، ۱۹۸۹ء، مکتبہ جامعہ، دہلی)

دہلوی سماج کے ڈھانچہ پر غدر کا وار دور رس نتائج کا حامل ہے۔ خواجہ انیس، کا متذکرہ بالا بیان، نوجوان اور بوڑھی نسل کے درمیان تبدیلی اور خلا کا مظہر ہے۔ روایتی زندگی اور نئی زندگی کے تقاضے مختلف تھے۔ تاریخی جبر کی سفاکی سے، تہذیب، تمدن اخلاقیات معاشی نظام اور روزمرہ کے معمولات میں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں جس سے زندگی کے روپ بدل رہے تھے۔لیکن سماج میں ایسا روایت پرست طبقہ ہمیشہ رہتا ہے جو ماضی کو آنکھوں میں بسائے سینہ سے لگائے جیتا ہے۔ اشرف صبوحی کے خاکے دراصل ویسے ہی طبقے کے خاکے ہیں یہی وہ طبقہ ہے جو روایت کو جدیدیت سے اور ماضی کو حال سے جوڑتا ہے۔ تہذیبی ترقی یا تبدیلی یا انقلاب کے قدیم و جدید کی آمیزش سے نئی تشکیلات کو مثبت سمت عطا کرتا ہے۔

دلی کی چند عجیب ہستیاں جو مولوی عبدالحق کی نگرانی میں انجمن ترقی اردو ہند سے

Marfat.com

شائع ہوا تھا، اس میں دلی کے باکمال نچلے طبقے (پیشے) کے باکمال افراد کے خاکے ہیں ان خاکوں میں دہلوی مزاج اور تہذیب کی اقدار سموئی ہوئی ہیں۔ محاورہ روزمرہ ضرب الامثال ضلع جگت کا فطری استعمال ہے جس سے اسلوب میں برجستگی اور بے ساختگی کا حسن آیا ہے۔ منفرد تلفظ، شخصیت کے اعتماد و اعتبار کا ثبوت ہوتا ہے۔ چنانچہ ان خاکوں میں دہلوی اسلوب کے کئی نمونے ملتے ہیں ان کے تراجم کا اسلوب ان سے مختلف ہے۔ نثر لکھنا، شاعری سے زیادہ مشکل کام ہے۔ برجستہ، برمحل اور بے ساختہ الفاظ کا ایسا استعمال کہ تحریر میں بہاؤ، سلاست رہے اور قاری کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ ''سیدانی بی بی''، ''نیازی خانم''، ''پرنانی'' میں دہلوی نسوانی زبان و محاورے محفوظ ہو گئے ہیں۔

گھریلو تفریحی مشاغل میں ایک شغل یہ تھا کہ کسی حروف ابجد کا انتخاب کر کے اس حروف سے تشکیل الفاظ کو اس کمال کے ساتھ مسلسل استعمال کیا جائے کہ ایک حرف سے شروع ہونے والے الفاظ کی تکرار ہو اور جملے بھی بے معنی نہ ہوں اس طرح کسی حروف سے بننے والے لفظ/ الفاظ کے صوتی آہنگ کا لطف بھی اٹھایا جاتا تھا اور الفاظ کے بے ساختہ بامعنی استعمال کی تربیت بھی ہوتی تھی۔ اسلم فرخی نے اشرف صبوحی کے حوالے سے خواجہ حسن نظامی کی اس صلاحیت کا ذکر کرتے ہوئے درج ذیل عبارت رقم کی ہے:

> ''مچھلی والان میں کوئی شادی تھی، محلے کے سنیما گھر میں برات کے بٹھانے کا انتظام تھا، برات آئی، لوگ بیٹھے، سنیما میں بٹھائے جانے پر بعض ثقہ لوگوں کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے۔ خواجہ صاحب بھی تشریف فرما تھے، شکن آلود پیشانیاں دیکھ کر خواجہ صاحب نے گفتگو شروع کی:
>
> ''س کا سُر سنگھا، ستارہ سحر کی طرح روشن، ستار کی ستاری، سردار کی سرداری، سبحان ربی الاعلیٰ کی سرشاری، سرکارِ دوعالم کی سیادت و سعادت، سلیمان علیہ السلام کی سطوت سلطانی، سبعہ معلقہ اور سبعہ سیارہ کی بہار، صحاح ستہ کا اعتبار، سمندر کی سیرابی، ساگر کی سمائی، سماوات کی سیر، سماع کا سنگھار، جس سے دلوں کے بھید کھلتے ہیں اور سر تسلیم خم ہوتے ہیں اسی سے متعلق ہے اور یہی ''س'' سے سنیما کا بھی ہے کہ سین

Marfat.com

سینری سے سیر وتفریح ہے اور سلیقے سے استعمال ہو تو سبحان اللہ، سلیقہ نہ ہو تو سراپا سیاہ کاری''۔

(دلّی کی چند عجیب ہستیاں، ص: ۱۴، اشرف صبوحی، ۱۹۸۹ء، مکتبہ جامعہ، دہلی)

اشرف صبوحی کے اسلوب کے بارے میں اسلم فرخی کی رائے ہے:

''لکھتے ہیں تو گمان گزرتا ہے کہ چاند چاندنی چوک میں اتر آیا ہے۔ بات کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم جامع مسجد کی تہہ بازاری میں بیٹھے ہیں۔ برجستگی، بات سے بات، فقرے سے فقرہ پیدا کرنا بھائی دلّی (اشرف صبوحی) کی خصوصیت ہے''۔

(دلّی کی چند عجیب ہستیاں، ص: ۱۴، اشرف صبوحی، ۱۹۸۹ء، مکتبہ جامعہ، دہلی)

اشرف صبوحی نے ''خواجہ انیس'' کے خاکے میں اہلِ دلّی کی معاشی تنگ دستی کا تذکرہ درج ذیل الفاظ میں کیا ہے:

''آخر تا بکے، بریانی کے بدلے مونگ پلاؤ، شب دیگ کی جگہ شلجم کا سالن اور باقر خانیوں سے خمیری روٹیاں رہ گئیں''۔

(دلّی کی چند عجیب ہستیاں، ص: ۲۴، اشرف صبوحی، ۱۹۸۹ء، مکتبہ جامعہ، دہلی)

خواجہ انیس کا خاکہ فیوڈل سماج کے زوال کی داستان ہے۔ یہ ایک کردار نہیں بلکہ ایک تہذیب ایک سماج ایک عہد کے Irrelevent ہو جانے کا المیہ ہے، ایک تہذیبی مرثیہ ہے۔ اس خاکے کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ تاریخی جبر کا پنجہ بے رحمی سے اپنی گرفت شدید کیے جا رہا ہو۔ شہر کے نقشے بدل گئے، اقتدار بدل گیا لیکن خواجہ انیس کو احساس نہیں وہ آج بھی شاہی دور میں سانس لے رہے ہیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کو بادشاہ مان کر اس کے معمولی ملازمین کی خوشامد کر کے انعام واکرام یا نوکری کی توقع کرتے ہیں۔ میر باقر علی داستان گو خاکہ، بے قدری اور ناقدردانوں کے درمیان اہلِ فن کی جانسوز تنہائی کا المیہ ہے۔ ان کی داستانیں سننے والا کوئی نہیں۔ اب وہ گلی گلی، اپنی داستانیں، قصے کہانیوں کی کتابیں بیچا کرتے ہیں۔ میر باقر علی ایک عہد کی تہذیبی قدر تھے، داستان گوئی ان کا پیشہ تھا۔ اشرف صبوحی نے دلّی میں داستان گوئی کی ابتدا کے بارے میں اسی خاکے

Marfat.com

میں لکھا ہے:

''جب تک سپاہیانہ جوش اور فتوحات کے ولولے رہے۔ اندر اور باہر کا وہی نقشہ تھا۔ تیر اندازی، شمشیر زنی، کشتی، گھوڑے کی سواری کھیلوں میں داخل تھی۔ وہ وقت نہ رہا۔ حکومت دوسرے رنگ پر آ گئی تو رزم نے بزم کی صورت اختیار کر لی۔ خون آشامی کے جذبات، مرغ بازی، بٹیر بازی وغیرہ میں اور سواری شکاری کے خیالات ناچ رنگ اور دوسرے مشاغل میں بدل گئے۔ حیات متحرک پر جمودی کیفیت طاری ہوئی۔ تمام دن مسند تکیہ لگائے بیٹھنے میں اعضا شل ہو جاتے تھے۔ راتوں کی نیند بدمزہ ہونے لگی، لوریوں کی ضرورت پڑی، قصے کہانیاں شروع ہو گئیں یہ گویا داستان گوئی کی ابتدا ہے۔ خواہ اس کا موجد ایران ہو یا ہندوستان لیکن ہے یہ قوم کی غنودگی اور حکومت کی افسردگی کے دور کی پیدائش''۔

(دلّی کی چند عجیب ہستیاں، ص:۵۱۔۵۰، اشرف صبوحی، ۱۹۸۹ء، مکتبہ جامعہ، دہلی)

قوموں کے عروج و زوال کا مظہر ادب ہوتا ہے۔ داستان گوئی ہمارے بے عمل قومی کردار کا آئینہ ہی سہی لیکن اس میں صدیوں کی تہذیب معاشرت اور الفاظ کا سرمایہ محفوظ ہے۔ مٹھو بھٹیارہ، گھمی کبابی، ملّن نائی، مرزا چپاتی، سیدانی بی بی، میر ٹوٹرو، گنجے نہاری والے، نیازی خانم، میاں حسنات، بابو مٹکینا، پرنانی، دلی کی عوامی تہذیب اور سماج کے وہ کردار ہیں جن کے وجود میں تہذیب مٹنے اور بدلنے کا دکھ ہے جو بدلتے ہوئے سماجی تہذیبی منظر نامے کی تاب نہیں لا پا رہے، وہ خود بدل نہیں سکتے، ان کی زبان، اخلاقیات، سماجی اعمال گویا ایک نقطے پر جامد ہو گئے ہیں ان کا محور گم ہو گیا ہے۔ مرزا چپاتی کے خاکے میں اردو کی اقسام شمار کی ہیں''۔

(دلّی کی چند عجیب ہستیاں، ص:۹۷۔۹۶، اشرف صبوحی، ۱۹۸۹ء، مکتبہ جامعہ، دہلی)

''دیکھو اول نمبر پر تو اردوئے معلّیٰ ہے۔ جس کو ماموں حضرت اور ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے بولتے تھے۔ وہاں سے شہر میں آئی اور قدیم شرفا کے گھروں میں آ چھپی، دوسرا نمبر قل اعوذی اردو کا ہے جو مولویوں،

واعظوں اور عالموں کا گاگھوٹی رہتی ہے۔ تیسرے خودرنگی اردو ہے یہ
ماں ٹینی، باپ کلنگ والوں نے رنگ برنگ بچے نکالے ہیں۔ اخبار اور
رسالوں میں اسی قسم کی اردو ادب کا اچھوتا نمونہ کہلاتا ہے۔ چوتھا ہڑ دنگی
اردو، مسخروں اور آج کل کے قومی بلم ٹیروں کی منہ پھٹ زبان ہے۔
پانچویں لفنگی اردو ہے جسے آکا بھائیوں کی لٹھ مار کڑاکے دار بولی کہو، یا
پہلوانوں کرخنداروں، ضلع جگت کے ماہروں کی پھبتی بازوں انگریز
ہندوستانیوں، ٹوپ لگائے ہوئے کرانی، دفتر کے بابو چھاؤنیوں کے
سوداگر وغیرہ بولتے ہیں۔ پھر ایک سربھنگی اردو ہے یعنی چرسیوں بھنگڑوں
بینواؤں اور تکیے داروں کی زبان''۔

زبان بدلنے کا سلیقہ فرد کی تہذیبی زندگی کے معیار، مطالعے اور خاندانی تربیت سے تعلق رکھتا ہے۔ انسان کی اولین تربیت اسی اہم Tool کے ذریعہ ہوتی ہے۔ زبان کا تربیت وتہذیب سے قریبی تعلق ہے۔ مرزا چپاتی کی زبان سے ملاحظہ ہو:

''سیدابھی تم نے کیا دیکھا ہے اور کیا سنا ہے؟ قلعہ آباد ہوتا، دربار دیکھے ہوتے
تو اصلی زبان کا بناؤ سنگھار نظر آتا۔ اب تو ہماری زبان بنی ہوئی ہے، وہ لچیلی
چونچلے کی باتیں، شریفوں کے انداز، امیروں کی آن، سپاہیوں کی اکڑفوں، وہ
خادمانہ خوردانہ آداب وانکسار، شاعروں کے لچھے دار فقرے، شہروالوں کا میل
جول، پرانے گھروں کے رسم و رواج، وہ مروت، وہ آنکھ کا لحاظ کہاں؟
مجلسوں، محفلوں کا رنگ بدل گیا، میلے ٹھیلے پرانے کرتب، اگلے ہنر سب مٹتے
جاتے ہیں۔ اشراف گردی نے بھلے مانسوں کو گھر بٹھادیا۔ فیل نشین پالکیوں
میں بیٹھنے والے کھپریلوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ مفلسی ناداری نے رذالوں
کے آگے سر جھکوادیے، موری کی اینٹ چوبارے چڑھ گئی، کم ظرفوں ٹینسیوں
کے گھر میں دولت پھٹ پڑی، زمانہ جب کمینوں کی پشتی پر ہوتو خاندانوں کی
کون قدر کرتا ہے''۔

(دلی کی چند عجیب ہستیاں، ص:۹۷۔۹۶، اشرف صبوحی، ۱۹۸۹ء، مکتبہ جامعہ، دہلی)

Marfat.com

''میاں حسنات'' کے خاکے میں دہلوی زبان کی خوبی بیان کی ہے:

''ان کی باتوں میں کچھ ایسا بھول پن اور مٹھاس ہوتی ہے کہ گھنٹوں بے تکان سنے جاؤ، مجال ہے طبیعت اکتا جائے۔ وہ اپنی آنکھوں دیکھے اور کانوں سنے واقعات کی ایسی سچی، رنگ آمیزی کے بغیر تصویر کھینچتے ہیں کہ سماں بندھ جاتا ہے۔ ان کی منجھی ہوئی زبان دلی کی خاص اردو اور لچھے دار تقریر تبرک معلوم ہوتی ہے۔ افسوس قلعے کی یہ اینٹیں نکل نکل کر پہلے تو دلی کے روڑے بنیں، پھر یہ روڑے بھی نہ رہے، ایک ایک کر کے قبر کے گڑھوں میں پٹ گئے''۔

(دلّی کی چند عجیب ہستیاں، ص: ۲۰۳، اشرف صبوحی، ۱۹۸۹ء، مکتبہ جامعہ، دہلی)

مرزا چپاتی اشرف صبوحی کے خاکوں میں اہم خاکہ ہے کیوں کہ اس میں دہلوی تہذیب کے مرقعے محفوظ ہیں، اقتباس ملاحظہ ہو:

''درباری اور بازاری لوگ لباس سے پہچانے جاتے تھے۔ عام طور پر اپنی شکل و شباہت، تن و توش جسامت اور پیشے کے مطابق کپڑا پہنا جاتا تھا تا کہ دور سے دیکھ کر پہچان لیں کہ کس خاندان کا اور کیسا آدمی ہے؟ اگر نوجوان ہے تو ایک ایک ٹانکے پر جوانی برستی ہے، بوڑھا ہے تو پیری اور سادگی ٹپکتی ہے، بانکوں کا بانکپن، چھیلاؤں، ملاؤں کی ملائی، پہلوانوں کی پہلوانی، رذالوں کی رذالت اور شریفوں کی شرافت لباس سے صاف بھانپ لی جاتی تھی۔ چھوٹے آدمی جس پوشاک کو اختیار کر لیتے تھے بھلے مانس چھوڑ دیتے تھے۔ دو پلڑی ٹوپیوں کا رواج تھا، مگر چوگوشی گول مغلئی تاجدار ٹوپیاں مغل بچے اور شریف زادے پہنتے تھے، قلعے کے آنے جانے والوں میں مندلیلیں، بناری دوپٹے، گوٹے دار پگڑیاں مسلمانوں کا حصہ تھا۔ درباری جامہ بھی پہنا کرتے تھے، امراؤ جیغہ سرپیچ اور شہزادوں میں کلغیاں بھی مروّج تھیں۔ ہندوؤں میں پہلے جامے کا زیادہ دستور تھا پھر نیم جامہ اور الٹی چولی کے انگرکھے پہننے لگے۔ علاوہ ازیں احالق، اچکن، قبا، عبا، جبہ، چغہ مرزئی وغیرہ بھی استعمال ہوتے تھے۔

پانجامے یا تو تنگ موری کے یا اک برے یا غرارے دار ہوتے تھے۔
داڑھی، مونچھوں کی وضع قطع بھی ہر خاندان اور ہر پیشے کی علیحدہ تھی''۔

(دلی کی چند عجیب ہستیاں، ص:۹۸، اشرف صبوحی، ۱۹۸۹ء، مکتبہ جامعہ، دہلی)

تفریحی مشاغل دلی اور لکھنؤ والوں کے ملتے جلتے تھے اور اکثر دونوں ریاستوں کے صاحبِ ہنر آتے جاتے رہتے تھے۔ دلی والوں کے تفریحی مشاغل اشرف صبوحی نے اس طرح بیان کیے ہیں:

''شریفوں کا شغل ڈنڑ، مگدر، بانک، بنوٹ، پھکیتی، اکنگ، تیراندازی، نیزہ بازی، پنجہ کشی تھا۔ تیراکی کشتی شکرے اور باز کا شکار پتنگ لڑانا، کبوتر بازی وغیرہ سے دلچسپی تھی... پھکیت اور بنوٹے ایسے ہوتے تھے کہ موقع پڑتا تو رومال میں صرف پیسہ یا ٹھیکری باندھ کر حریف کے سامنے آجاتے اور دو جھکائیوں میں ہتھیار چھین لیتے۔ تیراکی کا یہ حال تھا کہ پالتی مارے ہوئے پانی پر بیٹھے ہیں جیسے مسند پر۔ ایک زانو پر پیچوان لگا ہوا ہے، دوسرے پر رنڈی بیٹھی ہے، دھواں اڑاتے اور ملہار سنتے چلے جاتے ہیں''۔

(دلی کی چند عجیب ہستیاں، ص:۹۹-۹۸، اشرف صبوحی، ۱۹۸۹ء، مکتبہ جامعہ، دہلی)

ایک خاکے میں لکھنؤ کے ماہر پتنگ باز کا خاکہ سنیے:

''میر تنکیا لکھنؤ کے واجد علی شاہ پتنگ باز تھے۔ کاکریزی رنگ، گول چہرہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بڑی ناک، دانتوں میں کھڑکیاں، سر پر لڑ بڑے پٹھے، خشخاشی داڑھی، چھاتی کھلا سنجاف دار ڈھیلا ڈھالا انگرکھا، سر پر دو انگل کی کلابتو کے حاشیے کی ٹوپی، پاؤں میں مخمل گرگابی۔ کلے میں گلوری''۔

(دلی کی چند عجیب ہستیاں، ص:۱۰۰، اشرف صبوحی، ۱۹۸۹ء، مکتبہ جامعہ، دہلی)

تشبیہہ، علامتوں کے استعمال سے پوری شخصیت چند جملوں میں بیان کی گئی ہے۔ اشرف صبوحی نے ایسے کئی خاکے لکھے ہیں جو کوئی اور خاکہ بیان کرتے ہوئے ذیلی بیان کی صورت میں آئے ہیں، ان میں الفاظ پر گرفت، موزوں و مناسب ضرب الامثال اور

متوازن اندازِ بیان ہے لیکن تصویر دھندلی یا ادھوری نہیں رہتی۔ شخصیت کا سراپا قاری کی آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔ مکالماتی انداز میں ایک اور منظر دیکھیے:

مرزا ''میاں ہر بات میں ایک شان تھی ایک قاعدہ تھا اور ہزاروں غریبوں کی روٹیوں کے سہارے۔ معمول تھا کہ عصر کا وقت ہوا اور سلیم گڑھ پر جمگھٹ لگا۔ بڑے بڑے پتنگ دوتادی، اورسہ تادی تکلّیں دوڑ کی چرخیاں لے کر شاہی پتنگ باز پہنچ گئے خلوت کے امیر اور شوقین شہزادے مرزا بنّو، مرزا کدال، مرزا کالٹین، مرزا چڑیا، مرزا جھرجھری بھی آموجود ہوئے، یہ سلاطین زادے بہت منہ چڑھے تھے۔

میں: حضرت یہ نام کیسے؟ کیا اسی بولی کا نام اردوئے معلّٰی ہے؟

مرزا: کچھ پڑھا لکھا بھی، یا گھاس ہی کھودتے رہے ہو۔ ارے زبان کی ٹکسال قلعے ہی میں تو تھی، وہاں محاورات نہ ڈھلتے تو کہاں ڈھلتے، طبیعتیں ہر وقت حاضر رہتی تھیں، ہر بات میں جدت مدنظر تھی۔ ہنسی مذاق میں جو منہ سے نکل گیا گویا سکہ ڈھل گیا۔ کسی کے پھٹے پھٹے دیدے ہوئے مرزا بٹو کہہ دیا، لمبا چہرہ، چگی داڑھی دیکھی، مرزا چُکّا یا مرزا کدال کہنے لگے۔ چپکلے چہرے والے پر چوپال کی اور ٹھگنے پر گھٹنے کی پھبتی اڑادی۔ غرض کہ مرزا چیل، مرزا جھپٹ، مرزا ایاہو، مرزا رنگیلے، مرزا رسیلے، اسم بامسمّٰی تھے''۔

(دلّی کی چند عجیب ہستیاں، ص: ۱۰۲، اشرف صبوحی، ۱۹۸۹ء، مکتبہ جامعہ، دہلی)

آج یہ زبان، یہ محاورے، دلّی اور باہر والوں کے لیے ایسے اجنبی ہیں کہ، سن کر ہکا بکا منہ تکا کرے ہیں، کہ اس کا مطلب کیا ہوا۔ قوموں کی تمدنی تہذیبی وراثت کا سرمایہ ان کی زبان میں محفوظ رہتا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول تک ہمارا ملک تکنیکی اور سائنسی ترقی میں پسماندہ تھا۔ البتہ تہذیبی ترقی بے مثال تھی۔ ہندوستان کا ادبی تہذیبی ورثہ، بے مثال ہے۔ ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے اور اہل علم اور سماج کے بزرگوں کی ذمے داری ہے کہ وہ ایسے جتن کریں کہ یہ اگلی نسلوں تک بخیر وخوبی منتقل ہو جائیں۔ معاشی دوڑ نے طبقاتی تقسیم میں شدت پیدا کردی ہے۔ اب ہر معاشی طبقہ اپنے سے کم تر طبقے کو کچل کر آگے نکلنا چاہتا ہے۔ اس دوڑ میں اخلاقی، تہذیبی اقدار کہیں گم ہوگئی ہیں۔ اردو

Marfat.com

والے اردو نہیں جانتے ہندی والے ہندی نہیں جانتے۔ بنگالی، بنگالی زبان نہیں جانتے، گجراتی گجراتی زبان نہیں جانتے۔ آخر ہم کس تہذیب کی طرف جا رہے ہیں؟ ہماری دیسی تہذیبوں کا مستقبل کیا ہے؟ ہمارے گھروں میں ہندوستانی زبانوں کے بجائے انگریزی کتابوں کی لائبریری ضرور ہے۔ ہم اور ہمارے بچے انگریزی اخبار پڑھتے ہیں، انگریزی فلمیں دیکھتے ہیں اور انگریزی کھانے کے عادی ہیں۔ زمین پر بیٹھ کر دستر خوان کے آداب خوردنی سے ناواقف ہیں، تہوار، عرس، میلے میں شرکت ختم ہوئی۔ شادی بیاہ کی رسمیں بھی ختم ہوئیں۔ نکاح ولیمہ، اللہ اللہ خیر صلّٰی۔ باورچیوں کو کھانے پکانے نہیں آتے، خواتین، نوکر پیشہ ہیں، درزی کو اچکن شیروانی کا فرق نہیں معلوم، پہننے والوں کو یہ نہیں معلوم کہ شاہی زمانے میں غلام گردش والوں کا لباس، نوشاہ کا جوڑا ہو گیا ہے۔ طوائفوں رقاصاؤں کے لباس، شان سے ہمارے گھروں کی نئی نسل پہنتی ہے۔ موسم کے لحاظ سے گھروں میں کھانے پکنے ختم ہو گئے۔ عورتوں کا سر پر دوپٹہ غائب، مردوں کو جو ٹوپی ملی، نماز کے لیے، سر ڈھک لیا۔ اللہ اللہ قدریں مٹتی ہیں تو تہذیبی سماج کس طرح مٹتا ہے۔ کہنا سننا دونوں مشکل۔

اشرف صبوحی کے خاکے خاکے نہیں، ہندوستانی تہذیبی زندگی کی بہترین اقدار کے مرقع ہیں۔ انھیں پڑھنا، انھیں یاد رکھنا، ایک تہذیب کی بازیافت ہے۔ اشرف کے خاکوں میں دہلوی رسم و رواج، اخلاق و آداب، رہن سہن، کھانا پینا، اوڑھنا، بچھونا، زندگی کے ہر پہلو کی زندہ تصویریں ہیں۔

اشرف صبوحی کے تراجم اخذ کے عمل کے قریب ہیں انھوں نے مغربی (انگریزی) تخلیقی تجربوں کو مشرقیت میں منقلب کر دیا ہے۔ سلمٰی، بن باسی دیوی کا ناولٹ اور ناول ہیں جو انگریزی فن ناول نگاری کا عکس ہیں اور روایتی مغربی فکشن کے فن کی یاد دلاتے ہیں جو اشرف صبوحی کے دور کے معاصر فنی رجحانات تھے۔ سلمٰی یا بغداد کے جوہری ۱۸۶ صفحات پر مشتمل دس ابواب میں منقسم ناولٹ ہے جو انگریزی سے ماخوذ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن بغداد کے جوہری کے عنوان سے شائع ہوا۔ زیر نظر ایڈیشن ۱۹۴۶ء میں تیسری بار شائع ہوا۔

Marfat.com

مرزا محمد سعید دہلوی نے سلمٰی کے تعارف میں لکھا ہے:

''مغربی انسانوں کو مشرقی انداز اور اسلوب سے بیان کرنے میں ان کا خاص ملکہ ہے اور ان کے ترجموں پر اصلی اور طبع زاد ہونے کا گمان گزرتا ہے''۔

(سلمٰی، اشرف صبوحی، ص: ۳، طبع سوم ۱۹۴۶ء)

اسلوب کے سلسلے میں مرزا سعید دہلوی لکھتے ہیں:

''اشرف صبوحی کی تحریر کا ایک اور نمایاں وصف دلّی کے محاورات اور روز مرہ کا استعمال ہے جس کو ان کی زبان دانی کا ثبوت خیال کیا جا سکتا ہے۔ ایسی زبان اب بہت کم ادیب استعمال کرتے ہیں۔ علامہ راشد الخیری اس اسلوب کے موجد تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کی تحریر بھی اس خاص طرز کا ایک نہایت معتدل اور دلکش نمونہ تصور ہو سکتی ہے۔ اشرف صبوحی صاحب کو ان بزرگوں کا پیرو سمجھنا چاہیے''۔

(سلمٰی، اشرف صبوحی، ص: ۴، طبع سوم ۱۹۴۶ء)

سلمٰی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ ایک لطیف اور پر معنی تمثیل ہے، جس میں فلسفۂ حیات اور فلسفۂ حسن کے بہت سے رموز و نکات پوشیدہ ہیں۔ تاہم قصے کی دلچسپی کا انحصار مصنف کے خیال کی نزاکت اور بیان کی لطافت پر ہے''۔

(سلمٰی، اشرف صبوحی، ص: ۴، طبع سوم ۱۹۴۶ء)

بن باسی دیوی ۱۹۴۵ء میں دوسری بار شائع ہوا۔ ۲۸۶ صفحات پر مشتمل ہے اور مغرب میں انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقائی سفر کی داستان پر مشتمل ہے۔ انسان تسخیر کائنات کے دوران جن حیرتوں، آزمائشوں اور تجربات سے گزرا ہے ان کا دلچسپ بیان ہے۔ اس میں یونانی ہندوستانی اصنام اساطیر کا تجسس سے معمور کیفیات کو قلم بند کیا گیا ہے جنھیں قصہ کا تسلسل برقرار رکھتے ہوئے بہت عنوانات اور ذیلی عنوانات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثلاً ''کریا کرم'' موت کی قدیم رسومات ''سورج کے پجاری'' سوریہ ونشیوں کی رسومات ''جل بھری'' جل پری کے اسرار سے متعلق، پربت کا لبعید، ہیشیا، مرگ آسنی، سنگھ

Marfat.com

جی مہاراج وغیرہ ابتدائی انسان کی فکر اور حیرتوں کا آئینہ دار ہے۔ شکتی اور بن باسی دیوی اس ناول کے مسلسل اور مستقل کردار ہیں۔ شکتی بھی طاقت اور بن باسی بھی رومانس، شکتی ہی رومانس بھی ہے یہ سماجی تبدیلی میں اہم قوت اور کردار کے مماثل ہے۔ ناول کا اساطیری نظام تخلیقی ہے۔ ناول پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے گویا ہم نو تخلیق کائنات کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور ہم نامانوسیت سے مانوسیت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ دہلوی نثر کی دھیمی لے، لہجہ کی نرمی، قاری کو بہا لے جاتی ہے۔ اس میں سماجی ارتقاء کے فکری فلسفیانہ Dynamic کو جس خوبی سے بیان کیا گیا ہے وہ آج کے فکشن نگار کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

''جھروکے'' ۱۴ قلمی خاکوں کا مجموعہ ہے جن میں کچھ خاکے نما کہانیاں ہیں، افسانے ہیں۔ ترلوکی پنڈت عام شخص کا خاکہ جو بے عمل ہے خوابوں خیالوں کی دنیا میں رہتا ہے۔ ضعیف الاعتقادی کی بیساکھیوں پر زندگی جینا چاہتا ہے۔ یہ قصہ در قصہ خاکہ ہے۔ ''بلی'' کا کردار تمثیلی ہے یہی اس خاکے کا متحرک کردار ہے جو غیر مساوی معاشی تقسیم، سماجی غیر مساوات اور اس کی وجوہات کا انکشاف کرتے ہوئے ترلوکی ناتھ کو زندگی کی جدوجہد کا درس دیتی ہے۔ ''مرزا گوہر'' بھی ایک فرد کے گرد گھومتی کہانی ہے۔ مرزا گوہر جاگیردارانہ نظام کے زوال کی بدترین مثال ہیں۔ اس تہذیب کے سب ہی عیوب مرزا گوہر میں موجود ہیں۔ اسے زندگی کی بہتری کے لیے کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ ''رضائی'' جاپانی کہانی سے ماخوذ ہے جس میں طبقاتی کشمکش اور سماجی نظام میں تفریق پر دھیمے دھیمے انداز سے تبصرہ کیا گیا ہے۔ ''موسارانی'' دلچسپ افسانہ ہے۔ اس کا مرکزی کردار چوہیا ہے جو طاقت اور اقتدار کے حصول کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہے۔ وہ جادوگر دوست سے چوہیا سے منقلب ہو کر مختلف روپ اختیار کرتی ہے لیکن اسے سکھ طاقت اور اقتدار کہیں نہیں ملتا اور آخر کار اپنے اصل روپ میں ہی اسے سکون ملتا ہے۔ یہ افسانہ پڑھتے ہوئے ذہن میں محمد حسین آزاد کے مضمون ''انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا'' کی طرف جاتا ہے۔ یہ مناسبت صرف مصنوعی ہے۔

اس مجموعے کی دو کہانیاں ''سدھانتی'' اور ''خواجہ شریف'' قابلِ ذکر ہیں۔ سدھانتی سائنس فکشن کی بہترین مثال ہے۔ اس کہانی میں مدراسی ڈاکٹر ایئر، ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی

Marfat.com

تخلیق کرتے ہیں ۔ یہ کہانی ۲۰۵۱ کے ہندوستان کے تناظر میں لکھی گئی ہے۔ ڈاکٹر ایز مصنف کو Bonsai تکنیک سے استفادہ کر کے تخلیق کیے ہوئے بندر دکھاتا ہے اور زیر تخلیق ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا مشاہدہ بھی کراتا ہے۔ ناول کا اقتباس درج ذیل ہے:

''ڈاکٹر نے کچھ کہنے سے پہلے کرانو میڈ سے اس کی حرکات گنیں، پھر اس پر ایک آلہ لگایا، جو دل کی حالت معلوم کرنے سے مشابہہ تھا۔ بعد ازاں مسٹر کشور کی طرف بڑی سنجیدگی سے دیکھا اور اس چیز کی طرف اشارہ کر کے کہا'' یہ ایک مصنوعی بچہ ہے، سائنس کی جدوجہد کا انتہائی مرحلہ''۔

(جھروکے، اشرف صبوحی، ص:۱۴۱، کتب خانہ علم و ادب، دہلی ۱۹۴۴ء)

دوسرے مقام پر ڈاکٹر ایز اپنی لیبارٹری میں کشور کو مزید مشاہدہ کراتے ہیں:

''اتنے میں ڈاکٹر نے ایک اور پوشیدہ سلنڈر نکالا، اس چھوٹے سے شیشے کے آلے میں ایک چھوٹا سا بندر، اچھلتا کودتا نظر آیا۔ یہ بندر دو انچ سے بڑا نہ تھا۔ اس کی چار آنکھیں اور چار ہی کان تھے...چین میں جو بونے درخت ہوتے ہیں ان ہی کے اصولوں پر میں بونے بندر پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ یہ جانور قطعاً مصنوعی نہیں ہے تاہم اس میں بہت کچھ میری صنعت کو دخل ہے''۔

(جھروکے، اشرف صبوحی، ص:۱۴۳، کتب خانہ علم و ادب، دہلی ۱۹۴۴ء)

اس کہانی میں اشرف صبوحی نے سائنس فکشن کی فضا اور ماحول کو بہت کامیابی سے برتا ہے۔

خواجہ شریف، رومانوی حقیقت پسندی کا مظہر ہے۔ جس میں باپ ماں اور بیٹا دونسلوں کے فرد ہیں، نئے نظریات کا روایتی زندگی سے ٹکراؤ اور کشمکش اس کہانی کو مزید Readeble بنا دیتے ہیں۔ جدید ہندوستان کا سب سے سنجیدہ مسئلہ آبادی کا اضافہ ہے جو کثرتِ اولاد کا نتیجہ ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کی تلقین ہے اور اس تصور کو نئی نسل پرانی نسل کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ شادی بیاہ اور عام زندگی میں رسم و رواج کی وجہ سے فضول خرچی اور مذہبی اقدار کی غلط تفسیر کے خلاف احتجاج کیا گیا ہے۔ کثرت

Marfat.com

اولاد کے منفی اثرات پر عبرت انگیز لہجہ میں بحث کی گئی ہے اور سماجی تبدیلی اور ترقی میں سست روی کا سبب انہی وجوہات کو بتایا گیا ہے۔ اقتباس درج ذیل ہے:

''شادی کرنا ہم نے مانا کہ ایک مذہبی فرض ہے، پھٹیل کی دنیا میں آبرو، قانونِ الٰہی کا چور اور شادی کے بعد بچے ہونے بھی لازمی ہیں۔ زندگی کی باؤلی ہنڈیا چٹپٹی انہی سے بنتی ہے۔ اللہ ہی نہ چاہے تو خیر۔ یا کسی کو ہنڈیا ہی نہ جڑے اور جڑے بھی تو مال مسالہ نہ ہو۔ اس کی سند نہیں ورنہ شادی کی اصل رونق تو چیں پیں ہی سے ہے۔ خوشی کے ڈھول تو بچے ہی ہوتے ہیں لیکن اگر ذرا انسان اپنی جون میں رہے اور بالکل جانور نہ بن جائے تو لازم یہ ہے کہ ہوکا نہ کرے، تھوڑا ضبط سے بھی کام لے۔ کسان بھی جب تک ان کی پہلی بوئی ہوئی کھیتی کٹ کر بازار نہیں دیکھ لیتا، دوسرا بیج ڈالنے سے باز رہتے ہیں۔ اتنے میں زمین بھی اپنی قوت بہم پہنچا لیتی ہے اور اس کی محنت کا ثمر بھی مل جاتا ہے''۔

(جھروکے، اشرف صبوحی، طبع اول ۱۹۴۴، ص: ۱۹۴)

ایک اور اقتباس درجِ ذیل ہے:

''جیسے ندیدے مہمان ویسا ہی آخور کی علت۔ دسترخوان پہ روک ٹوک نہ دیکھ، پل پڑے۔ بدہضمی ہونی ہی تھی۔ بچے نکلوانے کا ہیضہ ہوگیا۔ بیکاری کا شغل ہی یہ ہوگیا ہے کہ بچے بنائیں''۔

ایک اور اقتباس درج ذیل ہے:

''ذوقؔ مرحوم نے کہا ہے:

توڑا کمر شاخ کو کثرت نے ثمر کی
دنیا میں گرانباریٔ اولاد غضب ہے

نعمت کو غضب الٰہی کہنا بظاہر اچھا نہیں معلوم ہوتا، لیکن نعمت کو نعمت کی طرح سمجھا بھی جائے۔ اولاد آج کل جس شان سے پیدا کی جاتی ہے، اسے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ نے کرم کیا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ حیوانیت

Marfat.com

کی ابلتی ہوئی دیگچی کا سرپوش الٹ گیا''۔

(جھروکے، اشرف صبوحی، طبع اول ۱۹۴۴، ص:۶ - ۱۹۵)

اشرف صبوحی کی کہانیوں میں اور خاکوں میں اکثر طبقاتی کشمکش، مفلسی، بیروزگاری، جہالت، مردہ اقدار کو گلے لگانا جیسے مسائل پر تبصرہ ملتا ہے، جابجا یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا بیسویں صدی کے نصف اول کی جدید ادبی صورتحال سے وہ انجانے طور پر متاثر ہورہے ہیں۔ ان کی سرگرم تصنیفی زندگی کا زمانہ ۳۵ء سے شروع ہوتا ہے۔ یہ زمانہ صاحبِ قلم اور باشعور فرد کے نظریاتی کشمکش اور سیاسی جدوجہد کا ہے۔ لیکن اس کی دھندلی پرچھائیاں بھی اشرف صبوحی کی کہانیوں میں نہیں ملتیں۔ اصل میں اشرف صبوحی کی ذہنی دنیا دہلوی تہذیبی دنیا تھی۔ تہذیب واخلاق سے وابستہ شخصیات کے کردار اور کھوئی وراثت، اشرف صبوحی کے موضوع تھے۔ اس کے باوجود سیاسی ہنگامہ خیزیاں اور معاشی نظام کی نوتشکیل کی جدوجہد کے نقش اشرف صبوحی کی کہانیوں میں واضح نہ ہونا، بہت سے سوالات کے جوابات کا متقاضی ہے اور یہ ایک علیحدہ موضوع ہے کہ ایک صاحبِ تصنیف، اس صدی کے نصف اول میں سیاسی تحریکات اور رجحانات اور اس سے پیدا ہوئی تبدیلیوں سے متاثر کیوں نہ ہوسکا؟۔

اشرف صبوحی کا عہدِ تصنیف جدید اردو نثر کا اہم دور ہے۔ سیاسی فلسفیانہ اور جدید علوم سے متعلق نظریات وافکار ان کے ہم عمروں کو غیر معمولی طور پر متاثر کررہے تھے۔ ان کی کہانیوں میں اور خاکوں میں نئے عہد کے شعور کی پرچھائیاں اور نقوش ملتے ہیں لیکن شعوری آگہی کا احساس نہیں ملتا۔ اشرف دہلوی نثر کے معتبر صاحبِ قلم کی آخری نسل کے فرد تھے جنھوں نے وہ آنکھیں دیکھی تھیں جنھوں نے غدر سے پہلے اور بعد کے ہندوستان اور خصوصاً دلی اور قلعے کو دیکھا تھا۔

اشرف صبوحی کی تحریریں تہذیبی نثر کے آخری نمونوں کے طور پر ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

□□

حاجی انیس دہلوی

پرانی دہلی میں خانقاہ شاہ ابوالخیر کے سامنے چھتہ موم گران ہے۔ اس چھتہ کے دوسرے راستے سے باہر نکلیں تو دائیں طرف تھوڑے فاصلے پر درگاہ دادا پیر ہے۔ اسی چھتہ موم گران میں رہنے والے حاجی عنایت اللہ دہلوی کے ہاں ۱۳؍ربیع الثانی ۱۳۴۹ھ مطابق ۷؍ستمبر ۱۹۳۰ء کو ایک لڑکے کی ولادت ہوئی۔ اس لڑکے کا نام نعمت اللہ رکھا گیا جسے اہلِ دہلی نے حاجی نعمت اللہ اور اس کے بعد دنیائے اردو نے حاجی انیس دہلوی کے نام سے جانا۔ یہ حاجی نعمت اللہ انیس دہلوی بیسوئیں صدی کے اختتام سے ایک دن قبل یعنی ۳۰؍دسمبر ۲۰۰۰ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے اور اسی روز قبرستان مہندیان میں ان کی تدفین ہوئی۔

اہلِ علاقہ انھیں بھائی نیامت یا حاجی نیامت کہتے تھے۔ نعمت اللہ سے اپنے بگڑے ہوئے نام ''بھائی نیامت'' کے تعلق سے حاجی صاحب کہا کرتے تھے کہ بھائی راشن لینے کے لیے غریب اور ان پڑھ گھروں کی عورتیں اور بچے آتے تھے۔ پورا نام نعمت اللہ کہتے ہوئے انھیں کچھ دقت پیش آتی تھی۔ ایک دو بوڑھی عورتوں نے نیامت، نیامت کہنا شروع کیا اور ان ہی سے سن کر بچے اور بڑے ''بھائی نیامت'' کہنے لگے۔

حاجی انیس دہلوی نے پرائمری کی چار جماعتوں تک محلّہ قبرستان کے انجمن اسکول میں پڑھا۔ یہ اسکول اب اینگلو عربک نرسری اینڈ پرائمری اسکول کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے بعد پانچویں جماعت میں اینگلو عربک اسکول، اجمیری گیٹ میں داخلہ ہوا۔ لیکن پانچویں جماعت کی تعلیم پوری نہ ہو سکی اور نامساعد حالات کی وجہ سے تعلیمی سلسلہ منقطع

Marfat.com

ہو گیا۔ باضابطہ تعلیم کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکا۔ چوں کہ حاجی انیس دہلوی کو پڑھنے لکھنے کا شوق تھا اس لیے اردو، ہندی اور انگریزی اپنے طور پر پڑھتے رہے اور عمر کے آخری دور میں بھی یہی کہا کرتے تھے کہ تعلیم جاری ہے۔ وہ کسی کالج یا یونیورسٹی میں تو تعلیم حاصل نہ کر سکے لیکن اس دنیا کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کے تجربات اتنے وسیع تھے کہ بات کرنے پر گویا دبستان کھل جاتا تھا۔

ستر برس کی دھوپ گئی سر سے اے انیس
کچھ تجربوں کے نور نے اجلا بنادیا

ناسازگار حالات کے باعث بہت کم عمری میں عملی زندگی کا آغاز ہوا اور گھر کے معاشی حالات کی بہتری کے لیے ۱۹۴۴ء میں ایک راشن کی دکان پر منشی گیری کی ملازمت اختیار کی جہاں راشن کی پرچیاں بنانی ہوتی تھیں۔ راشن کی پرچیاں لکھنے کا یہ سفر پرچے سازی سے ہوتا ہوا آخر کار مخاطبوں سے پرچیاں لکھوانے تک پہنچا۔

۱۹۴۲ء میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ حاجی انیس دہلوی ارونا آصف علی کی بنائی ہوئی ''آصف کور'' کے والنٹیر کے طور پر اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ انگریزی سامراج کے خلاف خوب نعرے لگایا کرتے تھے۔ ان لڑکوں کے ذمہ یہ کام بھی تھا کہ سرکاری عمارتوں اور تھانوں پر انگریزی حکومت کے خلاف پمفلٹ لگائیں۔ چوں کہ یہ لوگ دہلی کی تمام گلیوں اور کوچوں سے واقف تھے اس لیے انگریزوں کے خلاف پمفلٹ لگا کر آسانی سے روپوش ہو جایا کرتے تھے۔ اس جدوجہد میں ارونا آصف علی کے ساتھ ساتھ دہلی میں کانگریس کے سرگرم کارکن رشید خاں بھی ان کے سربراہ تھے۔

حاجی انیس دہلوی نے ۱۹۴۶ء میں باقاعدہ کانگریس میں شمولیت کی اور سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ ۱۹۷۲ء میں انھوں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

جب ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کا سانحہ رونما ہوا تو یہاں کا جتنا پڑھا لکھا مسلم طبقہ تھا، اس نے مرکزی حکومت کے تبادلے کے ساتھ ساتھ پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا۔ خود حاجی صاحب کے بڑے بھائی (والد کی پہلی بیوی سے) جو کہ پوسٹ مین تھے، انھوں نے اور ان کے اٹھارہ ساتھیوں نے پاکستان جانے کے لیے فارم بھر دیا۔ لیکن جب ان کے والد کو

Marfat.com

علم ہوا تو انھوں نے سمجھایا کہ یہ ہمارا اپنا ملک ہے، ہمیں ہر حالت میں یہیں رہنا چاہیے۔ ان کے سمجھانے پر ان لوگوں نے پاکستان جانے کا ارادہ بدل دیا اور حاجی انیس دہلوی نے اس وقت کے وزیر مواصلات رفیع احمد قدوائی سے مل کر ان سب کے فارم منسوخ کروائے اور انھیں پھر سے نوکری پر بحال کرایا۔

جن سرکاری ملازمین نے پاکستان جانا منظور کرلیا تو ان لوگوں نے اپنی پناہ گاہ عارضی طور پر پرانا قلعہ اور ہمایوں کا مقبرہ بنائی کیوں کہ اس وقت پاکستان جانے والی اسپیشل ٹرین نظام الدین اسٹیشن سے روانہ ہوتی تھی۔ ان کے ساتھ پولیس اور افواج کا بھی انتظام ہوتا تھا تاکہ یہ لوگ حفاظت سے پہنچ جائیں۔

جب پناہ گزینوں کو ان کیمپوں میں رہتے کافی دن گزر گئے تو صفائی ستھرائی کا معقول انتظام نہ ہونے کے باعث غلاظت کی وجہ سے ہیضہ پھیل گیا اور لگاتار اموات ہونے لگیں۔ اس زمانے میں حاجی انیس دہلوی نے ایک سوشل ورکر کی حیثیت سے ان کیمپوں میں خدمات انجام دیں۔ خود حاجی صاحب کا بیان ہے:

> ''میں ابتدا سے ہی کانگریس سے وابستہ رہا ہوں۔ اس وقت میں کھدر دھاری تھا اور چوں کہ پرانا قلعہ میں مسلم لیگی ذہنیت کے لوگ زیادہ تھے تو انھوں نے کانگریسی ہونے کی وجہ سے ہماری خدمات کو قبول نہ کیا۔ ہمایوں کا مقبرہ کیمپ میں جو لوگ پناہ گزیں تھے ان کا تعلق مسلم لیگ سے اتنا گہرا نہ تھا۔ بہرحال میں نے ان حالات میں بھی تن من سے ان پریشان حال لوگوں کی خدمت کی''۔

اسی دوران انیس دہلوی سرکاری طور پر ملے راشن اور دوائیں پرانا قلعہ اور ہمایوں کے مقبرہ میں جا کر تقسیم کرتے تھے اور ان لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ حاجی صاحب نے مرنے والوں کے کفن دفن یعنی قبریں کھودنے کا فرض بھی انجام دیا۔ یہی نہیں بلکہ دہلی کے ان مخدوش علاقوں میں جہاں ہندو اور مسلمان دونوں مصیبتوں کا شکار تھے، بلا لحاظ مذہب وملت انسانیت کے ناطے یکساں راحت رسانی کا کام کیا۔

ملک کی تقسیم اور آزادی کے ساتھ جو خونیں کھیل شروع ہوا، اس پر آشوب دور میں

Marfat.com

حاجی صاحب کو ذاتی صدموں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے بارے میں حاجی انیس دہلوی نے بتایا کہ:

''انسانی اور سماجی رشتوں کے حوالے سے یہ کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی پوری قوم خدا کا نام لے کر اسی کے بندوں کی بلی چڑھا رہی تھی۔ جن بیبیوں کی کسی نے انگلی نہیں دیکھی تھی وہ ننگے سر اور خستہ لباس میں جائے پناہ کی تلاش میں بھوکی پیاسی ماری ماری پھر رہی تھیں۔ بڑا ہی اذیت ناک دور تھا۔ اسی زمانے میں میری ایک بہن جو بڑے اچھے علاقے میں رہ رہی تھیں، ان کا کچھ پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں گئیں۔ اس دور میں میری والدہ بھی زچگی کی حالت کا شکار ہو کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ان کو دفنانے کے لیے قبرستان بھی نہ جا سکے۔ کیوں کہ ۷۲ گھنٹے کا کرفیو لگا ہوا تھا۔ سو ان کو محلے کی سات سو سالہ قدیم درگاہ دادا پیر کی پائینتی میں دفنا دیا گیا۔ جب ان کو دفنانے کی تیاری کر رہے تھے اسی لمحے دو اور خواتین کے جنازے بھی آ گئے اور اس طرح ایک قبر میں تینوں کو سلا دیا گیا''۔

حاجی انیس دہلوی کو بچپن سے ہی فلم دیکھنے کا شوق تھا۔ حد تو یہ ہے کہ فلم کا پہلا شو دیکھنا اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ لوگ زندہ رہنے کے لیے سانس لینا لازمی قرار دیتے ہیں۔ اس زمانے میں فلم کے رسیا کچھ حلقوں میں فلم کا پہلا شو دیکھنا باعثِ افتخار سمجھا جاتا تھا اور جمعہ کا دن ان لوگوں کے لیے عید کی طرح آتا تھا۔ حاجی انیس دہلوی کے اس شوق کی حدیں جنون کی حدوں سے جا ملتی ہیں، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ فلم ''آن'' کے ریلیز ہونے کا دن ہی ان کے پہلے لڑکے کی تدفین کا بھی دن تھا۔ خود حاجی صاحب کا بیان ہے کہ:

''اپنے لختِ جگر کو دفنا کر جب میں فلم ''آن'' کا افتتاحی شو دیکھنے گیا تو منیجر پر گویا حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ منیجر نے رنجیدہ خاطر ہو کر کہا میاں آج ہی تو آپ کے بچے کی تدفین ہوئی ہے اور آج ہی آپ فلم دیکھنے

Marfat.com

چلے آئے؟ تو میں نے صبر کی دہلیز سے انھیں جواب دیا کہ پہلے دن کا پہلا
شوہر کہاں مل سکے گا''۔

شروع سے ہی حاجی انیس دہلوی کا رجحان صحافت کی طرف تھا۔ ان کا پہلا سیاسی مضمون ''ہندی مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ'' کے عنوان سے ۱۹۴۷ء میں ۱۹/اکتوبر کے روزنامہ ''انصاری'' میں شائع ہوا۔ اس سے پہلے اسی سال ۲۸/اگست کے روزنامہ ''انصاری'' میں ہی ان کی ایک کہانی ''بے جوڑ شادی'' بھی شائع ہوچکی تھی۔ پھر انھوں نے اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے دیواری اخبار ''اجالا'' کی داغ بیل ڈالی۔ یہ دیواری اخبار خانقاہ شاہ ابوالخیر کے نزدیک آویزاں کیا جاتا تھا اور ۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک لوگوں کے ذوق کی تسکین کرتا رہا۔ ۱۹۶۰ء میں ہفتہ وار ''ہمارا رہبر'' شائع کرنا شروع کیا اور پھر یہاں سے ''رہبر'' ان کی زندگی کا جزولاینفک بن گیا۔ ''رہبر کارنر''، ''رہبر آفیسٹ پرنٹرز''، ''رہبر کمپیوٹرز'' اور ''رہبر یونانی دواخانہ'' کے ساتھ ان کا سفر آخر تک جاری رہا۔

۱۹۵۲ء تا ۱۹۶۵ء حاجی انیس دہلوی نے پاکستان کا سفر کرنے کے خواہش مند مسلمانوں کے لیے پاسپورٹ اور ویزا حاصل کرنے کی سہولیات فراہم کیں اور سعودی عرب کے معلم احمد رمضانی کے نمائندہ کے طور پر عازمین حج کی بھی خدمت کی۔

یوں تو حاجی انیس دہلوی نے اردو میں متعدد ماہنامے ''نرالی دنیا''، ''سازش''، ''عمران دی گریٹ''، ''جاسوسی فتنہ''، ''عمران سیریز''، ''فریدی سیریز'' اور ہندی میں کرائم منتھلی ''سچی کہانیاں'' کے نام سے شائع کیے لیکن ۱۹۷۲ء میں جاری ہونے والے ماہنامے ''فلمی ستارے'' نے ان کے قدم جما دیے اور یہ ان کا سب سے مقبول رسالہ بنا۔

ایک ڈنر کے موقع پر جب اس وقت کے مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات ودیاچرن شکلا سے حاجی صاحب کا تعارف کرایا جارہا تھا اور ان کے ساتھ جب ایڈیٹر ''فلمی ستارے'' کہا گیا تو شکلا صاحب یکبارگی ہنس پڑے اور کہنے لگے کیا فلمی ستارے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ حاجی صاحب نے بھی زور کا قہقہہ لگایا اور کہا:

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

حاجی انیس دہلوی ''فلمی ستارے'' شائع کرنے سے بہت پہلے اپنے شوق کی تکمیل کے لیے ڈراموں اور فلموں میں بھی کئی رول ادا کر چکے تھے۔ انھوں نے خواجہ احمد عباس کی فلم ''پردیسی'' میں درباری کا کردار نبھایا۔ اردو اکادمی دہلی کے پیش کردہ تمثیلی مشاعرے ''دلی کی آخری شمع'' میں نقیب مشاعرہ بنے۔ ۱۹۵۰ء میں ریوتی سرن شرما کے ریڈیائی ڈرامے ''زندگی کیا ہے'' کے اسٹیج شو میں کاتب تقدیر کا مرکزی کردار اس خوبی سے کیا کہ اس وقت کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے اسے دلچسپی سے دیکھا، پسند فرمایا اور ایوارڈ سے نوازا۔

۱۹۹۲ء میں انھوں نے خواتین کے لیے ایک اصلاحی اور مذہبی ماہنامہ ''باجی'' جاری کیا۔ ''باجی'' کے اجرا کے خیال کے بارے میں حاجی انیس دہلوی کا اپنا بیان ہے کہ:

> ''۱۹۹۰ء میں جب عمرہ کے لیے مکہ معظمہ پہنچا تو حیدرآباد کے مہمان خانہ رباط میں ٹھہرا ہوا تھا، کہ باتوں باتوں میں رباط کے منیجر عبداللہ صاحب نے اصرار کیا کہ آپ نوکِ قلم کے وسیلے سے کوئی ایسا کام ضرور کریں جس سے اسلام کی بھی کوئی خدمت ہو اور ملتِ مرحومہ اور بالخصوص اس کی دبی کچلی خواتین میں کچھ بیداری آئے اور وہ سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو جائیں۔ لہٰذا جب میں سعودی عرب کے مقدس شہر مدینہ منورہ میں حاضر تھا تو یکا یک دل کے کسی گوشے میں رباط (حیدرآباد) کے منیجر صاحب کی پُرسوز آواز ابھری کہ یہی وقت ہے ملت مرحومہ کے لیے کچھ سوچ لیجیے، کچھ طلب کر لیجیے اور میں نے اس پاک مقام پر دل سے دعا کی کہ خالقِ دو جہاں میری تازہ آرزو کی راہ میں ثابت قدمی نیز روشن خیالی اور ترقی عطا فرما اور اپنی رحمتِ کاملہ کے صدقہ ماؤں اور بہنوں کی فلاح کی غرض سے جاری ہونے والے میرے جریدے کو مقبولِ عام بنا کر ملت کے دینی مقاصد کا بہترین ذریعہ بنا۔ رسالہ ''باجی'' کا موزوں ترین نام بھی ذہن کو مدینہ منورہ میں عطا ہوا اور تمام کاغذی خاکہ بھی''۔

حاجی انیس دہلوی نے اپنی بیگم کو ''باجی'' کی مدیرہ بنا کر دنیا بھر کی ''وحیدہ باجی''

بنا دیا۔ ''باجی'' کا اجرا ایوانِ غالب کے وسیع ہال میں جناب اندر کمار گجرال کے ہاتھوں بہت شاندار طریقہ سے ہوا۔ ایسے مواقع پر جب خواتین برقعے کو ہی ''پردہ نشین'' کر دیتی ہیں اور خود بے پردہ ہو جاتی ہیں، وہاں مدیرہ ''باجی'' اسٹیج پر برقعے میں موجود تھیں۔

۲۰۰۰ء کے آغاز میں ایک ادبی رسالہ سہ ماہی ''ایوانِ ادب'' بھی جاری کیا، جس کے تین ضخیم شمارے ان کی حیات میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوئے۔

حاجی انیس دہلوی ایک پُر بہار شخصیت کے مالک اور بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ ان کی سادگی، خلوص، کھلنڈرا پن، ظرافت، بے ساختگی اور طبیعت کی شوخی نے انھیں لوگوں میں مقبول و ممتاز بنا دیا تھا۔ ہر ایک کے دُکھ درد کے ساتھی اور خوشی و غم کے شریک تھے۔ جن تقریبات میں شریک ہوتے ان کی رونق دوبالا ہو جاتی۔ اپنی بذلہ سنجی اور خالص دہلی کی زبان و لہجہ کی وجہ سے ہر محفل کی جان بنے رہتے۔

۱۹۹۲ء میں فالج اور شوگر کی بیماری کے باعث سماعت سے بالکل محروم ہو چکے تھے لیکن ان کی قوتِ عمل، عزم و حوصلہ اور ارادوں میں فرق نہیں آیا تھا۔ جن دنوں وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے سے بھی قاصر تھے تب بھی وہ اپنے رسائل کی ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔ قوتِ سماعت سے محروم ہو گئے تھے لیکن اس سے ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اشاروں کنایوں میں ہی دوسروں کی باتیں سمجھنے کی کوشش کرتے تھے اور حیرت انگیز حد تک ان کے بیشتر اندازے درست نکلتے تھے۔ جس سے بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ حاجی صاحب نہ سننے کی اداکاری کر رہے ہیں۔ قدرت نے ان سے ایک حس چھین کر ان کی دیگر حسیں بیدار کر دی تھیں۔

حاجی صاحب نے اس بات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

جنبشِ لب سے سمجھ لیتا ہے ساری باتیں
یہ انیسؔ اتنا سمجھ دار ہے کیا عرض کروں

ایک دوسرے شعر میں اس کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

پڑھ لیتا ہے چہروں سے انیسؔ آپ کے جذبات
کیا غم ہے جو کانوں سے سنائی نہیں دیتا

Marfat.com

ویسے اپنی خوش مزاجی کے ساتھ وہ اس محرومی کو بھی ایک نعمت سمجھتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اب میں بہت مزے میں ہوں۔ صرف اپنی کہتا ہوں، کسی کی نہیں سنتا۔ وہ کاغذ قلم ساتھ رکھتے تھے اور جہاں Lips Reading (لب خوانی) سے کام نہیں نکلتا تھا تو پھر مخاطب سے لکھوا کر Slip Reading (پرچی خوانی) سے کام چلاتے تھے۔

اردو میں تین تین رسالے نکالنا اور اپنے وقت پر پوسٹ کر دینا کم اہم بات نہیں۔ جب کہ بیشتر کام وہ خود تنِ تنہا انجام دیتے تھے۔ مضامین کے انتخاب اور پروف ریڈنگ سے پیسٹنگ تک، ترتیب و تزئین سے لے کر ترسیل تک سارا کام خود ہی کرتے اور دوسرے تمام کام اپنی نگرانی میں کراتے۔ ملک و بیرونِ ملک کے بے شمار احباب، قلمی معاونین، خریداروں اور ایجنٹوں سے رابطہ اور خط و کتابت خود ہی کرتے تھے۔ حتیٰ کہ منی آرڈر یا وی۔ پی فارموں کا اندراج بھی رجسٹروں پر خود ہی کرتے تھے۔ اس طرح ۱۵ سے ۱۸ گھنٹے روز کام کرتے تھے جو آج کی نئی نسل کے لیے قابلِ تقلید ہے۔

حاجی انیس دہلوی تمام کام منصوبہ بند طریقے سے انجام دیتے تھے۔ نمازِ فجر کے بعد سب سے پہلے ایک کاغذ میں دن میں کرنے والے تمام امور درج کرتے تھے۔ اسی میں اس روز کی آمد کا تخمینہ اور جن لوگوں کو جتنی جتنی ادائیگی کرنی ہوتی تھی وہ بھی لکھ لیتے تھے۔ اپنے کام میں وہ کسی طرح کا خلل برداشت نہیں کر پاتے تھے۔ اگر کوئی شخص ان کے کام میں رکاوٹ بنتا تھا تو اس کے ساتھ ان کا لہجہ کھردرا اور درشت ہو جاتا تھا۔

اردو رسالے سے روزی روٹی کمانا اور اسے مستحکم ذریعۂ معاش بنانا کسی باکمال کا ہی کام ہو سکتا ہے۔ اور حاجی انیس دہلوی کے باکمال ہونے کا اعتراف ہر شخص کرے گا۔ حاجی انیس دہلوی اردو کی خدمت کے لیے اپنی خدمت کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ وہ سلیم جعفری کی یونی کیریز* (Unikarians) دبئی اور مجلس فروغ اردو ادب، دبئی، دوحہ قطر کے رابطہ آفیسر اور خلیجی ممالک میں عالمی مشاعروں کے معاون رہے۔ ان ہی کے تعاون سے ان کے عظیم الشان یادگاری مجلّے شائع ہوتے تھے۔

(*Oxen اور علی گیرین کی طرز پر کراچی یونیورسٹی کے قدیم طلبا یونی کیرین کہلاتے ہیں)

حاجی انیس دہلوی کے ساتھ ایک طویل عرصہ گزرا اور انھیں پابندی کے ساتھ بطور

Marfat.com

سامع مشاعروں میں جاتے ہوئے اکثر دیکھا۔مگر کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ شعر بھی کہتے ہیں۔ ایک روز معلوم ہوا کہ حاجی انیس دہلوی خدا کے فضل وکرم سے شاعر بھی ہیں۔ اب ان کا کلام ملک کے موقر جرائد میں شائع ہونے لگا ان کے بقول یہ جراثیم ان میں ابتداء سے ہی تھے اور انھوں نے استاد رسا دہلوی، ڈاکٹر اختر نظمی گوالیاری، ڈاکٹر عزیز اندوری اور قمر سنبھلی سے مشورۂ سخن کیا۔ اخیر کے چند برسوں میں شاعری ان پر غالب آ گئی تھی اور وہ کثرت سے مشاعروں میں شرکت کرنے لگے تھے۔ کہا نہیں جاسکتا کہ وہ اپنی شاعری کی بدولت دبئی اور دیگر خلیجی مما لک کے مشاعروں کے روحِ رواں بنے تھے یا ان مشاعروں اور رابطہ آفیسری نے ان کی شاعری کو جلا بخشی تھی۔

ستر برس کی عمر میں پہلا شعری مجموعہ ''قدم بہ قدم'' کے نام سے شائع ہوا۔ ان کا نعتیہ مجموعۂ کلام ''دستِ دعا'' دیکھیے کب دستِ قارئین تک پہنچتا ہے۔ ان کے چند شعروں سے آپ بھی محظوظ ہوں:

فراز عرش پہ مہماں ہیں رحمتِ عالمؐ
کہ تاج عظمتِ انساںؑ ہیں رحمتِ عالمؐ

جلائیں ہم جسے بس، وہ چراغ جلتا ہے
ہمارے آگے ہواؤں کا دم نکلتا ہے

دیوار بن کے وقت اگر راستہ نہ دے
جھونکا ہوا کا بن کے گزر جانا چاہیے

انیسؔ اپنی ہستی ہے دن کا اجالا
جب آنکھیں مندیں گی تبھی رات ہوگی

انیسؔ رہتا ہوں ہندوستان کے دل میں
خوشا نصیب کہ دلّی بنی ہے گھر میرا

Marfat.com

ہزاروں غم ملے لیکن کبھی آنسو نہیں آئے
ہماری طرح جینے کا کوئی انداز کیا جانے

حاجی انیس دہلوی کی مختلف الجہت خدمات کا ان کی زندگی میں بھرپور اعتراف بھی کیا گیا اور ان کی خدمات کے سلسلے میں بے شمار اعزازات، انعامات اور ایوارڈ سے نوازا گیا۔ وہ ۱۹۸۶ء تا ۱۹۹۹ء اردو اکادمی، دہلی کی گورننگ باڈی کے بھی ممبر رہے۔

حاجی انیس دہلوی جب بحرانی دور سے گزر رہے تھے تو کسی شخص نے ان پر ''فیوز ڈبلب'' کی پھبتی کسی تھی۔ آج اس پھبتی کسنے والے کا تو کچھ اتا پتا نہیں، البتہ حاجی انیس دہلوی اپنے جاری کیے ہوئے رسائل کی صورت میں آج بھی روشن ہیں۔

نعمت اللہ حاجی انیس دہلوی آج ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی نہ بھولنے والی باغ و بہار شخصیت لوگوں کے دل و دماغ میں محفوظ رہے گی۔ ان کی زندگی کا سفر پورا ہو گیا لیکن ان کی زندہ دلی، خوش مزاجی اور دوست نوازی کے چرچے ہمیشہ تر و تازہ رہیں گے۔ اس کا احساس خود حاجی انیس دہلوی کو بھی تھا، اسی لیے انھوں نے کہا تھا:

میں نے کئی قصوں کے سرے چھوڑ دیے ہیں
بن جائے گا میرا بھی سفر ایک کہانی

□□

Marfat.com

مشیر جھنجھانوی

میرے ورثے میں نہ دولت ہے نہ جاگیر کوئی
میرے اجداد زمانے میں چلن چھوڑ گئے

مشیر صاحب جن کو شاعرِ نغز گو وخوش گفتار کہہ کر اگر یاد کیا جائے تو خیال کے آئینے میں ان کی مسکراتی ہوئی شکل آجاتی ہے۔ صاف ستھری شخصیت شگفتہ مزاج اور شائستہ طبیعت رکھنے والا شاعر جس کی شہرت صبح کے اجالوں کی طرح آگے بڑھی اور جس نے کبھی اپنی شخصیت کے گرد مصنوعی شہرت اور اعزاز کی پرچھائیاں نہیں پڑنے دیں۔ مشیر صاحب کا تعلق جھنجھانہ ضلع مظفر نگر یوپی سے تھا۔ انھوں نے اپنے اس وطن سے نسبت کو اپنے نام کا ایک اہم جزو بنالیا تھا جسے وطن سے ان کے دلی تعلق اور تہذیبی رشتہ کی طرف ایک اشارہ کہا جاسکتا ہے۔

جھنجھانہ مغربی یوپی کی ان تاریخی بستیوں میں سے ہے جنھوں نے وسطی عہد میں نامور مصنف، عالم، شاعر اور ادیب پیدا کیے۔ جھنجھانے کے اہلِ علم میں ہمارے اپنے زمانے سے قریب ترین فیض جھنجھانوی اور سلیم احمد کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ جھنجھانے کی تاریخ ساز شخصیتوں میں ہم افضل جھنجھانوی کا ذکر بھی کرسکتے ہیں جو جہانگیر کے عہد کی شخصیت تھے اور جب اردو ادب کی تاریخی حسیت پر گفتگو ہوتی ہے تو افضل کے حوالے سے ہم ضرور گزرتے ہیں جن کو اردو کے پہلے ''دوازدہ ماہہ'' کا مصنف قرار دیا جاتا ہے۔ اس صنف کو ہم بارہ ماسہ بھی کہتے ہیں۔ افضل جیسے شاعر کا جھنجھانہ میں پیدا ہونا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس تاریخی بستی میں افضل سے پہلے قدیم اردو کے

Marfat.com

اور بھی نمائندہ اشخاص پیدا ہوئے۔ ان میں شاہ عبدالرزاق علوی القادری کا نام لے سکتے ہیں۔ افضل ان ہی کی اولادوں میں سے تھے۔ بہر حال افضل ہوں یا ان سے پہلے یا بعد میں آنے والے اہلِ علم وادب، ان شخصیات پر نظر ڈالنے سے اس بات کا ثبوت ضرور فراہم ہوتا ہے کہ دہلی کے قرب وجوار کی یہ بستیاں جن میں جھنجھانے کے علاوہ پانی پت، کیرانہ اور کاندھلہ بھی شریک ہے یہ ہماری ثقافتی تاریخ کا ایک اہم باب فراہم کرتی ہیں۔

مشیر صاحب یعنی والدمحترم کا مختصر سوانحی خاکہ اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے:

نام سید مشیر الحسن علوی، تخلص مشیر، پورا نام مشیر جھنجھانوی، ولدیت ڈاکٹر ناظر حسین، تاریخ پیدائش ۲۷/دسمبر ۱۹۲۶ء۔ آبائی وطن جھنجھانہ ضلع مظفرنگر یوپی، تاریخ وفات ۲۱/مارچ ۱۹۹۰ء۔ زندگی کا زیادہ حصہ دہلی میں گزرا اور یہیں ان کی وفات ہوئی۔ تعلیم پنجاب، شاہجہاں پور، بریلی، علی گڑھ اور دہلی یونیورسٹی میں حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل، اسلامیہ انٹر کالج شاہجہاں پور سے انٹرمیڈیٹ، بریلی کالج سے بی۔ اے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ٹی کی ڈگری حاصل کی، جس کو آج کل بی۔ ایڈ کہتے ہیں۔ اس کے بعد دہلی یونیورسٹی سے انھوں نے ایم۔ اے اردو امتیازی نشانات کے ساتھ پاس کیا۔

شعری مجموعے: انفاسِ غزل، رقصِ غزالاں، شعلۂ نم ہیں۔

جولائی ۱۹۵۰ء سے ستمبر ۱۹۸۸ء تک معلم کی حیثیت سے فتح پوری مسلم سینئر سیکنڈری اسکول دہلی میں اپنی خدمات انجام دیتے رہے اور اردو کے بہترین استاد کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ ورق شعرگوئی ورثے میں اپنے والدمحترم اور چچا طیب حسن علوی سے ملا۔ ہوش سنبھالتے ہی شعر کہنا شروع کردیا تھا۔ شاعری میں ان کے استاد اعتبارالملک حکیم ضمیر حسن خاں دلؔ شاہجہاں پوری تھے جو جانشین امیر مینائی کہلاتے تھے۔ شاہجہاں پور کی ادبی فضا میں شعرگوئی کے اس فن کو پختہ گوئی کی منزل تک پہنچنے میں یہ کہیے کہ زیادہ وقت نہیں لگا۔

مشیر صاحب کے اس سوانحی خاکہ کو پڑھ کر یہ اندازہ ضرور ہوسکتا ہے کہ وہ قصبہ جھنجھانہ اور علوی خانوادے کے ان چند افراد میں سے تھے جنھوں نے نئی تعلیم کی طرف

Marfat.com

توجہ دی اور ہائی اسکول سے لے کر ایم اے تک اپنے آپ کو پہنچایا۔ تربیتی کورس سے گزرے اور دوسرے مشرقی امتحانات اعلیٰ نشانات کے ساتھ پاس کیے۔ اس طرح انھوں نے قدیم وجدید روایات کے اجزاء سے اپنے ادبی شعور اور فنّی شخصیت کا ایک نیا آمیزہ تیار کیا۔

مشیر صاحب کو مطالعہ کا بہت شوق تھا اکثر رات گئے تک کتاب دیکھتے رہتے۔ اپنے علم دوست احباب سے مختلف ادبی اور علمی مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے انھیں اکثر دیکھا جاتا تھا۔ بہت ہی ہنس مکھ، خوش لہجہ اور نازک مزاج آدمی تھے۔ اپنی گفتگو میں ہمیشہ Well warded رہنے کی کوشش کرتے تھے بلکہ یہ ان کی عادت سی بن گئی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ ان کی گفتگو میں کبھی بناوٹ یا تصنع کا شائبہ بھی کسی شخص کو محسوس ہوا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تکلف میں بے تکلفی برتنے کے عادی تھے زیادہ باتیں نہیں کرتے کچھ نہ کچھ سوچتے رہتے تھے۔ اپنے آپ میں کھوئے رہنا ان کی شخصیت کا ایک جزو تھا۔ اکثر و بیشتر شیروانی اور واسکٹ پہنتے تھے بٹن آگے سے کھلے رکھتے۔ لباس میں کرتا پاجامہ زیب تن کرتے تھے سفید رنگ کافی پسند تھا۔ کھانے میں میٹھے کے کافی شوقین تھے۔ ان کی سب سے پسندیدہ بات یہ تھی کہ وہ اکثر و بیشتر اپنے دوستوں کو گھر پر بلاتے، دعوتیں کرتے۔ مچھلی بہت شوق سے خود پکاتے اور کھلاتے۔ چاندنی راتوں اور بھیگی ہوئی صبحوں اور سنہری دنوں میں وہ مچھلی کے شکار کو نکل جاتے۔ ان کے بعض قریبی دوست ان کے ساتھ ہوتے۔ ان سے خوش گپیاں بھی رہتیں اور وہ ان کو اپنے شعر بھی سناتے۔

پُل پہ بیٹھے ہوئے لہروں کو گنا کرتے ہیں
ہم بھی مصروف ہیں کچھ خاص وزیروں کی طرح

اگر وہ اپنے کسی دوست یا ساتھی کی زبان سے اچھا شعر سنتے تو بے اختیار داد بھی دیتے۔ میرے والد صاحب سے جو لوگ بھی واقف ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ انھیں کبوتروں کا بہت شوق تھا۔ اچھی نسل کے کبوتر ہمارے گھر میں درجنوں تھے اور آج بھی ہیں۔ میرے والد محترم ان کبوتروں کو اپنی زندگی میں کچھ اس طرح شریک رکھتے تھے جیسے وہ ان کے معصومانہ کردار کا کوئی حصہ ہوں۔ میں نے کم از کم یہی محسوس کیا کہ جو بات انھیں بہت

Marfat.com

اچھی لگتی تھی وہ کبوتروں کا بھول پن، ان کی معصومیت اور ان کے وجود کی پاکیزگی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انھوں نے کبھی کبوتروں کو اڑانا پسند نہیں کیا اور نہ ہی کبھی شرط لگا کر ہار جیت کا کوئی کھیل کھیلا۔ مچھلیوں کا شکار ہو یا کبوتروں سے دلچسپی اس سے ایک بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ ان کو انسانوں کے کردار سے زیادہ ان معصوم پرندوں اور خاموش مچھلیوں کو تیرتے ہوئے دیکھنے کا شوق تھا۔ اس کا ایک ہی پہلو میری سمجھ میں آتا ہے، ان کے سکون اور عافیت کوشی کا یہ عالم تھا کہ وہ دنیا سے بے نیاز اپنی دھن میں لگے رہتے تھے۔ سمندر کا کنارہ ہو یا کبوتروں سے محبت یہ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

میرے والد کی شادی زہرہ خاتون سے ہوئی جو ایک گھریلو عورت ہونے کے باوصف قومی کاموں سے گہری دلچسپی رکھتی تھیں اور A.I.C.C. کی رکن تھیں۔ میری والدہ نے گھر کے انتظامات کو اس طرح سنبھالے رکھا کہ میرے والد کے لیے یہ ممکن ہو سکا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنی زندگی گزار سکیں اور دھنک کے رنگوں جیسی اپنی دلچسپیوں کے حلقے کو اپنی محراب فکر و خیال بنائے رکھیں۔ ہر وقت سوچتے رہنا یہ کہیے کہ ان کے فکر شعر ہی کا ایک حصہ تھا زیادہ تر شعر سفر میں یا رات کے وقت کہتے تھے، جس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ان کا ذہن ہمہ وقت سفر میں رہتا تھا۔ جب بھی شعر کی آمد کا وقت ہوتا اس وقت جو بھی کاغذ سامنے آ گیا یا مل گیا اس پر وہ لکھ لیتے تھے ایسے کاغذات میں اکثر لفافے اور دعوت نامے ہوا کرتے تھے جو اکثر و بیشتر یا تو کسی مشاعرے کا دعوت نامہ ہوتا تھا یا پھر دوستوں اور شاگردوں کی غزلیں جو ان کو بہ نظر اصلاح دیکھنے کو بھیجی جاتی تھیں ان کے عزیز شاگردوں میں جن سے میں واقف ہوں ڈاکٹر مظہر احمد، شاہد انور اور جاوید مشیری ہیں۔ ہم مطالعہ کی سہولت اور ان کی شاعری کو نمایاں طور پر سمجھنے کے لیے اس کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور ابتدا سے ۱۹۴۴ء تک، دوسرا دور ۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۵ء تک، تیسرا اور آخری دور ۱۹۶۵ء سے ۱۹۹۰ء یعنی ان کی وفات تک۔ یہ دور ان کے شعر و شعور کے لیے ایک اہم دور ہے اس میں انھوں نے نفسیاتی مطالعوں پر زیادہ زور دیا یا پھر ہماری انسانی حسّیات کو اس کی پیچیدگیوں کو تہہ داریوں کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ صورت اگر نظم میں ہوتی تو اس کا انداز کچھ اور ہوتا۔ زبان و بیان کا سانچہ نئے ڈھنگ سے ترتیب پاتا۔ چوں کہ انھوں

نے غزل کو ہی شروع سے آخر تک اپنے سامنے رکھا اور اس کے فطری لوچ اور غزلیہ لب و لہجہ کی لچک کے ساتھ اپنی باتوں کو پیش کیا۔ اپنے شعروں کو تجربے اور تجزیے سے شعری پیکر عطا کیا اس لیے ان کے یہاں زیادہ گہرائی اور گیرائی آگئی۔ ان کے شعر گنگنانے کی چیز بھی بنے اور عام فہم بھی ہوئے لیکن ان کی تہہ داریاں اپنی جگہ پر رہیں۔

محترم مشیر صاحب ۱۹۴۸ء تک ہمارے مشہور اہلِ فن حضرات میں شامل ہو گئے تھے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس دور کے کسی نقاد نے مشیر صاحب کے ابھرتے ہوئے شعور اور نئی آواز کو دریافت کر کے ان کو ادب اور تنقید کے حلقوں میں متعارف کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ مشیر صاحب مشاعروں میں جاتے، پسند کیے جاتے، داد ملتی، قدر ہوتی اور واپس آجاتے تب بھی ان کا ذکر خیر رہتا۔ ان کے شعر دہرائے جاتے، ان کا حوالہ دوسرے موقعوں پر دیا جاتا یہ میرے کافی بچپن کی بات ہے۔ ان کی ایک غزل کے شعر کافی مشہور ہوئے جس سے ہمارے نئے عہد کی نفسیات کا پتہ چلتا ہے:

جب وہ میرے قریب سے ہنس کر گزر گئے
کچھ خاص دوستوں کے بھی چہرے اتر گئے

غزل ایسی لطیف حسیت کا شعری نام ہے جس کی ایک ہلکی سی تھرتھراہٹ میں زمانے کے تہ نشین سمندر کے صدہا طوفان جیسے دل کے آبگینے کو چھوتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ عصری حالات پر گفتگو ہماری شاعری کا ایک اہم موضوع رہا ہے اور آج بھی ہے۔ اس میں مشیر صاحب کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے، زندگی کے تجربات اور احساسات کو اس طرح فکر شعر میں سمولیا کہ بادی النظر میں یہ خیال بھی نہیں گزرتا کہ وہ اپنے عہد کے رویوں پر چشم سخن سے اس طرح اشارہ سنج ہیں کہ ان کے شعری لہجہ میں ایک طرح کی نشتریت آگئی ہے اس لیے انھوں نے عمومی روایتوں کا سہارا لیا۔ سادہ وسائل سے کام لے کر بڑی سچائیوں کی طرف نکل آنا آرٹ کی بہت بڑی خوبی ہے۔ جب ہم مشیر صاحب کے ان اشعار کو پڑھتے ہیں تو اس کا احساس ہوتا ہے:

جھوٹی تسلیوں کی حقیقت ہی کیا مگر
اندازِ گفتگو نے حقیقت بنادیا

Marfat.com

کشتی کو ناخدا کی ضرورت نہیں رہی
موجوں نے اپنے آپ ٹھکانے لگا دیا

عشقیہ علامتوں سے کام لینا غزل میں داخل ہے اس کے بغیر غزل کا کوئی شعر مشکل ہی سے اپنا اثر دکھلاتا ہے لیکن بات غمِ جاناں کی نہیں بلکہ غمِ جہاں کی ہے یہ جھوٹی تسلیاں حکومت کے وعدے اور ناخداؤں کا رویہ بھی ہو سکتا ہے جو حکمتِ عملی کی ایسی صورتیں ہیں جنھوں نے ملک کی کشتیِ حیات کو بھنور میں لا کر چھوڑ دیا۔ اب یہ وقت اور بخت کی بات ہے کہ سفینہ ساحل سے جا لگے اور موجوں کی محنت ٹھکانے لگ جائے۔ اس ذہنی پس منظر کے ساتھ ان اشعار کو دیکھیے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غزل کی لفظیات معنی در معنی ہوں اور یہ تہہ داریاں ان کی معنویت کی طرف اس طرح اشارہ کرتی ہوں کہ زمانہ بہ زمانہ ان کا تاثراتی سفر جاری رہے۔ شعر کی خوبی یہ ہے کہ وہ مختلف پہلوؤں کو اپنی گرفت میں لا سکتا ہے اور ایک زمانے میں کہا ہوا شعر برابر اپنی تخلیقی حسّیت اور شعری روایت کے ساتھ آبی دائروں کی طرح پھیلتا ہوا چلا جاتا ہے اور ایک دائرہ سے دوسرا دائرہ جنم لیتا ہے۔ مشیر صاحب نے میرؔ سے لے کر اقبالؔ تک مختلف شاعروں کو پڑھا بھی اور پڑھایا بھی لیکن ان سے اکتساب کا رویہ بھی شعر کی رمزیت کی طرح فکر و خیال کے پردوں سے چھن چھن کر ان کا حصہ بنتا رہا۔

''گزرے ہے'' کی ردیف کے ساتھ کہی گئی غزل میرؔ کی لسانی حسّیت کی یاد دلاتی ہے:

تیرا خیال تیری طرح بے وفا تو نہیں
بڑے مزے سے شبِ انتظار گزرے ہے
غمِ نشاط کی منزل کہیں یہ ہی تو نہیں
تیرا کرم بھی مجھے ناگوار گزرے ہے

مشیر صاحب کی اکثر غزلیں ایسی ہیں کہ اگر زیرِ لب گفتگو کے طور پر ان کی رمز شناسی کی طرف ذہن مائل ہوں تو پچھلی نصف صدی میں ہندوستان کی تاریخ کے بہت سے مرحلوں کا تجزیہ اور خونی زندگی کے حادثوں کا سلسلہ پرتو فگن نظر آئے گا اور اس کے باوجود وہ غزل کے شعر ہوں گے۔ مشیر صاحب سیاسی شاعری نہیں کرتے تھے اس لیے بعض معروف شعرا کی طرح انھوں نے سیاسی حقیقتوں کی مصوری نہیں کی بلکہ ان سچائیوں سے

Marfat.com

فکرونظر کے نئے زاویے تراشے۔ اس اعتبار سے مشیر صاحب کا سیاسی شعور، حالات اور حادثات پر تبصرہ نگاری کا انداز ذہن کو نئی سوچ کے سفر سے آشنا کرتا ہے۔ مشیر صاحب کی مشہور غزل جو انھوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے قتل پر لکھی تھی اور جس کے اشعار آج بھی لوگوں کی زبان پر آجاتے ہیں ان میں وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے براہِ راست ان اشعار کو مشیر صاحب سے سنا تھا یا پھر ان لوگوں سے جن کے ذہن و دل پر یہ اشعار لکھے گئے اور انھوں نے دوسروں کو سنائے:

زندگی بھر زندگی کا غم رہا
ایک ہی انداز کا موسم رہا
درد مندی اس کو آئی ہی نہیں
ہم سے لوگوں میں وہ شاید کم رہا
پھر کسی بھی آنکھ میں آنسو نہ تھے
قتل ہونے تک بہت ماتم رہا
واپسی تک راستے کھو جائیں گے
برف گرنے کا جو یہ عالم رہا
موت نے ہاتھوں کو پتھر کر دیا
میرے ہاتھوں میں میرا پرچم رہا
میں سکون نہ آشنا ہوں اے مشیر
درد رگ رگ میں رہا پیہم رہا

....

تجھے یہ زیب نہیں ہے کہ ٹال دے مجھ کو
عروج بانٹ چکا ہے زوال دے مجھ کو

آج کے دور کا یہ ذہنی تجزیہ اور اس پر ریشم کے تاروں کی نرمی کے ساتھ نشتریت سے بھرا ہوا یہ طنز اپنے پڑھنے والے یا سننے والے کو اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ وہ کسی ایسے شاعر کے دل کی دھڑکنیں سن رہا ہے جو اس سے قریب ہے اور آج کے شہر کے ماحول میں

Marfat.com

کہیں نہ کہیں سانس لیتا رہا ہے۔

مشیر صاحب کے یہاں غزل کا فارم نہیں بدلتا ان کے ساتھ جیسے شروع سے آخر تک وہی صورت رہی:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

مشیر صاحب کے اشعار پڑھتے جایئے نئے نئے خیال اور گوناگوں افکار آپ کے سامنے آتے رہیں گے۔ ان کی غزل مطلع سے مقطع تک ایک انداز رکھتی تھی، مگر اس پر بھی خصوصیت کے ساتھ ان کے مقطعے توجہ کے مستحق نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلوں کے چند مقطعے ملاحظہ ہوں۔

میرے گھر کے در و دیوار کچھ ایسے ہیں مشیر
دھوپ آنگن میں اترتی ہے سہارا لے کر

....

پھل تو پڑوسیوں کے مقدر میں ہیں مشیر
پتے ہوا سے اُڑ کے میرے گھر میں آتے ہیں

....

کم ظرف دشمنی کے بھی قابل نہیں مشیر
کیچڑ میں سانپ کو بھی نہ پتھر سے ماریئے

....

ایک میں کوتاہ قد تھا اس کی محفل میں مشیر
اس لیے میرے علاوہ ہر کسی کا سر گیا

سر اڑنا، سر اڑانا، سر جانا ہمارے عام محاورے ہیں لیکن مشیر صاحب نے یہ شعر کہہ کر اور اس محاورے کو استعمال کر کے ہماری معاشرت کو نئے انداز سے آئینہ دکھایا ہے۔ کوتاہ قد ہونا کوئی خوبی نہیں لیکن کچھ لوگ کوتاہ قد بن کر خود کو خطرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں اور کتنے ہیں جنھوں نے بیکار کی سربلندیاں اختیار کیں اور ان کے شانوں پر ان کا سر ہی موجود نہیں

Marfat.com

رہا۔ مشیر صاحب کی آخری غزل بلکہ یہ کہیے کہ یہ ان کی زندگی کی آخری شعری تخلیق تھی، اس کے چند شعر ملاحظہ ہو:

واقعی میں تھا بہت جاگا ہوا
دیر تک سونے سے اندازہ ہوا
کیا کہوں مجھ سے تیرا دُکھا ہوا
آدمی تھا وہ میرا پرکھا ہوا
زاویوں کا جال تھا چہرہ نہ تھا
آئینہ اور اس قدر ٹوٹا ہوا
نیشِ عقرب اس کو کہتے ہیں مشیرؔ
دوستوں سے مل کر اندازہ ہوا

آج مشیر صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ کی طرح ہمارے ساتھ ہیں۔ جب میں ان کے شعر پڑھتی ہوں تو ان کا لہجہ ایک تصویر بن کر ابھرتا ہے اور ان کی تصویر ایک منفرد لب ولہجہ اور شعری سانچے میں ڈھل کر میرے کانوں میں گونجنے لگتی ہے۔ آخر میں یہ شعر پڑھنے کی اجازت چاہوں گی:

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوسکتی
جسم مر جانے سے انسان نہیں مرسکتے

□□

Marfat.com

غفران احمد

مولانا محمد سلیمان صابرؔ

ملک کی تحریک آزادی کے دوران میں جو عظیم المرتبت علما، صحافی اور دانشور ابھرے، ان میں سے ایک مولانا محمد سلیمان صابرؔ بھی تھے، جنھوں نے ایسے دور میں اپنی زندگی کو جہاد آزادی کے لیے وقف کیا جب انگریزی حکومت کے دبدبہ اور اس کی ہیبت سے بڑوں بڑوں کا پِتہ پانی ہوتا تھا۔ ایک وقت تھا جب انگریزی طاقت اور اس کی فوج اور پولیس کو ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ اور کوئی سر اٹھانے کی ہمت بھی نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن آزادی کے متوالوں اور انڈین نیشنل کانگریس کی قیادت نے انگریز کے اس طلسم کو توڑ کر رکھ دیا۔ دنیا کے اس خطہ میں پہلی بار ایک نئے حربہ کو مظلوموں نے غلامی کی زنجیر میں کاٹنے کے لیے استعمال کیا۔ اس حربہ کا نام عدم تشدد تھا۔ دنیا میں ظلم و جبر کے نمائندے حیرت میں رہ گئے کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے؟۔

دلّی سے تقریباً بیس میل کی دوری پر ضلع غازی آباد کے قصبہ پلکھوہ میں اس مجاہد آزادی نے ۱۵ر جنوری ۱۹۱۷ء کو ایک معزز خاندان میں جنم لیا۔ اسی خاندان کے ایک دوسرے فرد مولانا محمد عثمان فارقلیط نے صحافت میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑے۔ لاہور کے روزناموں میں کام کیا، لیکن اپنے قوم پرستانہ خیالات کے باعث ۱۹۴۷ء میں ملکی تقسیم کے بعد دلّی چلے آئے اور زندگی یہیں گزار دی۔ مولانا محمد سلیمان صابرؔ ایک طرف قلمی جہاد کررہے تھے، دوسری طرف عملی سیاسیات میں آگئے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں ہندوستان کی انگریزی حکومت کی سختیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ ہر طرف جبر و تشدد کا دور دورہ تھا۔ اس زمانہ میں پلکھوہ (ضلع میرٹھ اب ضلع غازی آباد) کانگریس کمیٹی کا سکریٹری

Marfat.com

منتخب کر لیا گیا۔ وہ پلکھوہ میونسپل کمیٹی کے نامزد ممبر تھے۔ عین اسی زمانہ میں فرنگی حکومت نے وارفنڈ کے نام روپیہ کی وصولی شروع کی۔ سب ڈویژنل افسر نے تمام میونسپل ممبروں کو طلب کیا اور ''وارفنڈ'' جمع کرانے میں تعاون مانگا۔ نوجوان ستیہ گرہی محمد سلیمان صابر نے عوام کو ترغیب دی کہ وہ وارفنڈ میں چندہ نہ دیں۔ وہ میٹنگ میں نہیں گئے۔ اور اس کی بجائے دلّی جاکر مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر سننے کو ترجیح دی۔ اس طرزِ عمل پر سب ڈویژنل افسر آگ بگولہ ہو گیا اور آخر کار جولائی ۱۹۴۰ء میں انھیں اس الزام میں گرفتار کر لیا گیا کہ وہ ''وارفنڈ'' میں چندہ جمع نہ کرانے پر عوام کو اکسا رہے تھے۔ ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ مولانا اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''میرے کچھ لیڈروں نے مجھے مشورہ دیا کہ معافی مانگ لوں اور اپنے مستقبل کو تباہ نہ کروں۔ میں نے عدالت کے روبرو معافی مانگنے سے انکار کر دیا۔ نتیجے میں میرٹھ کے ایک مجسٹریٹ نے مجھے سزا سنائی۔ اپنے فیصلہ میں عدالت نے مجھے ایک ایسا گمراہ نوجوان قرار دیا، جو قصبہ میں سینئر لیڈروں کے بہکانے میں آ گیا۔ میں یقیناً عدالت کی نظر میں ایک گمراہ نوجوان تھا، لیکن عوام نے جو اس وقت عدالت کے باہر بڑی تعداد میں جمع ہو گئے تھے مجھے ہیرو قرار دیا اور جیسے ہی ہتھکڑی پہن کر میں کمرۂ عدالت سے باہر آیا، فضا انقلاب زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی''۔

(جنگ آزادی اور مسلمان)

انھیں پہلے میرٹھ جیل میں، بعد ازاں علی گڑھ جیل میں رکھا گیا۔ علی گڑھ جیل میں کئی سینئر لیڈر بھی مقید تھے۔ اس جیل کی فضا میرٹھ جیل سے بہتر تھی۔ اس جیل میں سیاسی قیدیوں کی ہفتہ واری میٹنگ اور مشاعرے بڑی آزادی سے منعقد ہوتے تھے۔ میرٹھ کے ایک مشہور لیڈر نے جو میرے کلاس میں تھے، ایک اکھاڑہ بنوایا تھا۔ اس دنگل میں مولانا بھی شامل ہوتے تھے۔ وہاں صبح دس بجے تک اکھاڑے میں زور لگاتے رہتے تھے۔ ہر روز شام کو جھنڈا اسلامی ہوتی تھی۔ اس کے بعد اس جیل سے سیاسی قیدیوں کو آگرہ جیل منتقل کر دیا گیا۔ یہاں جیل کے عملہ کا رویہ یکسر مختلف تھا۔ وہ سیاسی قیدیوں کو بھی اخلاقی قیدی

Marfat.com

سمجھتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہاں زیادہ وقت نہیں گزارنا پڑا۔ ۳؍مارچ ۱۹۴۱ءکو ان کی رہائی عمل میں آ گئی۔

اب مولانا کا دائرۂ عمل بھی دلّی بن گیا۔ اخبارات سے انھیں پہلے سے دلچسپی تھی۔ دلّی میں اخبار انصاری میں ملازمت مل گئی۔ اس کے بعد آپ نے اخبار الجمعیۃ میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر، اپنے کیریر کی طویل ترین ملازمت شروع کی۔ ۱۹۴۷ء کے پُرآشوب دور میں انھوں نے اخبار جنگ کے ادارتی عملہ میں بھی کام کیا۔ جنگ جو اس زمانہ میں دلّی سے نکلتا تھا، بعد میں پاکستان چلا گیا۔ جنگ کے مالک نے انھیں کراچی چل کر جنگ کی ادارت سنبھالنے کی پیش کش کی۔ لیکن مولانا نے اپنے قوم پرستانہ نظریات کے تحت یہ پیشکش رد کر دی تھی۔

پاکستان کے متعلق وہ مولانا ابوالکلام آزاد، جمیعۃ کے اعلیٰ قائدین اور کانگریسی لیڈروں کے خیالات سے سو فیصد متفق تھے۔ اور اس سلسلہ میں ہندوستانی مسلمانوں کو اسی ملک میں رہ کر باعزت زندگی کے وسائل تلاش کرنے اور اپنا وجود منوانے کی تلقین کرتے تھے۔ پلکھوہ میونسپل کمیٹی کی ممبری کے دور میں انگریز حاکم نے انھیں مسلم لیگ کی حمایت کے لیے ایک لاکھ روپے دینے کی پیشکش کی تھی، جو انھوں نے سختی کے ساتھ ٹھکرا دی تھی۔ اس سے ان کے کردار کی پختگی سامنے آتی ہے۔

دلّی میں اپنے قیام کے ابتدائی دور میں اپنے چند ساتھیوں کے مشورہ پر انھوں نے ایم۔ ای۔ ایس (ملٹری انجینئرنگ سروس) میں ایک سینئر انسپکٹر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ اس زمانہ میں بعض ساتھیوں نے لال قلعہ میں نظر بند انقلابی ساتھیوں تک کچھ پیغامات بھی ان کے ذریعہ پہنچائے۔ یہ کام اس زمانہ میں بڑا خراب تھا، لیکن اس معاملہ میں بھی وہ اپنے مشن میں کامیاب رہے۔ ۲۵ ویں یومِ آزادی کے موقع پر تامر پتر اور تاحیات پنشن سے انھیں نوازا گیا۔

۱۹۸۰ء کے دہے کے ابتدائی برسوں میں اخبار الجمعیۃ سے سبکدوشی کے بعد انھوں نے اغلباً ۸۶-۱۹۸۵ء میں بطور چیف سب ایڈیٹر (شفٹ انچارج) قومی آواز میں ملازمت اختیار کی اور وہاں سے اپنی سبکدوشی کے بعد اپنا صحافتی کام کسی نہ کسی طرح جاری

Marfat.com

رکھا۔ اہلِ حدیث کے اخبار 'ترجمان' میں کام کرتے رہے اور آل انڈیا ریڈیو پر ''جہاں نما'' پروگرام میں لکھتے رہے۔

۱۹۶۲ء میں پنڈت جواہر لال نہرو جب امریکہ اور یوروپ کے دورہ پر گئے ان کے ساتھ جانے والی ۱۲ نامہ نگاروں کی ٹیم میں وہ بھی شامل تھے۔ دورہ سے واپسی پر انھوں نے اپنے دورہ کے مشاہدات پر طویل قسط وار مضمون لکھا، جسے اردو اخبار بین طبقہ نے بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ اس طرح جنرل ضیا کے عہد میں وہ پاکستان گئے تو واپسی پر وہاں کی سیاست پر ایک طویل مضمون لکھا۔ اس میں ''ضیا حکومت'' کے متعلق اپنی بے لاگ رائے ظاہر کی۔

مجاہدین آزادی کے لیے کام کرنے والی پارٹی تنظیم ابوالکلام آزاد اسٹڈی سرکل کے صدر کے طور پر وہ ہر سرگرمی میں حصہ لیتے رہے۔ ہم دونوں نے مولانا آزاد پر ایک خصوصی نمبر کی اشاعت کے سلسلہ میں مہاراشٹر اور آندھرا کا دورہ بھی کیا۔ اس پندرہ روزہ دورہ میں مجھے بہت قریب سے ان کو جاننے کا موقع ملا۔ ایک بات مشاہدہ میں یہ آئی کہ وہ معاملات میں بڑے صاف ستھرے آدمی تھے۔ کئی دفعہ مجھے بہت تکلف محسوس ہوتا تھا۔ جہاں بھی میرے ساتھ گئے، وہاں ملاقاتیوں نے ان کی تعریف کی۔ اورنگ آباد، اجنتا اور ایلورہ کی سیاست میں انھوں نے کئی اہم باتیں نوٹ کرائیں۔ ان کی طبیعت میں بڑی نرمی اور نزاکت تھی۔ ایک بار دفتر الجمعیۃ میں ایک صاحب کو میں فون کر رہا تھا۔ فون کے اس طرف جو بھی تھے بڑے 'فوجی ڈسپلن' کے آدمی تھے۔ لب ولہجہ میں ایسا ہی تھا۔ فون پر بحث وتکرار کے بعد میں نے فون کا ریسیور ذرا زور سے رکھا۔ یہ بات انھوں نے محسوس کی اور مجھے ٹوکا اور کہا آخر فون پر غصہ اتارنے کا کوئی فائدہ ہے؟ میں نے اس بات کو پلّے میں باندھا۔ اسی طرح بمبئی کے بھنڈی بازار میں ہم دونوں نے کھانا کھایا۔ اس موقع پر پانی لانے میں دیر کرنے پر میں نے بیرے کو سخت آواز میں بلایا۔ اس پر بھی مولانا نے مجھے ٹوکا۔ ان کی یہ نصیحت بھی معقول تھی۔ میری اور ان کی عمر میں کافی فرق تھا۔ لیکن وہ بڑے حلیم الطبع اور بردبار تھے۔ اپنی عادات واطوار میں جو وضع داری انھوں نے اپنا رکھی تھی آخر تک اس پر قائم رہے۔ اورنگ آباد، نظام آباد، حیدرآباد میں جن سے بھی ملاقات کی وہ ان سے متاثر

ہوئے۔

۱۹۹۵ء میں وہ پہلی بار سخت بیمار ہوئے۔ ولنگڈن اسپتال میں علاج سے شفایاب ہو گئے۔ لیکن دوسری بار اکتوبر ۱۹۹۹ء میں جب کہ وہ اوکھلا اپنی لڑکی کے ہاں گئے تھے، انھیں سخت دورہ پڑا۔ قاسم جان سے فوراً ان کے اہلِ خانہ پہنچے۔ اور انھیں پھر ولنگڈن میں داخل کرایا گیا۔ یہ بیماری طویل ہوتی گئی۔ اور حالت بے ہوشی میں ۶/ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔

□□

Marfat.com

فیاض علی ہاشمی

زندگی اور موت کا سلسلہ ابتدائے کائنات سے جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ ہر نئی زندگی کچھ افراد کے لیے خوشیوں اور مسرتوں کا سماں باندھتی ہے تو کسی کی موت کچھ لوگوں کو دُکھی اور غم زدہ کر دیتی ہے، لیکن زمانے میں ایسی ہستیاں بھی ہیں جن کی زندگیاں ان کے متعلقین کے علاوہ دوسروں کو بھی متاثر کرتی ہیں اور ایسی ہی زندگیاں اپنے دور میں اپنا کردار کچھ اس طرح ادا کرتی ہیں کہ اس کے اثرات تادیر قائم رہتے ہیں۔ ان سے زمانے کو نئی اقدار ملتی ہیں، جینے کا سلیقہ بتاتے ہیں، مشکلات کو جھیلنا اور اپنے اصولوں کو پامال کیے بنا اس سے نکلنا، اپنی ذات کو محض کائنات نہ سمجھنا، اس طرح کی اور بہت سی خصوصیات کے ساتھ زندگی کے مشکل سفر کو آخری سانس تک پورا کرتے ہیں۔ میرے سامنے ایسی ہی ایک زندگی کچھ اسی طرح سے ختم ہوئی۔

۱۹۰۱ء میں میر نیاز علی ہاشمی کے گھر ان کا دوسرا بیٹا پیدا ہوا۔ میر نیاز علی پرانی دلّی کے پہاڑی بھوجلہ علاقہ میں واقع کالی حویلی، جس کا اب کوئی نام ونشان باقی نہیں، میں رہائش پذیر تھے، کون تھے یہ میر نیاز علی؟ کون جانے گزرے وقتوں کی باتیں؟ انقلابات زمانہ بڑے بڑوں کی شناخت مٹا دیتا ہے۔ نہ جانے کتنے شاہ گدا ہوئے اور کیسے کیسے ارزال اشراف ہو گئے۔ دلّی جس کی قسمت میں سیاسی دارالخلافہ ہونا تو لکھا تھا مگر یہاں کے مکین اور مکین بدلتے رہتے ہیں۔

شاہجہاں نے شہر بسایا لال قلعہ اور جامع مسجد عالم وجود میں آئے۔ جامع مسجد کی امامت کے لیے شاہجہاں نے بخارا کی طرف رجوع کیا جو کہ اسلامی علم وادب کا اہم اور بڑا

Marfat.com

مرکز تھا، قائدانہ حیثیت رکھتا تھا، وہیں کے ایک دینی خانوادہ نے شاہجہاں کی دعوت کو قبول کیا اور بخارا سے دلّی کوچ کیا۔ اس خاندان کے ساتھ ساتھ ایک بڑا قافلہ دلّی آیا، ان میں میر نیاز علی کے اجداد بھی شامل تھے۔ خوشحالی اور معاشی آسودگی دور دور سے باکمال لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی جو یہاں پہنچ گیا سو اس خاک کا حصہ ہوا۔

مغلیہ دور کی خوشحالی میں پنپے، مغلیہ زوال سے گزرے اور انگریزوں کی غلامی میں تڑپے۔ ہندوستان کی غیور عوام کو کسی بھی حال میں انگریزوں کی غلامی گوارا نہیں تھی۔ مگر بادشاہ کمزور تو عوام مجبور و لاچار۔ جی رہے تھے کیوں کہ جینا تو بس مقدر تھا۔ قضا تو وقت پر آئے گی، نہ اپنی خوشی سے جینا اور نہ اپنی خوشی سے مرنا۔

قلعہ معلّٰی کی ویرانی اور معاشی بدحالی نے دہلی والوں کو ادھر اُدھر بھٹکایا۔ میر نیاز علی بھی اپنے خاندان کے ساتھ معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کی غرض سے راجستھان کی مالدار ریاستوں کا رُخ کرتے ہیں، کبھی اجمیر اور کبھی بیکانیر میں اپنے حصہ کا رزق حاصل کرتے رہے مگر دلّی کیسے چھوٹے، لوٹ کر آئے، اب بچے بڑے ہو رہے تھے، تعلیمی سلسلہ شروع ہوا، قرآن کی تعلیم کیوں کہ لازمی سمجھی جاتی تھی سو بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دی گئی۔ اس کے بعد دوسرا قدم اسکول یا مدرسہ کی طرف اٹھایا جانا تھا تو رسائی اینگلو عربک اسکول تک ہوئی۔ اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ فیاض علی بھی اسکول پہنچ گئے۔ ایک ہونہار اور محنتی طالب علم کی حیثیت سے ابھرے۔ ریاضی میں خصوصی مہارت رکھتے تھے، دلّی کے اسکول مقابلوں میں شریک ہوئے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ چھوٹے بھائی کھیل کے میدان میں دوڑ پڑے۔ شجاعت علی ہاشمی فٹ بال کے ساتھ ساتھ تعلیمی سلسلہ کو بھی نبھاتے رہے مگر چھوٹا بھائی وارث علی کھیل کی حد تک محدود رہے۔

فیاض علی اسکول کی آخری منزل پر پہنچے تو بیماری نے آ پکڑا اور میٹرک کے امتحان میں شریک نہ ہو پائے اور یہیں سے ان کی زندگی ان کو دوسرے راستے پر لے گئی۔ علاج معالجہ شروع ہوا۔ طبیب نے نیاز علی صاحب کو مشورہ دیا کہ اگر اس بیٹے کی زندگی چاہتے ہو تو اس کو آزاد چھوڑ دو جتنی زندگی بچی ہے آرام سے گزر جائے۔ آج تک یہ پتہ نہیں چلا کہ آخر ایسی کون سی بیماری تھی کہ یہ مشورہ دیا گیا؟ انگریزوں کی غلامی میں آزادی کا مشورہ بھی خود

کتنا عجیب تھا۔ مصیبت کے مارے میر نیاز علی کیا کرتے۔ فیاض علی پر سے بہت سی لازمی پابندیاں اٹھالی گئیں۔ کھانے وغیرہ میں پرہیز کا خاص خیال رکھا جانے لگا۔ لڑکپن سے نوجوانی کی طرف بڑھتے قدم اور فضاؤں میں انگریزی حکومت کے خلاف گونج رہے نعرہ، طبیعت میں جوش اور ولولہ اور گھر والوں کی طرف سے ملی ہوئی طبی مشورہ کی چھوٹ، آزادی کی جنگ میں جٹے ہوئے مجاہدین سے ملا دیتی ہے۔ شاید خود ان کو بھی یہ یقین ہو گیا تھا کہ اب زندگی کا تو کوئی بھروسہ نہیں۔ ایسا مرنا بھی کیا مرنا، انگریزوں کے خلاف لڑائی میں مرے تو مرنا بھی کسی کام کا ویسے بھی زندگی ہے کتنے دن کی۔

دلّی اور خاص طور پر علاقہ جامع مسجد ان سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ علمائے کرام بلاخوف میدانِ عمل میں تھے۔ عوام علما سے دِلی عقیدت رکھتی تھی۔ صبح شام حریت کے نعرے سنے جاتے تھے۔ قربانی کا جذبہ بڑھ رہا تھا۔ جلسے اور جلوس زندگی کا معمول بن گئے تھے۔ ابھی کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات کا بھی وجود نہیں تھا۔ ایک ہی نعرہ تھا ''انگریزی حکومت سے آزادی اور صرف آزادی'' دلّی کے گلی کوچوں میں قائدانہ صلاحیت رکھنے والے موجود تھے اور قدر شناس عوام کی بھی کمی نہ تھی۔ اللہ نے ایک ساتھ بڑی قدآور شخصیات کو دلّی کی سرزمین پر اتار دیا تھا۔ پاکیزہ سیرت عالم دین حضرت مفتی کفایت اللہؒ دلّی کے انھیں کوچوں میں مرکز نور و ہدایت تھے۔ دریا گنج کی طرف چلو تو سیاسی تدبر کی علامت رفیع احمد قدوائی، آصف علی۔ ادھر کلاں محل میں سحبان الہند مولانا احمد سعیدؒ جلوہ سامانیاں بکھیر رہے تھے۔ پہاڑ گنج سے گزریں تو قرول باغ میں مولانا حفظ الرحمٰن سیاسی اقدار کو جلا بخش رہے تھے۔ دلّی کی سماجی اور سیاسی جھلکیاں اگر یہاں پیش کی جائیں تو کئی جلدیں درکار ہیں، جس کا موقع نہیں۔ لوٹ آتے ہیں پھر فیاض علی کی طرف۔ بلند قد، چھریرا بدن دیسی گندم کا رنگ لیے ہوئے، ہڈی بہت چوڑی، ہاتھ اگر تھامیں تو لگتا ہے کہ نرم اور پہناور آغوش میں سماگئے۔ چہرہ کتابی، ستواں ناک، باریک ہونٹ، دانت موتی جیسے، اگر مسکرائیں تو ترنم اور غصہ آئے تو خدا کی پناہ۔ ہم نے ہوش سنبھالا اور رشتوں کو جانا تو اپنے والد کو کچھ اس طرح پایا۔ باریک ہونٹوں کے درمیان ترچھی سگریٹ پھنسی ہوئی۔ بڑے مست انداز میں دھواں اڑاتے، مجھ کو ان کا سگریٹ پینا اچھا نہیں لگتا اور اکثر

Marfat.com

گستاخانہ انداز میں ہونٹوں سے نکال کر پھینک دیتا تھا اور وہ میری اس گستاخی کو مسکرا کر برداشت کرتے تھے۔ ہر وقت دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ بے تکلف نشستوں کے عادی۔ گھر سے نکلے تو بس نکلے۔ سودا لینے گئے تھے اور الجھ گئے کسی تازہ سیاسی مسئلہ میں، بھول گئے کہ گھر میں بیوی کھانا پکانے کے انتظار میں ہے۔ چوک انجمن پر خلیفہ ایوب مرزا کا کمرہ، روزمرہ کی زندگی کا لازمی حصہ۔ ظہر کی نماز سے پہلے بس یہ ہی ٹھکانہ۔ اب خلیفہ ایوب مرزا کا ذکر خیر کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

جنگ آزادی کے یہ سپاہی آخر کرتے کیا تھے؟ بنا کسی ہتھیار اور بنا کسی ساز و سامان کے ان لوگوں کو کس طرح سے انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اکثر میں یہ سوال کرتا تھا کہ ابا جان کس طرح کی لڑائی لڑتے تھے؟ وہ اکثر بہت ساری باتیں بتایا کرتے تھے کہ کس طرح سے مختلف لوگ الگ الگ ذمہ داریاں نبھاتے تھے۔ ہر گروپ اپنے طور پر پروگرام مرتب کرتا تھا اور اپنے قائد کے حکم کے مطابق اس کو انجام دیتا تھا۔ ان کا گروپ انگریزی حکومت کے خلاف اشاعتی شعبہ سے وابستہ تھا اور یہ اس کے اہم رکن تھے۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ چوڑی ہڈی دست و بازو جوش جہاد سے پر اور غیر ملکی حکمرانوں کی غلامی سے نفرت ان کے اس کام میں بڑی معاون ثابت ہوئی تھی۔ برٹش حکومت اپنی ساری کوشش کے باوجود نہ تو ارونا آصف علی کو پکڑ سکی اور نہ ہی اس پریس کو پکڑ پائی جس سے روزمرہ پمفلٹ اور پوسٹر شائع ہوتے رہتے تھے۔ ایک پروگرام کے تحت دلّی کے اہم علاقوں کی اہم سڑکوں کے نام تبدیل کرنا طے ہوا۔ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنایا گیا اور سول لائن تک کے نام تبدیل کر دیے گئے۔ دلّی میں سول لائن برٹش حکومت کے انتظامیہ کا اہم مرکز تھا اور انقلابیوں نے اپنا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا اور یہ کام فجر کی نماز سے قبل انجام دے دیا گیا۔ بتاتے تھے کہ ہم اپنا کام ختم کر کے جامع مسجد لوٹ آئے اور نماز فجر وہاں ادا کی اور سی آئی ڈی والوں نے ہم کو نماز کے بعد مسجد سے باہر آتے ہوئے دیکھا۔

برٹش حکومت اس حرکت سے بہت جھنجھلائی ہوئی تھی اور اس نے ان لوگوں کو جو اس

پریس اور اشاعتی سرگرمیوں سے جڑے ہوئے تھے زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر ۲۵ ہزار کا بڑا انعام مقرر کیا تھا۔ میں نے کہا ابا جان یہ تو بہت بڑا انعام تھا۔ کہنے لگے انگریز یہ سمجھتے تھے کہ پریس پکڑا جائے گا تو اس سے زیادہ قیمت کا ہوگا۔ مگر وہاں پریس تو تھا ہی نہیں۔ پانچ جیالے نوجوان پتھر کی سلوں پر رات بھر چھپائی کرتے تھے اور صبح ہونے تک ان پمفلٹس کو تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ لگتا تھا قدرت نے فیاض علی کو بڑے بڑے چوڑے اور موٹے ہاتھ شاید اسی کام کے لیے دیے تھے۔ پریس سے متعلق یہ اسباب اور اشخاص ایک غدار ساتھی کی مخبری سے قرول باغ سے پکڑے گئے۔ مگر انگریزوں کو پریس کے بجائے پتھر کی سلیں ملیں اور وہ اس پر سر پھوڑتے رہے۔ مقدمہ چلا، تحریری نمونوں کی جانچ پڑتال ہوئی، شملہ سے ماہرین آئے اور تحریری نمونہ ملائے گئے۔ اقبالیہ بیان درج ہوئے اور عدالت میں مقدمہ فیصلہ کن مراحل میں داخل ہوا۔ نور الدین بیرسٹر صاحب اس مقدمہ میں ان آزادی کے سپاہیوں کے وکیل تھے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ تم اپنے اقبالی بیان سے منحرف ہو جاؤ۔ ہاشمی صاحب بولے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بیرسٹر صاحب نے کہا اب ایسا ہی کرو۔ بس پھر کیا تھا جوش جنوں اور زیادہ۔ کارروائی شروع ہوئی، ماہرین کی رائے، ملزمین کا اقبالیہ بیان، سزا کا ماحول سازگار، سزا تو کوئی بات نہیں، مگر تحریک پر اس کے منفی اثرات پڑنے کا خدشہ تھا۔ اس لیے فیاض علی نے اپنے اقبالیہ بیان سے انحراف کیا۔ عدالت میں ماحول بدل گیا۔ جج نے کچھ سننے سے انکار کیا۔ ہاشمی صاحب نے بڑھ کر جج صاحب کا قلم پکڑ لیا۔ عدالت میں افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا۔ آخر کار سزا سنائی گئی اور تین الگ الگ دفعات کے تحت تین معاملات میں تین تین ماہ کی سزا ایک ساتھ سنائی گئی۔ یعنی صرف تین ماہ کی قید کا حکم ہوا۔ اپنی یادداشت میں اس واقعہ کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے:

> ''۴۳/۲/۱۴ کو صدر بازار پولس نے سی آئی ڈی کی مدد سے قرول باغ سے گرفتار کیا جس میں سائیکلو اسٹائل کا سامان کلکتہ میں بھاری بھمکری کے خلاف بلٹین برآمد ہوا اور ساتھ میں مظفر حسین ولد محمد عثمان علی، کنہیا لال بھارگو ولد بنواری لال گرفتار کیے گئے۔ دفعہ ۲۶(۶)، ۳۹(۶) ڈیفینس آف انڈیا رولز میں تین تین ماہ قید کی سزا سنائی۔

(سزائیں ساتھ ساتھ چلیں) یعنی کل تین ماہ قید ہوئی''۔

اکثر جیل کی باتیں بیان کرتے تھے۔ دلچسپ واقعات بتاتے تھے جیل کے ساتھی اور جیل کی زندگی جیسے قبر کا حال مردہ ہی جانے۔ باہر آزاد فضا میں رہنے والے اس کو صرف تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں۔ جیل کی صبح کس طرح ہوتی ہے؟ دوپہر کا انداز جدا، شام جدا اور رات تو بالکل ہی دوسرے انداز میں۔ گاندھیائی طرز پر جدوجہد آزادی سے جڑے ہوئے لوگوں کا انداز جدا تھا۔

جیل میں رہتے ہوئے اصولی طور پر جیل مینول کا پوری طرح سے خیال رکھا جاتا تھا اور یہ کوشش ہوتی تھی کہ اس کی پابندی کی جائے اور اگر انتہائی غیر معمولی حالات ہوں اور انتہائی جذباتی ردعمل میں ضابطہ کی پابندی نہ ہو پائے تو معافی مانگ لی جائے۔

فیاض علی کھانے پینے کے معاملے میں بہت زیادہ وہمی تھے۔ صفائی اور پاکیزگی کے بہت کٹر اصول تھے جس پر کوئی سمجھوتہ نہیں اور یہ رویہ ساری زندگی قائم رہا، جس سے بڑے مسئلے بھی پیدا ہوئے تھے مگر یہ ٹس سے مس نہیں ہوئے تھے۔ دعوت میں کھانا کھانے سے ممکنہ حد تک پرہیز کرتے تھے، جب تک ان کی تسلی نہ ہو جائے کہ کھانا باقاعدہ صفائی اور اطمینان بخش طریقہ سے تیار ہوا ہے، باورچی کون ہے؟ روٹی کس تندور پر لگی ہے وغیرہ وغیرہ اس کے بعد دسترخوان پر اپنی پلیٹ خود دھوکر اس میں کھانا کھاتے تھے۔ اکثر احباب ان کے اس رویہ سے زچ بچ ہوتے تھے، تو کبھی کوئی از راہ مروت اور پاسداری پلیٹ دھوکر لا دیتا تھا، مگر ہر کسی کی دھلی ہوئی پلیٹ بھی تو گوارا نہیں تھی۔ ایک بار تو مروت کی حد ہوگئی بڑے خلوص کے ساتھ ایک صاحب نے پلیٹ دھوئی اور اس کو خشک کرنے کے لیے اپنی جیب خاص سے رومال بڑے اہتمام سے نکالا اور پلیٹ کو پونچھ ڈالا بس پھر کیا تھا اتنی مروت اور محبت برداشت نہیں کر پائے اور بولے بھائی میں آپ کو اسی لیے تو زحمت نہیں دے رہا تھا کہ آپ پلیٹ پونچھ کر اپنا رومال اور میرا ایمان خراب کریں۔ لیکن ہاشمی صاحب کا یہ وہم اور صفائی کا تصور جیل میں ان کے لیے اور ان کے ساتھیوں کے لیے بہت اہم تھا۔ سب کو یہ بھروسہ ہوتا تھا کہ ان کی موجودگی میں گوشت اور سبزی و دال کے برتن یقینی طور پر الگ رہیں گے۔ کوئی پلیٹ اور کفگیر بھی ادھر سے ادھر نہیں ہوئے گا۔ اسی وجہ سے

کھانے کے نگراں ہاشمی صاحب ہی ہوتے تھے۔ جیل کے ساتھیوں میں ہیم چند جین جیسے ساتھی بھی کھانا اطمینان کے ساتھ کھاتے تھے۔

فیاض علی ہاشمی کی زندگی کے چالیس پینتالیس برس اسی طرح گزر گئے۔ کچھ کرنے کے جب دن تھے تو انگریزی سامراج کے خلاف لڑائی لڑتے رہے اور شاید یہ خواب دیکھتے رہے کہ ایک دن ملک آزاد ہوگا، انگریز ملک چھوڑ کر چلے جائیں گے، ہندوستانیوں کو اپنے ملک کی باگ ڈور نصیب ہوگی، غیر ملکی حکمرانوں سے مظلوم عوام نجات پائیں گے۔ انصاف قائم ہوگا اور ملک کی دولت ملک کے عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ ہوگی۔ خوشحالی اور امن کا دور آئے گا۔ یہ جنگ آزادی کے وہ متوالے سپاہی تھے جو ملک کی مکمل آزادی کے خواہاں تھے، ان کو کسی بھی قیمت پر آدھی آزادی قبول نہیں تھی اور ملک کی تقسیم کے بارے میں تو وہ کسی بھی قیمت پر آمادہ نہیں تھے۔ کانگریسی مسلمان کسی بھی صورت میں ملک کی تقسیم کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ مولانا آزاد کی قیادت میں علماء کی اکثریت غیر منقسم ملک کی طلبگار اور طرفدار تھی مگر قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔ انگریز اور ملک کے مفاد پرست سیاست دانوں کی جیت ہوگئی اور ملک بٹ گیا۔ یہ کانگریسی مسلمان جو کہ ایک ساتھ کئی محاذوں پر لڑ رہے تھے بٹوارے کے ساتھ یہ بھی ٹوٹ گئے۔ مسلم لیگی برادرانِ وطن اُدھر کے ہو کر خوش ہو گئے اور اِدھر کے مفاد پرست سیاست دانوں کو اب قومی جذبہ سے سرشار ان کانگریسی مسلمانوں کی بھی کیا ضرورت رہ گئی تھی۔ مولانا آزاد بھی اپنے مجروح وقار کے ساتھ راضی بہ رضا ہو گئے۔ آزادی کی جنگ تو ختم ہوگئی مگر اس سے زیادہ بدتر حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ دونوں طرف سے نفرت کا سیلاب امڈ پڑا اور کل تک کے ہمسایہ اور دوست ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے اور یہ آزادی کے سپاہی اب اپنوں کے ہاتھوں ہونے والی بربادیوں کو روکنے میں جٹ گئے۔ بٹوارہ کی تلخیاں ایک کے بعد دوسری اور تیسری نسل تک زندہ ہیں، نہیں ہیں تو وہ نہیں جنھوں نے محض وطن دوستی اور قومی عزت کے لیے قربانیاں دی تھیں۔

دوسرے اور بہت سے کانگریسی مسلمانوں کی طرح ہاشمی صاحب بھی کیا کرتے؟ ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے ادھر جا نہیں سکتے کیوں کہ کس طرح سے وہ کڑوا گھونٹ حلق سے

اتاریں جس کی مخالفت ساری زندگی کرتے رہے۔ حالات کسی طرح اطمینان کا ایک لمحہ گزارنے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔ لٹے ہوئے خاندانوں کو دیکھتے، بچھڑے ہوئے لوگوں کو ملانے میں مدد کرنا، ڈرے ہوئے لوگوں کو دلاسہ دیتے تھے اور ہمت اور حوصلہ کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر رکنے کی ترغیب دیتے۔ حالات تھے کہ جمنے نہیں دیتے تھے دل کہتا تھا کہ کیسے چھوڑ جاؤں یہ گلیاں؟

آزادی کی لڑائی میں فیاض علی اپنی نجی زندگی کو تو گویا بالکل خیر باد کہہ چکے تھے۔ دونوں چھوٹے بھائیوں کی ازدواجی زندگی شروع ہو چکی تھی اور اپنے اپنے کام دھندہ سے لگے ہوئے تھے اور یہ کبھی جیل میں قید تو کبھی گھر میں نظر بند اور کبھی روپوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ احباب نے کہا اب تو اپنا بھی خیال کرو۔ خیال کیا کرتے؟ اپنا اب کیا رہ گیا تھا کام دھندہ تو تھا نہیں جنگ لڑتے یا کاروبار کرتے انگریزوں کی کسی گولی پر ان کا نام نہیں تھا، فسادیوں کا بھی بس نہیں چلا اور نفرت اور فرقہ پرستی کے زہر میں ڈوبے ہوئے ان نیشنلسٹ مسلمانوں کے دشمن پولس اہل کار بھی ان کو ختم نہیں کر پائے۔ مگر بڑے بڑے جمے ہوئے خاندان اکھڑ گئے اور ہجرت کی راہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ افراتفری کا ماحول تھا۔ غیر یقینی صورتِ حال میں اپنے چہیتوں کو محفوظ مقام پر پہنچانے کی تگ ودو تھی۔ محلّہ رودگران کے باسی اخلاق الرحمٰن بھی دل برداشتہ ہو چکے تھے۔ دلّی چھوڑنے کا ارادہ کیا دو بیٹے اور دو بیٹیوں کو لے کر ہجرت کا ارادہ کیا۔ کسی بندۂ خدا نے ہاشمی صاحب کے لیے اخلاق الرحمٰن صاحب کی بیٹی کا رشتہ ڈالا اور ۱۳۔ ۱۴ سال کی یہ لڑکی ہاشمی صاحب کی زوجہ بن گئی۔ یہاں سے ہاشمی صاحب کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔

شادی تو ہو گئی مگر ہاشمی صاحب کو ایسا لگا کہ ان کے خواب چکنا چور ہو گئے، زندگی نے ان کے ساتھ ایک اور دھوکہ کیا ہے۔ جس جنت کا اور جس حور کا وہ تصور لیے ہوئے تھے وہ ان کو نہیں ملی۔ کیوں کہ ان کی بیوی شاید ان کے تصور میں بسی ہوئی حور پیکر نہیں تھی۔ کم عمر بیوی جس کے سب عزیز واقارب پاکستان ہجرت کر چکے تھے۔ اب ہاشمی صاحب پر ہی انحصار کیے ہوئے تھی۔ ہاشمی صاحب اپنی بیوی سے خوش نہیں تھے۔ شادی کے تقریباً ایک سال بعد بڑے اہتمام سے ان کو پاکستان روانہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ بمبئی کا سفر کیا اور

Marfat.com

پانی کے جہاز کے ذریعہ کراچی روانہ کرنے کا انتظام کیا۔ جہاز پر سوار کیا اور ساحل پر کھڑے ہوکر دعا کرنے لگے کہ خدا کرے یہ جہاز ہی غرق ہو جائے کہ شاید اس بیوی سے نجات مل جائے۔ کہاں وہ آزادی کے دن اور کہاں یہ پابندیاں۔ ساحل پر کھڑے ہوکر تو نجات کی دعا مانگ لی مگر دلّی لوٹ کر آئے تو چین نہیں ملا، کراچی کا سفر کیا اور اسی بیوی کو لے آئے، نہ صرف واپس لائے بلکہ دعا مانگنے کی ساری روداد بھی سنائی۔ کیا گزری ہوگی اس بیچاری پر یہ تو خدا ہی جانے؟

دلّی والے اپنے چٹورپن کے لیے بدنام ہیں لیکن ان کا یہ چٹورپن بے ڈھنگا پن نہیں جو کہ دلّی والوں کے نام پر کیا جاتا ہے۔ دلّی والے اچھے کھانے کے شوقین ہوتے ہیں اور بڑے ذوق وشوق سے کھانوں کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ ہاشمی صاحب ان سے الگ کیسے ہو سکتے تھے؟ دوستوں کی محفلیں گرم رہتی تھیں اور کھانے کے بہانے ڈھونڈے جاتے تھے۔ سردیوں کے کھانے الگ، برسات کے مزے الگ۔ دلّی والے برسات میں قطب نہ جائیں تو حیرت ہوتی تھی یہ بھی اپنے احباب کے ساتھ ان سیرسپاٹوں کے عادی۔ دلّی والے جو کھانے کے شوقین ہیں وہ ان کے ذائقوں اور روایتی مصالحوں کا خاص اہتمام رکھتے ہیں ایک آنچ کی کسر بھی برداشت نہیں کرتے سو ہاشمی صاحب بھی اس معاملے میں بہت کٹر۔ ادھر بیوی کم عمری کی وجہ سے کھانا پکانے میں اناڑی۔ ہاشمی صاحب نے بڑی لگن اور مشقت سے ان کو کھانا پکانا سکھایا اور پھر ایسا وقت آیا کہ جس نے ایک بار ان کے ہاتھ کا کھانا کھالیا بار بار کھانے کا خواہش مند رہا۔ مگر ہاشمی صاحب کا ذائقہ اور مشاہدہ بڑا پکا تھا مصالحوں کی کمی بیشی کو فوراً پکڑ لیتے تھے اکثر سنا جاتا تھا کہ ''مسرت آج تم نے سونف کم ڈالی ہے شب دیگ کا مزہ کھلا ہی نہیں یا آج زیرہ ڈالنا بھول گئیں نہاری میں چٹک پیدا نہیں ہوئی'' غرضیکہ ایسا لگتا تھا کہ مصالحوں کی مقدار کھانوں کے ذائقوں کے ساتھ منہ کے کمپیوٹر میں محفوظ ہے، ذرا سی کمی بیشی فوراً غلطی کا الارم بجادیتی تھی۔

ہمارے ہاشمی صاحب اپنے مقدر سے زندگی بھر لڑتے رہے۔ اولاد کا سلسلہ شروع ہوا، چاہتے تھے کہ پہلی اولاد لڑکی ہو مگر اللہ کو لڑکا منظور تھا خیر سے دوسری اولاد بیٹی ہوئی، مراد برآئی بڑی خوشی منائی گئی بیٹے کو بھی چاہنے لگے بڑی دھوم دھام سے عقیقہ کیا ننھے سے

بچے کو سرتاپا پھولوں سے لاد دیا۔ پھولوں کا شوق دیوانگی کی حد تک تھا۔ گھر میں ہر وقت تازہ پھول گلدستہ میں سجے رہتے تھے۔ آج کی طرح گلدستہ بازار میں فروخت نہیں ہوتے تھے۔ دلّی کے باغوں میں اور خاص کر نئی دلّی کے باغیچوں میں وضع وضع کے پھول اگائے جاتے تھے۔ دیسی پھولوں کے علاوہ انگریزی پھول بھی اگائے جاتے تھے۔ یہ اپنے شوق کے لیے مالیوں کو پیسے دے کر ان سے پھول لاتے تھے اور گھر میں سجاتے تھے۔ یہ بیٹی ان کی زندگی میں ایک خوشگوار جھونکے کی طرح آئی اور بڑی خاموشی سے ایک بھیانک آندھی بن گئی۔ یہ ننھی بچی تین چار سال کی عمر میں پولیو کے موذی مرض کا شکار ہوگئی۔ ہاشمی صاحب پر گویا دیوانگی سوار ہوگئی۔ آزادی ملی تو تقسیم کا داغ لیے ہوئے، بیٹی ملی تو پولیو کی بیماری لگ گئی۔ ان کی زندگی اس بچی کی دیکھ بھال اور علاج معالجہ کے لیے وقف ہوگئی۔ جگہ جگہ علاج کی غرض سے بھٹکتے رہے۔ بمبئی لے گئے کہ آپریشن ہو جائے اور بچی کے پاؤں صحیح ہو جائیں وہاں سے واپس دلّی لوٹ آئے کہ دلّی میں امریکن اسپتال میں بہت اچھا سرجن ہے اس سے ملو، صفدر جنگ کے چکر شروع ہوئے جس نے جو بتایا سو وہی علاج کیا طرح طرح کے روغن بنائے گئے۔ دنبہ کی چکتی سے بھی روغن بنایا گیا اور مالش کی گئی۔ ہر طرح کی ورزش کرائی گئی مگر مرضیِ مولا کچھ اور ہی تھی۔ صفدر جنگ اسپتال میں بھرتی ہوگئی اور آپریشن کی تاریخ بھی مقرر ہوگئی کہ ۶۵ء کی جنگ شروع ہوگئی اور اس کے منحوس سائے صفدر جنگ اسپتال پر بھی پڑے۔ زخمیوں کی بڑی تعداد اسپتال آنے لگی۔ حالات کا اندازہ ہو گیا کہ اب آپریشن ممکن نہیں۔ وارڈ خالی کرائے جانے لگے اور یہ بے نیل مرام گھر لوٹ آئے۔ اس بیمار اور چہیتی بیٹی نے ہاشمی صاحب کو بالکل توڑ دیا تھا۔ اولادیں اور نصیب ہوئیں مگر توجہ کا مرکز یہ بیٹی ہی رہی اور رہتی بھی کیوں نہیں چاہتے بہت تھے اور چہیتی ہی معذور ہوگئی تھی۔ کثیر الاولاد ہاشمی صاحب ۱۳ بچوں کی ذمہ داری نبھاتے رہے۔ زندگی کے کٹھن اور مشکل دور بڑے صبر و استقلال کے ساتھ بسر کیے، زمانہ کے نرم گرم حالات کو خندہ پیشانی سے جھیلتے رہے، مگر اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا۔ خودداری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے، بہت سے حادثے اور صدمے پے در پے رونما ہوتے رہے ایک ایک کا کیا ذکر کیا جائے۔ زندگی نے ہاشمی صاحب کو بار بار مارا۔ ۲۲ سالہ جوان بیٹا ریل

Marfat.com

کے ایک حادثہ کا شکار ہوا۔ جوان بیٹے کی موت نے کمر توڑ دی۔ ابھی ذرا سنبھالا لیا تھا کہ رفیقِ حیات داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئیں، زندگی بے مقصد ہوگئی۔ مگر موت کا تو ایک دن معین ہے۔ اور وقت معین تک تو سانس چلنی ہی ہے سو چلی اور اسلامی کلینڈر کے حساب سے ایک صدی پوری کرنے کے بعد ۱۳ رجولائی ۱۹۹۹ء/ ۲۹ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ منگل کی صبح اس دارالعمل کو چھوڑ کر سوئے دارالبقا کوچ کر گئے۔

آنہا کہ کہن شدند و اینہا کہ نواند
ہر کس بہ مراد خویش یک تک بدوند
این کہنہ جہاں بہ کس نماند باقی
رفتند و رویم و دیگر آیند و روند

(خیام)

نوٹ: اس خاکہ میں ہاشمی صاحب کی زندگی سے متعلق واقعات کا تذکرہ خود ان کے بیان کردہ حقائق پر مبنی ہے۔ (محمود فیاض)

Marfat.com

رتن موہن ناتھ زتشی خارؔ دہلوی

یہ اب سے ساٹھ برس پہلے کی بات ہے جب خار صاحب کا ہمارے گھر سے ایسا تعلق اور رشتہ استوار ہوا کہ انقلاباتِ زمانہ اور وقت کے تھپیڑے کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔ وقت گزرتا گیا یہ رشتہ مضبوط سے مضبوط ہوتا گیا۔ آج خار صاحب اس دنیا میں نہیں دونوں گھروں کے افراد بلاتفریق مذہب وملت ہر خوشی، ہر غم میں ایک دوسرے کے شریک ہیں۔

ہمارا آبائی گھر لال دروازہ سرکی والان میں تھا۔ پڑوس میں سراج الدین خاں سائلؔ دہلوی رہتے تھے۔ اگر پڑوسی اچھے ہوں تو پھر خاندان، مرتبہ اور حیثیت کا فرق مٹ جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ سائلؔ دہلوی کی اہلیہ لاڈلی بیگم نے میری حقیقی پھوپھی کو بچپن میں گود لیا تھا، ان کی ساری تعلیم وتربیت اسی گھر میں ہوئی۔ خارؔ صاحب، سائلؔ صاحب کے چہیتے شاگرد تھے اور وہ کلام پر اصلاح اور مشورۂ سخن کے لیے روز ہی وہاں آتے۔

سلونو کا تہوار تھا خارؔ صاحب استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر خلافِ معمول خاموش اور کچھ اداس۔ استاد نے بھانپ لیا کہ ان ہونی ہے جو یہ چہکتا بلبل خاموش ہے۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ بہن دلی میں نہیں اور بہن کے راکھی نہ باندھنے کے باعث مضمحل ہیں۔ سائلؔ صاحب نے اسی وقت بازار سے راکھی منگوائی، ملازم کو بھیج کر میرے والد صاحب کو بلایا گیا۔ والد مرحوم کا بیان ہے: جب میں وہاں پہنچا تو خارؔ گردن جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ والد صاحب کو دیکھ کر سائلؔ صاحب گویا ہوئے ”یونس میاں! آپ کے والد حافظ صاحب تو حیدرآباد میں ہیں، آپ ان کے جانشین ہیں۔ آپ اچھی طرح واقف

Marfat.com

ہیں کہ خار ہمارے شاگرد ہی نہیں فرزند بھی ہیں۔ آپ کی چھوٹی بہن چنی ہماری بیٹی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ چنی خار کی کلائی پر راکھی باندھے ہم آپ کی اجازت چاہتے ہیں۔ ڈاڈا نیک کام کے لیے اجازت کیسی (سائل صاحب کو گھر میں سبھی ڈاڈا کہتے تھے) چنانچہ زنان خانے سے پھوپھی نے آکر راکھی باندھی اس طرح خار صاحب کو ایک اور بہن اور پھوپھی کو دوسرے بھائی ملے۔ بہن بھائی کے اس نئے رشتے کی بدولت دو مختلف مذاہب کے ماننے والے ایک کنبے میں تبدیل ہو گئے۔

خار دہلوی کا سربرآوردہ کشمیری برہمن خاندان سے تعلق تھا۔ یہ خاندان عہدِ شاہجہانی میں کشمیر سے ہجرت کر کے دلّی میں آباد ہوا تھا۔ اس خاندان کے بیشتر افراد عالم فاضل، اعلیٰ منصبوں پر مامور رہے اور انھیں راجہ دیوان اور رائے رایاں کے خطابات سے نوازا گیا۔ ان میں سے اکثر مغل شہزادوں کے اتالیق بھی رہے۔ خار صاحب کے بزرگوں نے سنسکرت، عربی، فارسی اردو اور انگریزی میں یدِ طولیٰ حاصل کیا، اپنا ایک مقام بنایا۔ یہ خاندان ہمیشہ قومی یکجہتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور مذہبی رواداری کا علمبردار رہا۔ خار صاحب کے والد علامہ پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی اندر پرستھ گرلز کالج میں اردو اور فارسی کے پروفیسر تھے۔ بڑے بھائی دینا ناتھ زتشی اسٹیج، ریڈیو، ٹی وی اور فلم کے نامور فنکار تھے۔ چھوٹے بھائی آنند موہن زتشی گلزار دہلوی اردو دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں۔ خار دہلوی ۱۵ر جنوری ۱۹۱۶ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت دلی میں ہوئی۔ کمرشل کالج دہلی سے آئی۔ اے کام کی ڈگری حاصل کی۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ کام کیا۔ ۱۹۳۶ء میں تعلیم سے فارغ ہو کر سینٹرل سکریٹریٹ میں ملازم ہوئے۔ جنوری ۱۹۷۴ء میں منسٹری آف ورکس اینڈ ہاؤسنگ میں انڈر سکریٹری کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ ۳۱ر جنوری ۲۰۰۲ء کو بمبئی میں انتقال ہوا۔

خار صاحب کے والد ہی نہیں والدہ بھی شعر کہتی تھیں بیزار تخلص تھا۔ گھر کے علمی و ادبی ماحول سے اردو اور فارسی شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا۔ چودہ پندرہ برس کی عمر سے باقاعدہ مشاعروں میں کلام پڑھنا شروع کیا۔ ابتدا میں اپنے والد علامہ زار سے اصلاح لی۔ بعد ازاں والدہ کی ایما پر سائل دہلوی کے باقاعدہ شاگرد ہوئے۔ غزلیات پر مشتمل پہلا مجموعۂ

Marfat.com

کلام ''خلش'' اکتوبر ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ سات سال بعد ۱۹۸۶ء میں دوسرا مجموعہ ''خارزار'' منظرِ عام پر آیا۔ ۱۹۹۶ء میں تیسرا مجموعۂ کلام ''گلستانِ خار'' مرتب کر رہے تھے کہ علیل ہوئے۔ تشخیص سے معلوم ہوا کہ معدے میں السر ہے۔ اسی دوران کالا موتیا بند ہوا۔ خارؔ صاحب کی اکلوتی بیٹی ڈاکٹر روہنی نے بغرض علاج بمبئی بلایا۔ خارؔ صاحب اور ان کی اہلیہ دونوں بمبئی پہنچے۔ وہاں پہنچ کر اس قدر طبیعت بگڑی کے دہلی واپس نہ آ سکے۔

خارؔ صاحب اپنے چھوٹے بھائی گلزارؔ دہلوی کی طرح سرخ سفید نہیں تھے۔ البتہ رنگ صاف تھا۔ کتابی چہرہ، خنداں پیشانی، چمک دار آنکھیں، ہمیشہ کرتا پاجامہ اور شیروانی پہنتے تھے۔ پیروں میں سلیم شاہی جوتی یا پمپ۔ ساری عمر ان کے لباس میں فرق نہیں آیا۔ ان کی اس وضعداری پر دفتر کے چھوٹے بڑے ''نواب صاحب'' کہا کرتے تھے۔ خارؔ صاحب کی مہذب شخصیت، شگفتہ شاعری اور ان کے تحت اللفظ پڑھنے کا منفرد انداز پر سامعین ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ آواز اونچی، کراری اور لہجہ خالص دلّی والوں کا تھا۔ اپنے استاد سائلؔ دہلوی کے انتقال اور بعد میں ملک کی تقسیم سے دہلی کی ادبی اور سماجی زندگی میں تہذیب و شرافت کا جو معیار تھا وہ برقرار نہ رہ سکا۔ چنانچہ خارؔ صاحب مشاعروں میں کم ہی شرکت کرتے۔ کبھی کسی جریدے کے مدیر نے غزل کی فرمائش کی تو کلام بھیج دیا۔ وہ رسالوں میں چھپنے کے شوقین نہیں تھے۔ یوں بھی فطرتاً کم آمیز اور کم گو تھے اس لیے انھیں اکھل کھرا یا مغرور سمجھا جاتا تھا مگر انھیں قریب سے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ وہ انتہائی خوش اخلاق، خوش اطوار شائستہ اور سنجیدہ انسان تھے۔ معاملات میں سخت گیر، حسنِ سلوک میں نرم دل، روادار اور شفیق مال و زر کی حرص و ہوا سے کوسوں دور، صابر و شاکر قانع۔ ان کی نو اولادیں ہوئیں۔ آٹھ بچے زندہ نہیں رہے۔ اب صرف نویں بیٹی ڈاکٹر روہنی بفضل ایزد تعالیٰ حیات ہیں اور شادی کے بعد بمبئی میں سکونت پذیر ہیں۔ ذرا سوچیے آٹھ بچوں کی وفات پر اچھے اچھوں کا کلیجہ منہ کو آ جائے، مگر ہر سانحے پر ضبط و تحمل سے کام لیا اور ہمیشہ یہی کہا ''مرضی مولا کی''۔

ایک روز خارؔ صاحب ہمارے گھر آئے۔ بیٹی کی ولادت کا مژدہ سنایا۔ مبارک سلامت کے بعد دادی اماں سے پوچھا حافظ صاحب کے کچھ کپڑے ہیں۔ خیر تو ہے۔

Marfat.com

دادی اماں نے کہا۔ بیٹی کے لیے چاہئیں آپ کی بہو کو کسی نے بتایا ہے کہ سوا سال تک کسی دراز عمر شخص کے کپڑے پہناؤ۔ اب میری نظر میں حافظ صاحب ہی ایسے شخص ہیں۔ اس وقت دادا ابا کی عمر نوے سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ چنانچہ دادی اماں نے اسی وقت کچھ انگرکھے اور کرتے دیے۔ کپڑے دیکھ کر خار صاحب کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ کپڑے بیگ میں رکھے اور اپنے مخصوص لہجہ میں کہا۔ اماں! رخصت کا پان عطا ہو۔

رخصت کے پان پر چونکیے نہیں۔ دلّی میں قاعدہ تھا کہ گھر میں کوئی بھی شخص آتا، سب سے پہلے پان اور پانی پیش کیا جاتا اس کے بعد شربت، چائے وغیرہ سے تواضع ہوتی اور پھر دوبارہ پان آتے یہ تواضع کا پان کہلاتا۔ کچھ دیر بعد میزبان یہ سمجھتے کہ اب مہمانوں کو رخصت ہونا ہے تو انھیں تیسرا پان پیش کرتے یہ رخصت کا پان ہوتا۔ آج دہلی میں پہلے سے زیادہ پان کھائے جاتے ہیں جسے دیکھو پنواڑی کی دکان پر کھڑا ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ پان کھانے کے آداب کیا ہیں۔ جہاں چاہا پیک تھوکی اور آگے بڑھ گئے۔

ڈپٹی نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کے ساتھی مولوی ذکاء اللہ کے لیے مشہور تھا کہ وہ وقت کے اس قدر پابند تھے کہ لوگ انھیں دیکھ کر اپنی گھڑیاں ملایا کرتے تھے۔ کچھ خار صاحب بھی وقت کے اتنے ہی پابند تھے۔ آندھی اور مینہ میں بھی منٹ بھر کا فرق نہ آتا اور جب جہاں پہنچنا ہوتا صحیح وقت پر پہنچتے۔ ایسا لگتا کہ گھڑی کی سوئیاں ان کے تابع ہیں۔ جو لوگ ان سے وعدہ کر کے وقت پر نہ پہنچتے ان کی تاخیر پر سخت برہم اور بیزار ہوتے۔ ان کا ہر کام وقت پر ہوتا۔ کبھی معمول میں فرق نہ آتا۔ ایک واقعہ سن لیجیے۔ کراچی (پاکستان) سے اردو کے مشہور ادیب یوسف بخاری صاحب تشریف لائے۔ دلّی والے تھے۔ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ مولانا امداد صابری نے ان کے اعزاز میں ٹاؤن ہال میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ سہ پہر پانچ بجے تقریب شروع ہوئی۔ بخاری صاحب کی شخصیت اور علمی، ادبی خدمات پر تقریریں ہوئیں۔ دو گھنٹے بعد اعلان ہوا کہ عشائیہ کے لیے دوسرے کمرے میں تشریف لائیں۔ اس وقت ساڑھے سات بج رہے تھے اور کمرہ قورمہ اور بریانی کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ کھانا شروع ہوا ایک شخص کے علاوہ سب ہی کھانے میں مصروف تھے۔ اس وقت نہ کھانے والے خار دہلوی تھے۔ مولانا امداد صابری اور مہمان

Marfat.com

یوسف بخاری صاحب نے بار بار کھانے کے لیے کہا مگر خارؔ صاحب ہر بار معذرت کر لیتے "میرے کھانے میں ایک گھنٹہ باقی ہے"۔ "کبھی کبھی بد پرہیزی کر لینی چاہیے" عقیل ناروی چہکے۔ ایک وقت کی بد پرہیزی اور مہینوں کی سزا یہ نہیں ہوسکتا۔ خارؔ صاحب دوپہر کا کھانا ایک بجے اور رات کو ساڑھے آٹھ بجے سے پہلے کبھی نہ کھاتے۔ اسی طرح صبح اور سہ پہر کی چائے کے اوقات بھی مقرر تھے۔ خارؔ صاحب کے گھر کوئی شخص پہنچتا تو اس کی خاطر مدارات ہوتی لیکن خارؔ صاحب اپنے مقررہ اوقات کے علاوہ کبھی خورد ونوش میں شریک نہیں ہوتے۔

خارؔ دہلوی نے تقریباً ستر برس شاعری کی۔ انھیں وہ شہرت اور مقبولیت حاصل نہ ہوسکی جس کے وہ مستحق تھے۔ انھیں اپنی ناقدری کا ملال بھی تھا لیکن شکوہ وشکایت کسی نے نہیں سنی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اہلِ کمال کی قدر اس کے اپنے وقت میں نہیں ہوتی آنے والا وقت ہی صحیح فیصلہ کرتا ہے۔ ممکن ہے اس ناقدری کے باعث انھوں نے مشاعروں میں جانا ترک کیا ہو۔ لیکن انجمن ترقی اردو شاخ دہلی کی شعری نشستوں میں پابندی سے جاتے۔ آپا حمیدہ سلطان تقریباً خارؔ صاحب کی ہم عمر تھیں مگر انھیں ہمیشہ خارؔ بھائی کہتیں۔ علی منزل میں ایک شعری نشست کے بعد مرحوم عزیز وارثی نے کہا خارؔ بھائی اگر آپ استاد بیخودؔ سے اصلاح لیتے تو کیسا رہتا...؟ عزیز ہم نے استادوں میں کبھی فرق نہیں کیا لیکن نواب صاحب اور استاد بیخودؔ کے مزاج میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔ بیخودؔ صاحب ہمارے ڈھب کے نہیں تھے۔ وہ منہ پھٹ اور بے مروت تھے۔ تم نے تو دیکھا ہے کہ نواب صاحب جب اصلاح کرتے تو ایک ایک لفظ پر کس قدر ردّ وقدح ہوتی۔ استاد یہ گوارا نہیں کرتے اور کسی دن ان سے چیخ جاتی ناحق رسوائی ہوتی۔ سچی بات کہنے میں انھیں باک نہ تھا۔ ایک بار ان سے دریافت کیا۔ خارؔ صاحب آپ خواجہ محمد شفیع کی اردو مجلسوں میں شریک ہوئے ہوں گے؟ ایک دو بار گیا پھر نہیں گیا۔ وہاں قدرے بے تکلفی کا ماحول تھا۔ چھوٹے بھی شریک ہوتے اس لیے ہماری میزان نہیں پٹی۔

خارؔ صاحب کی بیاضوں میں پانچ سو سے زائد غزلیں تھیں۔ میں نے کئی بار ان سے درخواست کی کہ اپنا مجموعۂ کلام شائع کرائیں مگر وہ ٹال گئے۔ ایک بار کہا میاں یہ کاتبوں

Marfat.com

کے پیچھے بھاگنا، پریس کے چکر لگانا ہمارے بس کی بات نہیں۔ عرض کیا مجھ پر چھوڑ دیجیے آپ غزلیں عنایت فرمائیں باقی کام میں خود کرالوں گا۔ اگست ۱۹۷۹ء میں ۲۱۰ غزلوں کا انتخاب کیا۔ کتابت سے کتابوں کی نکاسی تک کی ذمہ داری قبول کر کے میں نے پہلا مجموعہ کلام 'خلش' اکتوبر ۱۹۷۹ء میں شائع کرایا۔ خارؔ صاحب ان دنوں نمری کالونی میں رہتے تھے۔ فون کیا کہ کل آپ کی کتابیں لے کر آرہا ہوں۔ میرے ساتھ عبدالغنی بھی ہوں گے۔

''تم ایک بجے تک تو آجاؤ گے'' خارؔ صاحب نے پوچھا۔ اس سے پہلے ہی پہنچیں گے۔

''پھر دوپہر کا کھانا یہیں کھانا۔ میں خود اپنے ہاتھ سے پکاؤں گا''۔ اگلے روز ہم مجموعۂ کلام لے کر پہنچے تو وہاں ایک ڈش میں بھنا ہوا گوشت تھا۔ پہلا لقمہ لیا انتہائی لذیذ تھا۔ کھانے کی تعریف کی، تو فرمایا اس میں لہسن پیاز نہیں صرف دہی اور گرم مصالحے میں بھونا ہے۔ بیگم خارؔ بنارس کی رہنے والی تھیں ان کے والد پنڈت رگھونندن لال دَر کا تعلق اعلیٰ کشمیری گھرانے سے تھا مگر گوشت سے رغبت نہ تھی۔ خارؔ صاحب کو معلوم تھا کہ ان کی بیوی گوشت سے پرہیز کرتی ہیں۔ اس لیے وہ جب بھی گوشت کھاتے خود پکاتے۔ گوشت پکانے اور کھانے کے برتن علاحدہ تھے۔ خارؔ صاحب کشمیر کے اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو منگل کو بھی گوشت کھاتے ہیں۔ ایک بار بنارس سے چند لوگ آئے، سیدھے اس کمرے میں پہنچے جہاں خارؔ صاحب کھانا کھا رہے تھے۔ خارؔ صاحب کا کہنا ہے کہ میں نے دیکھا کہ مجھے کوفتے کھاتے دیکھ کر چرغم چرغم ہونے لگی۔ کچھ دیر برداشت کیا پھر کہا ''ماس گندھ آتی ہے تو برابر والا کمرہ موجود ہے وہاں تشریف لے جائیں میں کھانے سے فارغ ہو کر حاضر ہوتا ہوں''۔

خارؔ صاحب کے اپنے کچھ اصول تھے۔ ادھر کی دنیا چاہے اُدھر ہو جائے مگر وہ اپنے اصولوں سے سرِ مو انحراف نہیں کرتے تھے۔ وہ مدتوں ایسے سرکاری عہدوں پر فائز رہے جہاں ''دستِ غیب'' کی خوب رسائی تھی مگر خارؔ صاحب نے غیبی پیشکش پر ہمیشہ لعنت بھیجی۔ ان کی اہلیہ سرکاری اسکول میں ہیڈ مسٹریس تھیں دونوں نے اپنی تنخواہ میں اس طرح گزارا کیا کہ بیٹی کو ڈاکٹر بنایا اور اس کی شادی پر اتنا خرچ کیا کہ پیر چادر سے باہر نہ نکلے...

۱۹۸۶ء میں دوسرے مجموعۂ کلام پر اردو اکادمی کا مالی تعاون ملا۔ اس وقت ایک ہزار

Marfat.com

کتابیں چھاپنے کی شرط تھی ۔ خاؔر صاحب سے کسی نے کہا شعری مجموعے فروخت نہیں ہوتے آپ اتنی تعداد میں شائع کریں گے تو نقصان ہی ہوگا۔ ایسا کیجیے چند سو چھاپ لیجیے۔ اکادمی والے پریس میں گنتی کرنے کہاں آئیں گے۔ خاؔر صاحب کی تیوری پر بل آ گئے۔ بدلے ہوئے لہجے میں کہا ہزار سے ایک کم بھی کتاب شائع نہیں ہوگی۔ مجھے کچھ بچے نہ بچے میں کتابیں مفت تقسیم کردوں گا۔ اس بار بھی مجموعہ کلام شائع کرانے کی ذمہ داری میری تھی۔ پریس میں ہزار کتابوں سے زائد کا کاغذ دیا، جب کتابوں کی جلد بندی ہوگئی تو معلوم ہوا ہزار سے دس کتابیں زیادہ ہیں۔ خاؔر صاحب بہت خوش ہوئے میاں اللہ نے لاج رکھی اگر ایک کتاب بھی کم ہوتی تو میں کہیں کا نہ رہتا۔ بیٹے زندگی بھر کی کھری کمائی بس عزت ہی ہے۔ اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست۔

اردو کے معروف جدید شاعر بانیؔ نے اپنے ایک مضمون میں خاؔر دہلوی کو تہذیب عشق کا شاعر قرار دیا ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ انھوں نے مسائلِ حیات سے چشم پوشی کی ہے۔ دم بہ دم بدلتا ہوا ماحول، اس ماحول میں ابھرنے والی بجھے رنگوں کی تصویریں، اور ان رنگوں کو بجھانے والی ہواؤں کی جانب اپنے بیدار فکر ہونے کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔ اور اپنے عہد کی بدلتی ہوئی اقدار کا غزل کی زبان میں بے ساختہ اور برجستہ اظہار کیا ہے:

قیامت خیز تو پہلے بھی تھی لیکن ذرا کم تھی
نگاہِ یار یہ کہیے کہ ہم سے آشنا کم تھی

ہماری خاطرِ نازک پہ یکساں بار ہیں دونوں
کلی کی خامشی اچھی نہ پھولوں کی ہنسی اچھی

جس محفل کی ہم زینت تھے جس محفل کی ہم رونق تھے
واللہ اب اس محفل کا ہمیں دستور بتایا جاتا ہے

کچھ اس طرح سے آج ملا وہ زمانہ ساز
ہم کو گماں ہوا کہ محبت ہمیں سے ہے

Marfat.com

خارؔ دہلوی قادرالکلام شاعر تھے اس کے ساتھ ہی اچھی نثر بھی لکھتے تھے۔ دلّی کی ٹکسالی بامحاورہ زبان، ایک ایک لفظ پر نظر رہتی۔ دلّی والے سمینار کے لیے انھوں نے خاکے بھی لکھے۔ میں نے خارؔ صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ ۱۹۴۷ء سے پہلے دہلی کی علمی، ادبی مجلسوں کے تعلق سے اپنی یادداشتیں لکھیں۔ درخواست قبول ہوئی اور وہ اپنی یادداشتیں لکھنے بھی لگے مگر بصیرت جس قدر بیدار ہورہی تھی، بصارت اتنی ہی سورہی تھی۔ انھوں نے لکھنا ترک کردیا اور کہا بمبئی سے آجاؤں پھر لکھوں گا مگر وہ دن کبھی نہیں آیا۔

آج جب دلّی والے سمینار میں یہ مضمون پڑھ رہا ہوں مجھے ۱۹۸۵ء کا یہ واقعہ یاد آرہا ہے۔ پہلے دلّی والے سمینار میں، میں نے ایک صاحب سے تعارف کرایا۔ خار صاحب یہ بھی دلّی والے ہیں۔ اچھا بھئی ہم تو آج پہلی بار مل رہے ہیں۔ ہمدرد والے حکیم عبدالحمید صاحب کی صدارت تھی وہ وقت سے پہلے آئے اور اسی ہال کی پہلی صف کی ایک کرسی پر خارؔ صاحب کے برابر نشست اختیار کی۔ ابھی چند لمحے گزرے تھے کہ وہ صاحب جن کا تعارف کرایا تھا حکیم صاحب کے قدموں میں آکر فرش پر بیٹھ گئے۔ اور ان کے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہنے لگے۔ اجلاس کے بعد خارؔ صاحب نے مجھے اشارہ کیا ادھر آؤ۔ تم نے کہا تھا کہ یہ شخص دلّی والا ہے۔ مجھے تو کہیں سے دلّی والا نظر نہیں آتا۔ خوشامدی، چاپلوس۔ بیٹے تم نے دیکھا حکیم عبدالحمید کو خمیرہ گاؤ زبان عنبری جواہر والا نسخہ خاص چٹائے جارہا ہے، چٹائے جارہا ہے۔ بھئی طبیعت کی فرحت مقصود تھی تو دوالمسک معتدل سے بھی کام چل جاتا۔

خارؔ صاحب شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ کسرِ نفسی اور انکساری کا مظاہرہ ہوگا۔

اخاہ، اب آپ ہمیں کسرِ نفسی سمجھائیں گے۔ بیٹے یاد رکھو دلّی والا امیر ہو یا غریب چاپلوس اور حریص نہیں ہوتا۔ اس میں ایک ترک ہوتی ہے لاکھ کا گھر خاک ہوجائے مگر بات رہ جائے۔ ترک سمجھے۔

جی ہاں۔ ٹیڑھ، بل، اینٹھ۔

یہی ٹیڑھ اور اینٹھ بتاتی ہے کہ کون اصلی دلّی والا ہے اور کون بناسپتی۔ میاں پشتیں گزریں جب یہ خوبو آتی ہے۔

Marfat.com

بعد میں تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ موصوف کی دلّی میں دوسری پشت ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ صدیاں گزرتی ہیں تب زمانے کے گرم و سرد سہ کر کسی شہر اور شہر والوں کا مزاج بنتا ہے۔ دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد ایسے تہذیبی شہر ہیں جن کے باشندوں کی اپنی علاحدہ شناخت ہے۔ آج دہلی تہذیبی شہر نہیں رہا ایک تجارتی شہر ہے۔ اس لیے تہذیبی اقدار، روایتیں دم توڑ رہی ہیں۔ غالب نے بہت پہلے کہا تھا ہائے دلّی۔ وائے دلّی۔ بھاڑ میں جائے دلّی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے دلّی کو بھاڑ میں پہنچا دیا کچھ جلنے سے رہ گیا تھا تو ملک کی تقسیم نے اسے بھی بھسم کر دیا، اب جو کچھ رہ گیا ہے سو کسی مجذوب کی بڑ۔ دلّی کہاں، دلّی کے دل والے کہاں۔ دلّی والوں کی خوش اقبالی کے ساتھ ساتھ دلّی کی آن بان شان بھی رخصت ہوئی۔

خاؔر صاحب کا ایک شعر ہے:

آپ کا عکسِ رخ چرا کر بھی
آئینہ آپ سا نہیں ہوتا

اس مختصر سے مضمون میں میں نے خاؔر صاحب کا عکس رخ چرایا۔ مگر عکس عکس ہی رہا۔ ان جیسا نہیں ہو سکا۔ آج جب سر اور داڑھی میں چاندی اگ آئی ہے اور دلّی کی سڑکوں پر چلتے چلتے پیچھے سے رکشہ والے کی آواز آتی ہے بابا ذرا ہٹ کے... تو خاؔر دہلوی اور ان جیسے ان گنت بزرگ یاد آتے ہیں۔ منظر دھندلا ہو جاتا ہے۔

راستو! کیا ہوئے وہ لوگ جو آتے جاتے
میرے آداب یہ کہتے تھے کہ جیتے رہیے

□□

Marfat.com

جسٹس ویاس دیو مصرا

جسٹس ویاس دیو مصرا ان بلند و بالا شخصیتوں میں سے تھے جن سے شرفِ ملاقات بجائے خود اقدارِ حیات سے آگہی کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ یقیناً یہ بات میرے لیے سرمایۂ افتخار و انبساط ہے کہ ان سے متعدد بار ملنے کے خوشگوار مواقع میسر ہوئے اور یہ احساس ہوا کہ ایسے ہی لوگ انسان کو اشرف المخلوقات کہلانے کا حقدار بناتے ہیں۔

وہ ایک اچھے اور دیندار انسان تھے۔ دیندار بایں معنی کہ خدا پرست بھی تھے اور خدا ترس بھی۔ اور جس شخص میں بھی یہ صفات ہوں گی، وہ جہادِ زندگانی میں بغیر کسی لاگ اور لگاؤ کے تمام مخلوق خدا سے محبت بھی کرے گا اور سب کے ساتھ یکساں منصفانہ سلوک بھی، نظریاتی اعتبار سے بھی اور عملی طور پر بھی۔ جن لوگوں نے مصرا صاحب کو قریب سے دیکھا ہے، وہ اس کی گواہی دیں گے کہ وہ اپنے نظریات پر یقین محکم رکھتے تھے اور ان پر عمل پیہم کی سعیٔ بلیغ فرماتے تھے، جس کے نتیجہ میں ان کے افکار و اعمال میں محبت فاتحِ عالم کی خوبو رچ بس گئی تھی۔

جسٹس مصرا اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے۔ پروردگارِ عالم نے پنڈت اجودھیا ناتھ مصرا کو چھ بیٹوں اور دو بیٹیوں سے نوازا تھا۔ سب سے بڑے بیٹے ویاس دیو کی پیدائش موجودہ پاکستان کے ضلع سیالکوٹ، تحصیل ظفروال کے مراڑہ گاؤں میں ۲۱ رستمبر ۱۹۲۱ء کو ہوئی تھی۔ اجودھیا ناتھ جی CPWD میں انجینئر تھے اور تقسیم ہند کے سوچے سمجھے حادثے سے کافی پہلے دہلی میں آباد ہو گئے تھے۔

ویاس دیو مصرا جی کی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے ایک مدرسہ میں ہوئی۔ بعد میں

Marfat.com

سیکنڈری تعلیم ایم جی اسکول دہلی سے اور گریجویشن ہندو کالج سے کیا۔ دہلی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کرنے کے علاوہ ایم۔اے (انگلش) اور ایم۔اے (اکنامکس) کی ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ ایل ایل بی میں امتیازی کامیابی یعنی فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن کے باعث وہ گولڈ میڈلسٹ قرار پائے۔ بارایٹ لا کی ڈگری انھوں نے لندن سے حاصل کی۔ جہاں قیام کے دوران ۱۹۴۷ء میں فرانس میں منعقدہ عالمی اسکاؤٹس جمبوری میں شرکت فرمائی جہاں ان کی اعلیٰ کارکردگی کے اعتراف میں میڈل آف میرٹ سے نوازا گیا۔

۱۹۴۷ء میں وطن لوٹنے پر انھوں نے وکالت شروع کی اور عدالت کے دونوں ہی ایوانوں سول اور کریمنل میں مقدمات کی پیروی کرنے لگے۔ اسی کے ساتھ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ قانون میں جز وقتی لیکچرر کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ کافی عرصے پبلک پروزیکیٹور اور ایڈیشنل اسٹینڈنگ کونسل رہنے کے بعد ۱۹۶۹ء میں دہلی ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ دس برس بعد ۱۹۷۹ء میں ہماچل پردیش ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بنائے گئے، جہاں سے ۱۹۸۳ء میں سرخ روئی کے ساتھ سبکدوش ہوئے۔

بحیثیت وکیل انھوں نے اپنے پیشے کو اعتبار اور وقار بخشا۔ ذہانت کے ساتھ بے خوفی اور غیر جانبداری کی آمیزش ان کا طرۂ امتیاز بن گئی۔ وہ ہمیشہ عدالتی نظام کے مساویانہ اور بغیر تاخیر نفاذ کے حامی رہے۔ چیف جسٹس ہونے کے ناطے شملہ میں ان خصوصیات کے عملی مظاہرے زیادہ موثر اور نمایاں طور پر ہوئے۔ ان کے یہاں بغیر کسی تفریق کے ہر ایک کی شنوائی ہوتی اور ضرورت مندوں کو مفید مشورے دیے جاتے۔ ان کے دل کے پاس ہمیشہ پاسبانِ عقل موجود رہتا اور ان کی عقل کبھی دل کی دردمندانہ دھڑکنوں سے بے نیاز نہ رہتی جس کی وجہ سے معاملات کو صحیح تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے میں دشواری نہ ہوتی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ان کے فیصلے ذہن و دل دونوں ہی کو یکساں طور پر متاثر کرتے۔ اس اعتبار سے وہ ایک سچے محب وطن ہندوستانی تھے جنھوں نے ہمیشہ ان اقدار عالیہ کے تحفظ کی بھرپور کوشش کی جو ایک آزاد قوم کی تعمیر و تشکیل میں ضروری ہوتی ہیں۔

جسٹس مصرا اپنے افکار و اعمال میں بنیادی طور پر گہرے مذہبی اور مکمل طور پر سیکولر واقع ہوئے تھے جس کی وجہ سے آزاد ہندوستان کے جمہوری افق پر اگر انھیں ایک درخشندہ

Marfat.com

ستارہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا جس کی ضیا پاشیوں سے اب نفرت وتعصب کی موجودہ تاریکیوں میں فیض یاب ہونے کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔اس کی بڑی ٹھوس مثال جسٹس مصرا کی اپنی زندگی ہے۔ایک اعلیٰ ذات کے برہمن ہوتے ہوئے انھوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک بلکہ تمام عمر زندگی کے مختلف شعبوں میں ایک اعلیٰ ذات کے سید، حسین علی جعفری کے ساتھ جس خوشگوار طور پر نباہ کی، اس کی مثال ملنا اگر دشوار نہیں تو کچھ آسان بھی نہیں۔ وہ دونوں صرف ہم جماعت ہی نہیں تھے بلکہ ہم خیال، ہم مقصد اور سفرِ زندگی میں ہم رکاب بھی ۔قومی یکجہتی، مذہبی رواداری، آپسی بھائی چارے، باہمی رفاقت اور لا اکراہ فی الدین کی اس سے بہتر اور جیتی جاگتی مثال ملنا بہت مشکل ہے۔ سچ بتایئے کیا ہندوستان کو مصرا و جعفری جیسی یگانگت کی جاندار شخصیتوں کی اور ضرورت نہیں؟ کیا ہمارا ہر شہر اگر انسانی رفاقتوں کے ایسے دو چار مضبوط و مستحکم پیکر تراش لے تو ہندوستان والوں کی تقدیر نہ بدل جائے اور عالمی داستانوں میں ہماری امن و آشتی کی داستان کی شہرت وعظمت انمٹ نہ ہو جائے۔ کاش ایسا ہو سکے! یہ ناممکن نہیں، مصرا و جعفری صاحبان اس کے امکانات خاصے روشن کر چکے ہیں۔ وہ دونوں الگ الگ تاریخوں، علیحدہ گھروں اور مختلف عقیدہ رکھنے والے گھرانوں میں پیدا ہوئے تھے لیکن ایسے ہم خیال اور ہم مزاج جیسے جدا نہ کیے جاسکنے والے دو جڑواں بھائی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے مذہب و عقیدے سے خوشہ چینی کی جس کے نتیجہ میں جسٹس ویاس دیو مصرا ''حسینی برہمن'' کہے جانے لگے۔ اسلامیات سے ان کی دلچسپی اور شیفتگی اتنی گہری ہوگئی کہ وہ مختلف پروگراموں میں اظہارِ خیال کے لیے مدعو کیے جانے لگے۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے صرف متعدد شہروں کے نہیں بلکہ پاکستان اور انگلستان تک کے سفر بھی اختیار کیے۔ اسے عقیدت اسلامی کہیے یا شرافت انسانی کہ ۱۹۴۷ء کے سانحہ کے بعد جب پنچکوئیاں روڈ، نئی دہلی پر واقع امامیہ ہال اور کشمیری گیٹ دہلی میں واقع درگاہ پنجہ شریف پر شرناتھیوں نے قبضہ کر لیا تو مصرا جی نے بغیر کسی معاوضہ کے چودہ سال تک مقدمات کی پیروی کی اور ان تاریخی وقف جائیدادوں کو مخالفانہ قبضہ سے آزاد کرا لیا۔ اسی طرح کربلا، علی گنج نئی دہلی پر ایک شخص کے غاصبانہ قبضہ کو ہٹانے میں عملی طور پر پیش پیش رہے۔ اس پر آشوب دور میں جب نفرت و

Marfat.com

تعصب کا بازار اپنی پوری فتنہ سامانیوں کے ساتھ سرگرم ہو، اس طرح کے اخلاقی جرأت کے مظاہرے غیر معمولی شرافتِ انسانی کا بین ثبوت ہیں، اور ''مرداں چنیں کنند'' سے بالاتر درجہ کے کارنامے۔

ایسا ہی ایک یادگار کارنامہ ہماچل پردیش کے چیف جسٹس کے طور پر بھی انجام دیا گیا، جب وہاں کے وزیر اعلیٰ کے صاحبزادے غیر قانونی طور سے جنگلات کی لکڑی کا کاروبار کر رہے تھے۔ اگرچہ اس مزاحمت کے لیے انھیں سپریم کورٹ کی ججی سے ہاتھ دھونا پڑا لیکن انھیں اس ذاتی نقصان پر تاسف کے بجائے اطمینان تھا کہ عہد حاضر کی مفاہمت بازی کا شکار نہیں ہوئے اور ذاتی مفاد کی خاطر مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے چشم پوشی اختیار نہیں کی۔ یقیناً ایسے اصول پرست لوگ ہر دور میں کم اور بہت کم ہوتے ہیں لیکن ان کا وجود انسانیت کو حوصلہ مندی اور اقدارِ حیات کو سربلندی عطا کرتا ہے اور انسانی تاریخ ہمیشہ ان کی ممنونِ کرم رہتی ہے۔ یہ ۸۱-۱۹۸۰ء کی بات ہے۔ اس کارنامے پر India Today میگزین نے انھیں Crusadon on the Beneh کے عنوان سے شائع کیا۔ ایک مضمون کے ذریعہ خراجِ تحسین پیش کیا تھا اور بلاشبہ وہ اس کے حقدار تھے۔

تقریباً ۷۰ سال کی کامیاب زندگی گزارنے کے بعد ۱۸ رستمبر ۱۹۹۰ء کو وہ اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ ان کے پس ماندگان میں ان کے پانچ بھائی، جناب مدن موہن لال مصرا، جناب بلبیر مصرا، جناب اوپی مصرا، جناب وشوامتر مصرا، جناب شیوکمار مصرا اور ایک بہن ڈاکٹر سفیہ لتا بفضلہٖ تعالیٰ زندہ ہیں اور اپنے مرحوم بڑے بھائی کے رجحانات و میلانات کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ایک بہن سورن لتا مصرا انتقال کر چکی ہیں۔ جج صاحب کی شریکِ حیات محترمہ تلسی مصرا، دو بیٹے اندر کمار مصرا، سدرشن کمار مصرا اور ایک بیٹی نرگس مصرا بھی موجود ہیں۔

مصرا صاحب کو ابتدائے عمر ہی سے اسکاؤٹس سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ اسے خدمتِ خلق کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ جب نواب چھتاری چیف اسکاؤٹس تھے تو مصرا صاحب چیف کمشنر اسکاؤٹس۔ اس رضا کارانہ تنظیم سے ان کے گہرے شغف کا ثبوت اوکھلائی دہلی میں واقع ''چھتاری ہٹ'' کی شاندار عمارت ہے جس میں اس کا قومی دفتر بھی قائم ہے۔

Marfat.com

نواب چھتاری کے علاوہ ان کے خاص دوستوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین، کرنل بشیر حسین زیدی، حکیم عبدالحمید، گوپی ناتھ امن، اثر لکھنوی، جوش ملیح آبادی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ڈاکٹر ظہور قاسم صاحبان شامل تھے۔ وہ مولانا علی نقی نقوی کے مداح اور معترف تھے۔ دورانِ ملاقات اکثر ان کا تذکرہ کرتے۔ جعفر علی خاں اثر لکھنوی مرحوم دہلی آتے تو ان ہی کے یہاں ٹھہرتے، کافی دن قیام رہتا اور شعر و سخن کی محفلیں سجتیں مگر اس اہتمام کے ساتھ کہ ان کے گھر پر شراب نوشی کی اجازت کسی کو نہ ہوتی۔ وہ خود اس شغل کے عادی نہ تھے۔ سادگی ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ لباس بھی سادہ پہنتے اور کھانا بھی سادہ پسند کرتے۔ تصنع اور ظاہر داری انھیں قطعاً پسند نہ تھی، جو بات ناپسند ہوتی، اس کا برملا اظہار کر دیتے۔ ان کے گورے رنگ اور لمبے قد پر سیاہ کوٹ اچھا لگتا۔ بات بڑے واضح انداز اور صاف ستھرے لب و لہجہ میں کرتے، جس سے تاثیر اور دل نشینی میں اضافہ ہو جاتا۔ ان کی پر کشش شخصیت میں گیتا اور قرآن کی تعلیمات کی آمیزش نظر آتی جس کو انھوں نے بڑے سلیقہ سے شیر و شکر کی صورت میں جذب کر لیا تھا اور جس کا اظہار ان کی تقریروں سے بھی ہوتا تھا اور ان کی جسمانی گفتار (Body Language) سے بھی۔ انھیں اپنی سماجی خدمات کے صلہ میں متعدد انعامات و اعزازات دیے گئے۔ حکومتِ ہند نے پدم شری کے خطاب سے بھی نوازا مگر میں سمجھتا ہوں کہ اگر انسانیت دوستی کے لیے کوئی انعام مقرر ہوتا تو وہ اس کے سب سے بڑے حقدار ہوتے اور جیسا کہ شروع میں کہا گیا تھا کہ ایسی ہی دلنواز اور انسانیت آموز شخصیتوں کو دیکھنے سے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے پر یقین و اعتبار آتا ہے۔

□□

Marfat.com

مخمور سعیدی

امیر قزلباش: کچھ یادیں کچھ باتیں

(ولادت: ۱۹۴۳ء — وفات: ۲۰۰۳ء)

۲۵ مئی ۲۰۰۳ء کی رات کو امیر قزلباش نے اس دنیا کو خیرباد کہہ دیا جہاں انسان کی بے مائیگی اور زندگی کی بے اساسی کے شدید احساس نے انھیں عمر بھر بے چین و مضطرب رکھا۔ امیر پرانی دلّی کے قدیم محلے سوئی والان میں پیدا ہوئے اور ان کا بچپن جن گلیوں میں گزرا وہاں وہ تہذیبی ماحول ابھی زندہ تھا جسے جلد ہی فنا ہو جانا تھا۔ ایک زندہ تہذیب کے زوال اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خلا کو امیر نے اپنے بچپن میں شعوری طور پر شاید محسوس نہ کیا ہو لیکن غیر شعوری طور پر ہی سہی، یہ ان کی شخصیت میں شامل ہو گیا تھا اور اس نے امیر کی زندگی اور ان کی شاعری پر گہرے اثرات مرتسم کیے:

کوئی میرے بارے میں کب یہ سوچتا ہوگا
میں بھی ان اندھیروں میں کھو گیا تو کیا ہوگا

آزادی کے بعد دلّی کے شعری افق پر ابھرنے والا پہلا روشن ستارہ امیر قزلباش تھا۔ یوں تو امیر کی شعر گوئی کا آغاز ۱۹۶۰ء سے کچھ پہلے ہو گیا تھا لیکن جیسا کہ اکثر ہوا کرتا ہے، ابتدا میں امیر کی شاعری انفرادی آہنگ سے خالی تھی، تاہم ان کے اشعار سے یہ اندازہ اس وقت بھی ہو جاتا تھا کہ آگے چل کر اپنی راہ وہ خود نکالیں گے۔ ایک باغیانہ مزاج کی کارفرمائی ان کے ہاں شروع سے نظر آتی تھی:

انداز میکدے کے کروٹ بدل رہے ہیں
ساقی بہک رہا ہے، میکش سنبھل رہے ہیں

اس مطلع کے سارے الفاظ روایتی ہیں لیکن امیر نے دوسرے مصرع میں یہ کہہ کر کہ ''ساقی بہک رہا ہے، میکش سنبھل رہے ہیں'' روایت کی پیروی کی بجائے اس کی توسیع کی کوشش کا ثبوت بہم پہنچا دیا ہے۔

امیر قزلباش میرے تقریباً چالیس سال پرانے دوست تھے۔ میں ان کی زندگی اور شاعری کے اکثر مراحل کا ناظر رہا ہوں۔ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے مگر عمر کا یہ فرق ہماری دوستی میں مانع نہیں ہوا۔ ان سے میری پہلی ملاقات دلّی کے دیال سنگھ کالج کے ایک مشاعرے میں ہوئی تھی۔ وہیں میں نے انھیں پہلی بار سنا بھی۔ مشاعرہ ہندوستان کے سرحدی علاقے پر چین کے جارحانہ حملے کے خلاف منعقد کیا گیا تھا۔ امیر نے جو اشعار سنائے وہ جوش سے بھرے ہوئے تھے اور ان کا پڑھنے کا انداز بھی جوشیلا تھا۔ لیکن ہماری دوستی کا آغاز پہلی ملاقات میں نہیں ہوا، دوستی تب شروع ہوئی جب انھوں نے اردو بازار کی شام کی محفلوں میں آنا شروع کیا۔ اردو بازار اور اس کے گرد و نواح میں دو چار چائے خانے تھے جہاں ان دنوں یہ محفلیں جمتی تھیں اور ان میں بزرگ ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ساتھ تازہ واردانِ بساطِ دل بھی سرگرم حصہ لیتے تھے۔ ان محفلوں میں ادبی فیضان کا سرچشمہ بسمل سعیدی مرحوم تھے جن سے امیر بھی فیض یاب ہوئے۔

ابتدا میں امیر کو واقف مرادآبادی کی سرپرستی حاصل رہی جو ایک کاملِ فن استاد تھے اور امیر کا اپنی اولاد کی طرح خیال رکھتے تھے۔ امیر کے کئی بھائی بہن تھے جن میں اپنے والدین سے غالباً وہ سب کچھ ملا جو گھر کے بچوں کا حق ہوا کرتا ہے لیکن امیر کے گھر والوں کا خدا جانے وہ کیا رویہ تھا جس نے امیر کو زندگی بھر بے گھری کے احساس میں مبتلا رکھا۔ ایک مرحلے پر امیر نے اپنا گھر خود بسانے کی کوشش کی۔ ساحرہ بیگم سے امیر کا معاشقہ اور پھر شادی جو بڑی بے سروسامانی میں ہوئی لیکن جس نے امیر پر ایک نشہ طاری کر دیا تھا، اس کی اسی کوشش کا ثمرہ تھی۔ امیر اس شادی سے بہت خوش تھے اور جب ان کے ہاں ایک چاندسی بیٹی نے جنم لیا تو یہ خوشی دوچند ہوگئی۔ اس زمانے میں امیر کا دوستوں سے ملنا جلنا بھی کم ہو گیا تھا۔ ساحرہ بھی شعر کہتی تھیں اور امیر سے ان کے اولین تعارف کا وسیلہ دونوں کا یہی مشترک ذوق بنا تھا۔ اب وہ دونوں ساتھ ساتھ مشاعروں میں جانے لگے۔ اس زمانے میں

Marfat.com

ان دونوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ بنے ہی ایک دوسرے کے لیے ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ امیر اور ساحرہ کی یہ رفاقت چند برس بعد مفارقت میں بدل گئی۔ شاید اس کے کچھ اور اسباب بھی رہے ہوں لیکن دو سبب بدیہی تھے۔ اولاً امیر کا متاہلانہ زندگی کی ذمہ داریاں نباہنے سے گریز، دوسرے ان کی شراب نوشی جو اکثر اعتدال کی حدوں کو پار کر جاتی تھی۔ امیر کی اس کثرتِ شراب نوشی کا سبب کیا تھا، کہنا مشکل ہے۔ ہوسکتا ہے، بچپن میں والدین کی شفقت سے محرومی نے ان کے اندر کوئی ایسی نفسیاتی گرہ ڈال دی ہو جسے ساحرہ کی محبت اور رفاقت بھی نہ سلجھا سکی ہو اور اس کی چبھن کو فراموش کر دینے کے لیے وہ شراب کا سہارا لیتے ہوں۔ امیر کا ایک شعر یاد آتا ہے جو اکثر وہ سنایا کرتے تھے:

گھر میں میرے اک پیڑ ہے
جس کا کوئی سایہ نہیں

یہاں 'پیڑ' کا لفظ ظاہر ہے استعارہ ہے کسی بے فیض وجود کا۔

ساحرہ بیگم سے دوری کے بعد امیر کچھ مدت تک ادھر اُدھر بھٹکتے رہے لیکن پھر ایک جگہ ٹھہر گئے۔ یہ ایک ہندو خاتون تھیں اور ساحرہ کی طرح اور ان دوسری عورتوں کی طرح جو ساحرہ سے علاحدگی اور مذکورہ خاتون سے مستقل وابستگی کی مختصر سی درمیانی مدت میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے لیے امیر سے قریب آئیں، امیر سے عمر میں بڑی تھیں۔ امیر کو اس خاتون کے آغوشِ محبت میں پناہ مل گئی لیکن شراب سے ان کا والہانہ تعلقِ خاطر برقرار رہا۔ وہ خاتون اس پر معترض بھی نہ تھیں اس لیے ان کے درمیان اس بنا پر کوئی تلخی کبھی پیدا نہ ہوئی۔ اس کی وجہ غالباً یہ رہی ہو کہ امیر کے ساتھ وابستگی سے پہلے وہ خود بھی شراب سے زیادہ محترز نہ تھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ امیر کو ان کی شراب نوشی گوارا نہ ہوئی اور انھوں نے امیر کی خاطر بہ خوشی اپنا یہ کبھی کبھار کا شغل ترک کر دیا۔ امیر سے ان کے تعلق خاطر کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ امیر ایک بار انھیں چھوڑ کر دوبارہ ساحرہ کے پاس چلے گئے تھے لیکن اس بار بھی ان کی ساحرہ سے نہ نبھی اور انھوں نے ایک بار اور ان خاتون سے رابطہ قائم کیا تو انھوں نے اپنی طرف ان کی واپسی کا خیر مقدم کیا اور وہ پھر ان کے ساتھ رہنے لگے۔ امیر سے ان کی دوری کا عمل اس وقت شروع ہوا جب وہ خاتون اپنی نو بیاہتا

Marfat.com

بیٹی کے ساتھ امریکہ گئیں۔ امریکہ میں انھوں نے اپنی بیٹی داماد کے پاس ایک سال گزارا۔ واپسی پر ان کے انداز بدلے ہوئے تھے اور امیر کے لیے ان کے رویے میں جو شیفتگی تھی، اس میں کمی آ گئی تھی۔ اب ان کا موضوعِ گفتگو ایک ہی تھا: ان کا نومولود نواسہ جوان کے حواس پر چھا گیا تھا۔ ایک سال دلّی میں گزار کر وہ پھر بیٹی داماد کے بلاوے پر امریکہ گئیں اور پھر پورا ایک سال انھوں نے وہیں گزارا۔ ان کا یہ دوبارہ امریکہ جانا امیر کو کھل گیا اور اداسی ان پر غالب آ گئی۔ ان کے مزاج میں شوخی اور شرارت کا جو عنصر تھا وہ جیسے ہمیشہ کے لیے زائل ہو گیا۔ اس دفعہ خاتونِ مذکورہ امریکہ سے واپس آئیں تو وہ بھی بالکل بدل چکی تھیں۔ اس کا ایک سبب شاید ان تک پہنچنے والی یہ خبریں بھی تھیں کہ ان کی غیر موجودگی میں ایک غزل گایکہ، جس کے ساتھ ملنے جلنے سے امیر کو انھوں نے روکا تھا، امیر کے پاس برادرز اپارٹمنٹ کے اس فلیٹ میں آتی جاتی رہی ہے، جہاں آنے جانے والوں کے نام اپارٹمنٹ کا گیٹ کیپر اپنے رجسٹر میں باقاعدگی سے لکھا کرتا تھا۔ یہ فلیٹ مذکورہ خاتون کے نام پر تھا جس کے ساتھ امیر رہا کرتے تھے۔

لقوے کا حملہ ہونے سے پہلے تک امیر خوبرو آدمی تھے۔ یہ حملہ ان پر سری نگر کے ایک ہوٹل میں ہوا تھا۔ کلچرل اکادمی کے ایک مشاعرے میں دلّی سے ان کے علاوہ کچھ اور شاعر بھی مدعو تھے جن میں میں بھی تھا۔ ہوٹل میں میرا اور امیر کا کمرہ ایک ہی تھا لیکن مشاعرے سے واپسی پر وہ اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں خفیہ طور پر شراب پی جا رہی تھی۔ خفیہ طور پر اس لیے کہ ان دنوں اس ہوٹل ہی میں کیا پورے سری نگر میں علانیہ طور پر نہ شراب فراہم ہو سکتی تھی نہ پی جا سکتی تھی۔ امیر نے حسبِ عادت زیادہ پی لی اور کمرے کی کھڑکی کھول کر ڈل جھیل کا نظارہ کرنے لگے جس کے کنارے ہمارا ہوٹل واقع تھا۔ سردی کا موسم تھا، برفیلی ہوائیں چل رہی تھیں، امیر کسی سرد جھونکے کی لپیٹ میں آ گئے اور ان کے چہرے کو لقوہ مار گیا۔ امیر کے قدرشناسوں میں کئی اچھے ڈاکٹر بھی تھے، ان کی دلّی واپسی کے بعد بڑی توجہ کے ساتھ ان کا علاج ہوا، مرض کے اثرات بڑی حد تک زائل ہو گئے مگر ان کی وہ خوب روئی کم ہو گئی تھی جو ان کی پہچان تھی۔

امیر کتنے خوبرو تھے اور صنفِ مخالف کے لیے ان میں کتنی کشش تھی، اس کا کچھ

Marfat.com

اندازہ اس وقت ہوا جب کسی رسالے میں ان کی تصویر دیکھ کر بھوپال کے ایک باعزت گھرانے کی لڑکی جو خود بھی کم خوبصورت نہ تھی، ان پر اتنی فریفتہ ہوئی کہ اپنی فریفتگی کا ذکر اپنے گھر والوں سے بھی کر دیا اور انھیں مجبور کیا کہ وہ امیر کے ساتھ اس کے رشتے کی بات کریں۔ چنانچہ لڑکی کے فوٹو کے ساتھ اس کے بڑے بھائی کا ایک خط اس رسالے کی معرفت جس میں امیر کی تصویر چھپی تھی، امیر کو موصول ہوا جس میں لڑکی کے لیے ان کے رشتے کی خواہش کی گئی تھی۔ لڑکی کا فوٹو دیکھ کر امیر بے چین ہو گئے، مگر اس بے چینی کا مداوا مشکل تھا کیوں کہ وہ اس وقت تک 'شادی شدہ' ہو چکے تھے اور ایک بیٹی کے باپ بھی جس سے وہ بہت پیار کرتے تھے۔ اس واقعے کے بعد سے کبھی کبھی نشے کی حالت میں وہ اپنے جلد شادی کر لینے پر پچھتاوے کا اظہار بھی کرتے۔ عجب نہیں کسی کیفیت میں انھوں نے اس پچھتاوے کا اظہار ساحرہ بیگم کے سامنے بھی کر دیا ہو اور ان دونوں میں جو دوریاں پیدا ہوئیں، اس کا ایک سبب یہ بھی رہا ہو۔

امیر شاید باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا سے پوری طرح بہرہ ور نہیں ہو سکے تھے اور شاید یہی تشنگی انھیں بھٹکاتی رہی۔ انھیں سہارے ملے مگر عارضی، مستقل سہارا ان کے لیے ایک ہی تھا مگر آخر میں یہی انھیں لے ڈوبا۔ شراب کی کثرت ان کی موت کا سبب بنی، جس نے ان کے جگر کو ناکارہ کر دیا تھا، آخر میں گردے بھی خراب ہو گئے تھے۔

امیر جن عورتوں کی طرف مائل ہوئے، وہ سبھی عمر میں ان سے بڑی تھیں، کیا اس کے پیچھے بھی کوئی نفسیاتی پیچیدگی تھی۔

○

امیر کا پہلا مجموعۂ کلام ''بازگشت'' کے نام سے مئی ۱۹۷۴ء میں چھپا تھا اور اس کی اشاعت کے ساتھ ہی امیر نے مشاعروں کے سامعین کے حلقوں سے باہر شاعری کے سنجیدہ قارئین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اگرچہ اس وقت تک وہ خود کو غزل کے روایتی انداز سے پوری طرح الگ نہیں کر سکے تھے۔ ان کی شاعری کے پیچھے جو انفرادی محرکات کارفرما تھے وہ ان شب و روز کے پروردہ تھے جن میں انسانی قدریں پروان چڑھنے سے قاصر رہتی ہیں۔ اخلاص سے محروم ایک ایسا معاشرہ جہاں سماجی تعلقات کی بنیاد ریاکاری پر ہے۔ فرد اور فرد

Marfat.com

کے باہمی تعلقات کی یہ بے اساسی اجتماعی زندگی کے ان خوابوں کو فنا کی گود میں پہنچا دیا کرتی ہے جو گزرتے روز کی رفتار متعین کرتے اور ایک سمت سفر کی نشاندہی کرتے ہیں۔

امیر صرف اپنی ذات کے حوالے سے نہیں، کائنات کے حوالے سے بھی بات کرتے ہیں۔ ان کی شاعری جس جذباتی اضطراب اور ذہنی کرب کی ترجمانی کرتی ہے اس کی ذمہ دار شاعر کی حساس طبیعت سہی لیکن اس کی پرورش اس کے گردوپیش کے ماحول نے کی ہے:

ذہن میں ایک افسانہ ہے
اور عنوان زمانہ ہے

امیر قزلباش کا دوسرا مجموعہ ''انکار'' ۱۹۷۶ء میں چھپا۔ ''بازگشت'' سے ''انکار'' کی اشاعت تک دو ہی سال کا وقفہ درمیان میں تھا جو کچھ زیادہ طویل وقفہ نہیں لیکن ''انکار'' میں ذاتی نا آسودگیوں پر جھنجلاہٹ کے ساتھ ساتھ عصری صورت حال سے شاعر کی بے اطمینانی اپنی انتہا کو پہنچتی نظر آتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ہر مثبت قدر پر شاعر کا ایمان متزلزل ہو گیا ہے:

کوئی چرا کے لے گیا صدیوں کا اعتقاد
منبر کی سیڑھیوں سے اتر جائیے جناب

یہ گردوپیش کو ایک داخلی ناگواری کے ساتھ محسوس کرتا ہوا وہ بے آرام ذہن ہے جو دنیا کی بوالعجبیوں کے ساتھ ساتھ خود اپنے وجود کی مہملیت سے بھی پریشان اور ہر مثبت امکان سے منکر ہے۔

یہ امیر کے ذہنی سفر کا وہ مرحلہ تھا جہاں شاید ان پر منفی رویوں کا اسیر ہو جانے کا الزام بھی لگایا جا سکتا تھا، اگرچہ یہ الزام درست نہ ہوتا۔ ان کی یہ برہمی اور بیزاری ان کے تیسرے مجموعے ''شکایتیں میری'' کی اشاعت تک جو ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا، ان کے ساتھ رہی کہ یہ ان کے شاعرانہ کردار کا جزو لاینفک ہے لیکن دھیرے دھیرے اس کی بے لچک شدت کچھ کم ضرور ہو گئی۔ اس اعتدال کی کونپلیں غالباً اس احساس سے پھوٹیں جو ان کے ہاں شروع ہی سے موجود تھا کہ اس کائنات میں انسان کا وجود اتنا حقیر بھی نہیں جتنا بظاہر نظر آتا ہے۔ بظاہر یہ حقیر اور بے مایہ نظر آنے والا وجود خود شناسی اور خود اعتمادی سے

کام لے تو اپنے سے باہر کی دنیا کی تمام تر سفاکیوں کے باوصف اسے ایک نئی ترتیب و تنظیم دے کر اس کی تشکیل نو پر قادر ہے۔ امیر کے ہاں تصویر کے بدنما پہلوؤں سے نظر نہ بچانے پر شدید اصرار، رنگوں کی بے رنگی کو بے نقاب کر دینے کی دھن، دراصل زندگی اور زندگی کی خوبصورتی سے اس لگاؤ کی علامت ہے جسے قدم قدم پر صدمہ پہنچا ہے اور جسے لمحہ بہ لمحہ جھٹلایا گیا ہے۔

منفی طاقتوں کے مقابلے میں پے درپے ہزیمتوں سے دوچار ہونے والا جو کردار امیر کی شاعری سے ابھرتا ہے وہ زخمی تو ہے مگر سپر اندازی کے لیے تیار نہیں۔ بدی کے نرغے میں گھرے ہونے کے باوجود ایک ایسی مثالی دنیا کے خواب اس کی آنکھوں کی چمک برقرار رکھے ہوئے ہیں جہاں زندگی اپنے مثبت امکانات کو بروئے کار لا سکے گی اور انسانیت اس معرکۂ کرب و بلا سے سرخ رو ہو کر نکلے گی جو صدیوں سے یزیدی فوجوں کے حصار میں ہے۔

''شکایتیں میری'' کے بعد امیر کا ایک اور مجموعہ ''رجز'' کے نام سے شائع ہوا اور پھر ان چاروں مجموعوں کے انتخاب پر مشتمل مجموعہ ''منظر نامہ'' کے نام سے چھپا۔ اس نام سے میرے اور امیر کے مشترکہ دوست مہیش منظر اپنا پہلا مجموعہ چھاپنا چاہتے تھے لیکن امیر کو یہ نام اتنا پسند آیا کہ انھوں نے مہیش منظر سے اسے مانگ لیا۔ بعد میں مہیش منظر کا مجموعہ ''منظر منظر'' کے نام سے چھپا۔

اپنے شخصی وجود کو پورے انسانی وجود کی علامت بنا دینے کا میلان امیر کے ہاں شروع سے کارفرما رہا اور اس نے ان کی شاعری کے کینوس کو بڑا وسیع اور پر معنی کر دیا ہے۔ اس تحریر کے آغاز میں میں نے ان کا ایک شعر درج کیا ہے:

کوئی میرے بارے میں کب یہ سوچتا ہوگا
میں بھی ان اندھیروں میں کھو گیا تو کیا ہوگا

یہاں ضمیر واحد متکلم ''میں'' سے مراد پوری بنی نوع انسان ہی تو ہے۔

امیر کو غزلوں سے زیادہ شغف تھا لیکن انھوں نے نظمیں بھی خاصی تعداد میں کہی ہیں اور غزلوں کی طرح نظموں میں بھی وہ اپنے شخصی خدوخال اور مکمل شاعرانہ قد و قامت کے

ساتھ نظر آتے ہیں۔ آس پاس کے منظر سے وہی بے اطمینانی، سماجی ناانصافیوں پر وہی احتجاج اور انسان کے ہاتھوں انسان کی درگت پر وہی غم وغصہ جوان کی غزلوں کی پہچان ہے، ان کی نظموں کا شناخت نامہ بھی ہے۔

امیر کے جن ذہنی اور جذباتی رویوں کی طرف سطور بالا میں میں نے اشارے کیے ہیں وہ ان کے ہاں حاوی رویوں کی حیثیت تو رکھتے ہیں لیکن امیر ان رویوں کے اسیر نہیں ہیں۔ اور بھی کئی کیفیتیں ہیں جن سے وہ گزرے ہیں اور انھوں نے انھیں اظہار کا پیرایہ بخشا ہے۔ مثلاً گزرتے وقت کی چیرہ دستیاں جو بالآخر ایک جیتے جاگتے وجود کی فضا کی دھند میں گم کردینے پر بضد ہیں، امیر کے لیے بہت تکلیف دہ تھیں۔ ان کا ایک شعر یاد آتا ہے:

مرجاتا ہے روز کوئی
میرا جینا دو بھر ہے

جوشؔ ملیح آبادی کا ایک مصرعہ ہے:

موت شاہِ ارض کی سب سے بڑی توہین ہے

امیر نشے کی حالت میں یہ مصرعہ اکثر بہ آواز بلند پڑھا کرتے تھے اور اس امکان پر اپنے یقین کا اظہار کیا کرتے تھے کہ شاہِ ارض یعنی انسان ایک دن موت پر فتح پالے گا:

جدھر دیکھو صلیبیں ہی صلیبیں
میں یہ منظر بدلنا چاہتا ہوں

امیر اس منظر کو بدل تو نہیں سکے لیکن انھوں نے بدلنے کی خواہش کی یہی کیا کم ہے۔

گھر رکھتے ہوئے بے گھری کا احساس بھی امیر کے ہاں بہت شدید ہے اور ان کے بہت سے اشعار اور کچھ نظمیں اس تلخ احساس کی ترجمان ہیں۔ گھر، کہ دنیا کے بے اماں ہنگامہ زار میں ایک جائے اماں کی طرح ہے، اگر کسی کے لیے گھر بھی اپنی یہ پہچان گم کردے تو وہ کہاں پناہ ڈھونڈے۔ امیر کا ایک مشہور و مقبول شعر اسی درد کا ترجمان ہے:

تم راہ میں چپ چاپ کھڑے ہو تو گئے ہو
کس کس کو بتاؤ گے کہ گھر کیوں نہیں جاتے

Marfat.com

'گھر کیوں نہیں جاتے؟' اس سوال کا جواب شاید خود انھیں بھی معلوم نہ تھا۔

امیر کا ایک اور شعر ہے:

منتظر کوئی تو ملے تجھ کو

گھر کے باہر اداسیاں رکھ جا

امیر اوپر سے خوش باش نظر آتے تھے، چنچل اور کھلنڈرے بھی لیکن اپنے اندر وہ ایسے کئی دکھ، کئی تکلیفیں سنبھالے ہوئے تھے جو ان کی شاعری میں اپنا اظہار چاہتی تھیں۔

امیر کا لہجہ اکہرا نہیں، تہہ دار ہے۔ ان کے اشعار میں معنویت کی بہت سی پرتیں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ پھر ان کے ہاں زندگی کی سفاکیوں سے نبرد آزمائی کے ساتھ ہی ساتھ اس کی فیاضیوں سے بہرہ اندوزی کا رجحان بھی موجود ہے لیکن ان کے تجرباتِ حیات اس میلان کو بے مہار نہیں ہونے دیتے۔ ان کے ہاں جذبہ فکر کی آنچ میں تپ کر شعر کا قالب اختیار کرتا ہے۔

امیر نے دو چار فلموں کے گیت بھی لکھے، ان میں دو فلمیں راج کپور کی تھیں، جن تک امیر کے ایک قدر شناس نے جو دلّی میں ایک بڑے سرکاری عہدے پر تھے، انھیں پہنچایا تھا۔ ہوا یوں کہ راج کپور کی فلم ''پریم روگ'' تکمیل کے آخری مراحل میں تھی۔ اس فلم کے گانے ہندی کے مشہور شاعر سنتوش آنند لکھ رہے تھے۔ ابھی دو گانے لکھے جانے باقی تھے کہ وہ کسی وجہ سے کچھ کبیدہ خاطر ہو کر دلّی واپس آ گئے اور پھر ممبئی نہیں گئے۔ راج کپور پریشان تھے کہ یہ دو گانے کس سے لکھوائیں۔ انھی دنوں ان کا دلّی آنا ہوا اور انھوں نے اپنی اس پریشانی کا اظہار مذکورہ افسر سے کیا جو ان کے دوستوں میں تھا۔ اس نے امیر کا نام پیش کیا اور انھیں راج کپور سے ملوایا بھی۔ راج کپور کو امیر کی شخصیت بھی پسند آئی اور شاعری بھی اور انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ دونوں گانے امیر لکھیں گے۔ کچھ دن بعد امیر ممبئی پہنچ گئے اور انھوں نے یہ دونوں گانے لکھے۔ ان میں سے ایک گانا ''میری قسمت میں تو نہیں شاید، کیوں ترا انتظار کرتا ہوں'' بہت ہی مقبول ہوا، اتنا مقبول کہ لوگ اب اس فلم کو بھول چکے ہیں لیکن یہ گانا اب بھی کبھی کبھی فضاؤں میں نغمگی بکھیرنے لگتا ہے۔

''پریم روگ'' کے لیے گانے لکھنے کے سلسلے میں امیر جن دنوں ممبئی میں مقیم تھے، آئی

Marfat.com

ایم کنو کی فلم ''میں چپ نہیں رہوں گی'' کا اسکرین پلے اور مکالمے لکھنے کے لیے میرا بھی وہاں جانا ہوا۔ گانے اس فلم کے بھی امیر کو لکھنا تھے۔ مجھے فلموں کے لیے لکھنے کا کوئی تجربہ نہیں لیکن کنو بھائی کے اصرار پر جو میرے ہم وطن تھے، میں نے یہ کام کرنا منظور کر لیا تھا۔ یوں بھی میں ان دنوں بے کار تھا۔ امیر کو راج کپور کی طرف سے ایک Five Star ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا جس کا نام اب میرے ذہن سے اتر گیا ہے۔ میں باندرے کے علاقہ میں سیزر ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ میں نے امیر کو فون کیا تو وہ فوراً ہی سیزر ہوٹل چلے آئے اور پھر مجھے اپنے ساتھ اپنے ہوٹل میں لے گئے۔ راج کپور صاحب نے ان کے لیے ایک ٹیکسی بھی ان کے پورے دورانِ قیام کے لیے بک کرا دی تھی۔

ایک شام پھر امیر میرے پاس آئے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ رات کو باندرہ میں ایک مشاعرہ تھا جس میں ہم دونوں بھی مدعو تھے۔ مشاعرے کی صدارت مجروح سلطانپوری کرنے والے تھے۔ ان دنوں میں بھی پیتا تھا، امیر کے ہوٹل پہنچ کر ہم دونوں پینے بیٹھ گئے، نو بج چکے تو میں نے امیر کو یاد دلایا کہ ہمیں مشاعرے میں جانا ہے۔ امیر نے سنی ان سنی کر دی اور شغل جاری رکھا۔ گھنٹے آدھے بعد میرے ذہن سے بھی مشاعرے میں جانے کا خیال محو ہو گیا۔ بارہ ساڑھے بارہ بجے ہوں گے کہ امیر نے اچانک کہا ''چلو مشاعرے میں چلتے ہیں''۔ ہم مشاعرہ گاہ پہنچے تو صاحبِ صدر مجروح سلطانپوری کلام پڑھ چکے تھے اور ناظمِ مشاعرہ مشاعرے کے اختتام کا اعلان کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر سامعین، جو اپنی نشستیں چھوڑ چکے تھے، ٹھہر گئے۔ سامعین نے اور منتظمین نے بھی ہم سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ چوں کہ مشاعرہ اختتام کو پہنچ چکا تھا، مجروح صاحب اس پر کچھ معترض ہوئے۔ ان دنوں یوپی کی ایک شاعرہ سے ان کے معاشقے کی دھوم تھی اور مشاعرے میں بھی وہ ان کے ساتھ تشریف لائی تھیں، جب انھوں نے بھی ہمارا کلام سننے کی خواہش کی تو مجروح صاحب ان کی خواہش کو رد نہ کر سکے اور کچھ دیر اور وہاں رکنے پر آمادہ ہو گئے۔

امیر کو مجروح صاحب کا رویہ ناگوار گزرا تھا، انھوں نے اپنی ناگواری کا برملا اظہار تو نہیں کیا مگر کلام سنانے بیٹھے تو سناتے ہی چلے گئے۔ مجروح صاحب بار بار گھڑی پر نظر ڈالیں مگر وہ شاعرہ بڑے انہماک سے امیر کو سن رہی تھیں اور مجروح صاحب کے لیے شاید

Marfat.com

یہ ممکن نہیں تھا کہ ان سے اٹھ جانے کو کہیں۔ امیر نے لگ بھگ ایک گھنٹے کلام سنایا۔ میں مجروح صاحب کی بے چینی دیکھ رہا تھا۔ میں نے انھیں مزید آزمائش میں نہیں ڈالا اور صرف دو تین غزلیں سنائیں حالاں کہ سامعین موڈ میں تھے اور چاہتے تھے کہ میں بھی دیر تک سناؤں۔

اگلی صبح امیر مجھ سے داد طلب ہوئے کہ بزرگوار کو کیسا پریشان کیا، آخر وہ ہمیں کیوں نہیں سننا چاہتے تھے۔ میں ہنس کر خاموش ہو گیا۔

امیر کو پسند کرنے والوں اور ان کی شاعری کے قدرشناسوں میں عوام اور خواص دونوں شامل تھے۔ ان کی شاعری مشاعروں میں بھی پسند کی جاتی تھی اور کاغذ پر آکر بھی اپنی کشش برقرار رکھتی تھی۔ شعروادب سے دلچسپی رکھنے والی کچھ بڑی سیاسی شخصیتیں بھی امیر کی قدرشناس تھیں جیسے سکندر بخت صاحب اور مرلی منوہر جوشی۔ جوشی صاحب جن دنوں مرکزی کابینہ میں وزیر تھے، امیر کے بلانے پر برادرز اپارٹمنٹ میں ان کے فلیٹ پر آگئے اور اپنی تمام مصروفیتوں کو نظرانداز کر کے تقریباً دو گھنٹے تک امیر کی اور ان کے دوستوں کی شاعری سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ شام کا وقت تھا امیر نے ہنس کر جوشی صاحب سے کہا کہ یہ شاعر لوگ ہیں، بغیر شراب کے ان کے لیے شام گزارنا مشکل ہو جاتا ہے، آپ اجازت دیں تو میں ان کی تشنگی کا مداوا کردوں۔ جوشی صاحب نے بہ خوشی یہ اجازت دے دی۔ سکندر بخت صاحب بھی ان کے اس شغل سے واقف تھے۔

امیر ایک سچے شاعر تھے لیکن سچے شاعر کو بھی اپنی آواز کے تعاقب میں جس ہفت خواں سے گزرنا پڑتا ہے، اسے سر کر لینا آسان نہیں۔ ہمارے عہد کے کئی باصلاحیت شاعر اس سفر پر نکلے اور بے راہ روی کا شکار ہو گئے۔ امیر نے ہر جگہ اپنی بات اپنے انداز میں کہنے کی کوشش کی ہے اور ان کی یہ کوشش ناکام نہیں رہی۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا وہ غزل اور نظم دونوں پر یکساں حاوی تھے مگر غزل سے انھیں زیادہ لگاؤ تھا۔ ان کی غزلوں کی تعداد ان کی نظموں سے کہیں زیادہ ہے۔ ان کے لہجے میں تلخی ہے مگر کھردرا پن نہیں۔ یہ اپنی تہذیبی، لسانی اور شعری روایت اور اس کی امکانی حدود سے ان کی باخبری کی دلیل ہے۔

امیر بڑے مجلسی آدمی تھے۔ خوش لباس، خوش مزاج اور خوش گفتار۔ صادقین مرحوم

Marfat.com

نے انھیں 'خوش رخسار' کا لقب بھی دیا تھا۔ وہ جس محفل میں پہنچتے نگاہوں کا مرکز بن جاتے اور اپنی بزلہ سنجیوں سے اجنبیوں کو بھی اپنا گرویدہ کر لیتے۔ لیکن ان کے آخری دن کنجِ عزلت میں بسر ہوئے۔ برادرز اپارٹمنٹ کو خیر باد کہہ کر وہ اپنے پرانے محلے سوئی والان میں اپنے ایک بھائی کے ہاں آ گئے تھے۔ گھر سے نکلنا، دوستوں سے ملنا، سب موقوف۔ کوئی دوست فون کرتا تو اکثر ریسیور نہ اٹھاتے یا شاید اس حالت ہی میں نہ ہوتے کہ ریسیور اٹھالیں۔ کبھی کبھار ریسیور اٹھا لیتے تو یہ کہہ کر فون بند کر دیتے کہ تھوڑی دیر بعد میں خود فون کرتا ہوں۔ مجھ سے کئی بار انھوں نے یہی کہا لیکن ان کا فون کبھی نہیں آیا۔ ان دنوں ان کی کیا ذہنی کیفیت تھی، اس کا کچھ اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے ایک قدر شناس منیر ہمدم نے، جو خود بھی شاعر ہیں اور سوئی والان سے قریب ہی ترکمان گیٹ کے علاقے میں رہتے ہیں، انھوں نے مجھے بتایا کہ ایک دوبار وہ انھیں اپنے ہاں لے گئے تھے مگر امیر زیادہ دیر رکے نہیں اور جتنی دیر بھی رکے خاموش رہے۔

ایک صبح اچانک اخبار میں امیر کے انتقال کر جانے کی خبر پڑھی، یہ خبر غیر متوقع نہیں تھی۔ امیر نے کھانا ترک کر دیا تھا، صرف شراب پر زندہ تھے اور اس زہر کو آخر اپنا اثر دکھانا ہی تھا۔ پھر بھی ایک دھچکا سا لگا: خاموش ہو گیا تھا چمن بولتا ہوا۔

خبر میں درج تھا کہ جنازہ نو بجے سوئی والان سے اٹھے گا اور دس بجے قبرستان پنج پیران میں تدفین ہوگی۔ اس وقت ساڑھے نو بج چکے تھے۔ میں گھر سے باہر نکلا ہی تھا کہ فاروق ارگلی آ گئے، وہ بھی اس خبر سے سکتے کی سی کیفیت میں تھے۔ ہم دونوں نے پہلے سوئیوالان کا رخ کیا مگر راستے میں ٹریفک کی رکاوٹیں پیش آئیں اور ان سے نکلتے نکلتے دس بج گئے۔ ہم نے طے کیا کہ اب ہمیں قبرستان ہی پہنچنا چاہیے۔ وہاں پہنچے تو چند لوگ ہم سے پہلے پہنچے ہوئے تھے اور قبر تیار ہو چکی تھی۔ ہم لوگ جنازے کی آمد کا انتظار کرنے لگے لیکن جب بارہ بجے تک جنازہ نہیں آیا، نہ امیر کے قریبی متعلقین میں سے کوئی وہاں پہنچا تو میں نے سوئیوالان میں اس نمبر پر فون کیا جس پر کبھی کبھی امیر سے بات ہو جاتی تھی۔ جس نے فون اٹھایا اس نے کچھ گول مول سا جواب دیا اور ریسیور رکھ دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ امیر کے گھر والوں نے ان کی تدفین دلی دروازے کے باہر والے قبرستان میں کر دی ہے۔

Marfat.com

قبرستان پنج پیران میں ان کے سسرالیوں نے قبر تیار کرائی تھی جو امیر کو اپنی آغوش میں جگہ دینے سے محروم رہ گئی۔ مجھے امیر کا آخری دیدار نصیب نہیں ہوا۔ زندگی سے بھرپور ایک وجود کو بے حس و حرکت پڑا دیکھ کر خدا جانے مجھ پر کیا گزرتی۔

امیر کی ایک غزل کا مطلع ہے:

جانے یہ کس کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں
تاج سر پر ہے مگر پانو میں زنجیریں ہیں

امیر کی زندگی اور شاعری پانو کی انہی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش سے عبارت تھی۔ تاج برسر مگر پا بہ زنجیر تصویروں میں ایک تصویر خود ان کی بھی تھی جو ان لوگوں کے ذہنوں میں ہمیشہ محفوظ رہے گی، جنھوں نے امیر کو دیکھا ہے۔ ان کے سر پر شہرت کا تاج جگمگاتا رہا مگر ان کے پاؤں میں بے بسی کی کچھ زنجیریں بھی ہمیشہ پڑی رہیں۔

امیر ایک غزل مشاعروں میں اکثر سنایا کرتے تھے۔ اس غزل کا ایک شعر ہے:

ذرا بدلوں گا اس بے منظری کو
پھر اس کے بعد مر جاؤں گا میں بھی

دنیا کی بے منظری کو وہ بدل سکے ہوں یا نہ بدل سکے ہوں لیکن انھوں نے یہ خواہش تو کی۔ یہ خواہش کرنے والے بھی اب کتنے رہ گئے ہیں۔

□□

Marfat.com

مسلم احمد نظامی

شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن

کسی بڑی شخصیت پر قلم اٹھانے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے کہ سوانح بیان ہوں یا خاکہ لکھا جائے یا پھر تذکرہ پر ہی اکتفا کیا جائے۔ الغرض ان تینوں اصناف میں سب سے آسان کام سوانح کا ہے پھر خاکہ کا مقام ہے اور سوانح کو خاکہ میں مدغم کردیا جائے۔ یہ ہی تذکرہ ہوجاتا ہے۔ زیرِ قلم سطور صرف خاکہ ہے نہ سوانح نہ تذکرہ۔ اور خاکہ وہی مرتب کرسکتا ہے جو چشم دید گواہ ہو۔ اور یہ فخر کی بات ہے کہ راقم مولانا عبدالرحمٰن کا شاگرد ہے۔ علم کی دولت جی کھول کر بانٹنے والا ہی تو سچا استاد ہوتا ہے اور اس کی عنایات سے شاگرد بنتا ہے، سنورتا ہے، نکھرتا ہے، ابھرتا ہے۔ بشرطیکہ حصولِ علم کا جذبہ صادق ہو تو یہ سطور نپی تلی وہ حقیقت ہے جس میں سوائے دیانت کے کچھ بھی نہیں۔ دل کی آواز ہے۔

میرے کرم فرما ڈاکٹر ذاکر صاحب اسی دلّی کے نامور علم داں ہیں۔ انھوں نے قدم بہ قدم راقم کی ہر ممکن مدد فرمائی اور مشورہ دیا کہ آپ صرف اپنے خیالات کو سپردِ قلم کریں۔ دوسرے حضرات نے جو کام کیا وہ ان کا اپنا نظریہ ہے۔ آپ تو اپنا نقطۂ نظر بیان کریں یہ رائے صائب ہے۔ جی جان سے تسلیم کرتے ہوئے مولانا عبدالرحمٰن کے بارے میں وہ کچھ لکھ رہا ہوں جو میری کمزور سی یادداشت میں اس لیے محفوظ ہے کیوں کہ اس کو محفوظ رہنا ہی چاہیے تھا اور الحمدللہ محفوظ ہے بھی۔

۱۹۳۹ء میں اینگلو عربک کالج دہلی میں داخلہ لیا۔ فتح پوری مسلم اسکول نے تعلیم کی بنیاد رکھی جس کا وسطی دور عربک کالج میں اور اختتامی دور سینٹ اسٹیفن میں تکمیل کو پہنچا۔ بات ہے ۱۹۴۲ء کی۔ سیاسی اتھل پتھل کا دور انگریزوں کا کالج، ایک سچی دانش گاہ۔

Marfat.com

بہرنوع انتظامی صلاحیتوں سے آراستہ پیراستہ۔ اساتذہ باوقار، علم کی دنیا میں دانائے روزگار، طلبا نظام کے پابند، سلیقہ، تہذیب، حفظِ مراتب سے آشنا، ادب لحاظ سے مزین اور کالج میں داخلہ ان تمام اصولوں کے تحت جو آج ناپید ہیں ہوتا تھا۔ اسی لیے دلّی کے جملہ کالجوں میں یہ کالج مشہور تھا اور آج بھی اس کی شہرت باقی ہے۔

مولانا موصوف بڑے خوش مزاج تھے۔ ان کے چہرہ پر خشونت کے آثار کبھی نمایاں نہیں ہوتے تھے بلکہ بڑی متانت کے ساتھ وہ طلبا کو درسیات کی طرف متوجہ رکھنے میں کامیاب کوشش کرتے تھے۔ ان کا پڑھانے کا انداز ایسا تھا کہ وہ خودمحویت کے سمندر میں ڈوب جاتے تھے اور اپنے مخصوص طرزِ بیان سے طلبا کو سبق کا حصہ بنادیتے تھے۔ دوران سبق طلبا کے استفسارات سے خوش ہوتے تھے اور جواباً ان کے سوالات کی جزویات کو گھٹی میں اتار دیتے تھے۔ ان کا لہجہ نرم، مشفقانہ، مربیانہ ہوتا تھا جس سے طلبا کا ذہن مطمئن اور زبان رواں ہوجاتی تھی۔ جھنجھلاہٹ، ناپسندیدگی ان کے مزاج کو چھوکر بھی نہیں گئی تھی۔ طلبا حفظ مراتب کو مدنظر رکھتے ہوئے پورے ادب و احترام سے ان سے سبق کے الجھاؤ دور کر کے مطمئن ہوجاتے تھے اور بار بار کی تکرار پر بھی مولانا موصوف کے ماتھے پر شکن نہ آتی تھی بڑی نرمی اور پیار سے طلبا کو اپنے سے قریب اس طرح رکھتے کہ طلبا ان کے احترام میں آنکھیں بچھا دیتے تھے۔ مزاج میں نرمی بہ حدِ کمال تھی۔ الفاظ میں سحر تھا۔ ان کی وضع قطع ان کے علمی عروج کی آئینہ دار تھی۔ ان کی بزرگی مسلمہ ان کی مزاجی شگفتگی ضرب المثل تھی۔ الغرض استاد کی عظمت طلبا کے دل میں سما جانے میں استاد کا کردار ہی بنیادی طور پر اہمیت رکھتا ہے۔ ہمارے مولانا جہاں علم کا ایک بلند پہاڑ تھے مزاجاً اتنے ہی خاکسار بھی تھے۔ طلبا ان سے محبت کرتے تھے اور اس کی وجہ ان کا وہ محتاط باوقار برتاؤ تھا جو وہ طلبا کے ساتھ برقرار رکھتے تھے۔

مخزن الاسرار نظامی گنجوی کی مشہور مثنوی ہے۔ جب اس کتاب کو مولانا نے پڑھانا شروع کیا تو اس کا پہلا شعر پڑھتے ہی مولانا کی طبیعت پر اچانک بڑا جذباتی اثر ہوا اور ان کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آگئے اور پڑھاتے پڑھاتے خاموش ہوکر کرسی پر بیٹھ گئے اور سسکیوں سے کچھ دیر روتے رہے۔ رومال سے آنسو پونچھتے رہے۔ طلبا حیران کہ یہ

Marfat.com

کیا ہوا۔ مگر کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ وجہ پوچھے وہ ابتدائی شعر تھا:

ہست کلید در گنج حکیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طلبا میں ایک غیر مسلم بھی تھے۔ ان پر حضرت مولانا کی خاموشی اور اشکباری کا غیر معمولی اثر ہوا۔ سب طلبا سکتہ کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ کوئی دس منٹ بعد مولانا مرحوم کھڑے ہوئے، کتاب ہاتھ میں اٹھائی اور طلبا کے استعجاب کو محسوس کرتے ہوئے فرمانے لگے۔

''عزیز طلبا تمھاری حالت کا مجھے اندازہ ہے۔ مجھے اپنی طالب علمی کا وہ زمانہ یاد آ گیا جب میرے استاد محترم نے یہ مثنوی مجھے پڑھانی شروع کی تھی۔ ان پر اس شعر کا مجھ سے کہیں زیادہ اثر ہوا تھا۔ وہ تو یہ شعر پڑھ کر بے حال ہو گئے تھے اور اس کے بعد اس روز درس ہی موقوف کر دیا تھا۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ حکمت کے خزانے اسی مالک کے ہاتھ میں ہیں جو رحمٰن بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ ان خزانوں کا حصول اسی کے کرم سے ہوتا ہے''۔

اور اس کے بعد مولانا نے رحمٰن اور رحیم کا مطلب بیان فرمایا کہ:

''اللہ کی ذات رحمت ہی رحمت ہے۔ وہ اپنے بندوں کو سب کچھ دیتا ہے:

جو مانگنے کا طریقہ ہے اس سے مانگ کے دیکھ

درِ کریم سے بندہ کو کیا نہیں ملتا

میرے والدین نے حصولِ علم کی دعا کس انداز سے میرے لیے مانگی تھی اس کے پرخلوص اثر نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک دن میری زندگی میں یہ بھی آئے گا کہ میں اس نامور کالج میں مشرقی لسانیات کا صدر بنوں گا۔ تو مذکورہ مثنوی کے ابتدائی شعر نے مجھ کو اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحیمی اور صفتِ رحمانی کا دل سے شیدائی بنا دیا۔ عزیز طالب علمو! تم رحیمی صفت اور رحمانی صفت کے فرق کو بھی سمجھو۔ مصدر تو دونوں الفاظ کا ایک ہی ہے مگر فرق یہ ہے کہ طلب کرنے پر رحم عطا ہو تو وہ

Marfat.com

صفتِ رحیمی کے تحت ہوتا ہے اور بغیر طلب رحم فرمانا ان کی صفتِ رحمانی ہے۔
مانگو نہ مانگو رحم ہر حال میں ہے۔ ہوتا رہے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی شان
ہے۔ اسی لیے ہر کام کی ابتدا اس ذات کے نام سے ہونی چاہیے جو طلب اور
غیر طلب میں رحم و کرم فرماتا ہے اور یہ دروازہ کبھی بند ہوا ہے اور نہ ہوگا''۔

دورانِ سبق اس قسم کے بیانات مولانا اکثر دیتے رہتے تھے جن سے طلبا کو بڑی معلومات ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ تعلیم کو بہترین صابن سمجھو جو زندگی کے میل کو صاف کر دیتا ہے۔ اگر ایسا ہو اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے کہ حصولِ تعلیم کے بعد تم دوسروں کے لیے نمونہ بن جاؤ۔ الغرض طلبا کی کردار سازی مولانا کی نظر میں لازمی اصول تھا۔ اور یہ کہنے میں قطعی مبالغہ نہیں کہ حضرت مولانا نے طلبا کے دماغ ہی نہیں ان کے دل کو بھی روشن کیا جس کے لیے ان کے شاگردوں کی زندگیاں مثالی زندگیاں بن گئیں اور ان کے حیات کا ہر شعبہ تابناک بن گیا اور یہ روشنی نسل در نسل چلتی آ رہی ہے مگر:

آنکھ والا تیرے جوبن کا تماشہ دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

زمانہ پلٹا۔ ترقی ضرور ہوئی مگر ہم پرانے لوگوں کی نظر میں یہ ترقی معکوس ہے۔ اخلاقی زوال کا بھیانک حربہ ہو رہا ہے۔ نہ استادوں کو احساس نہ طلبا کو۔ معاشرہ ترقی کی راہوں میں اخلاقی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ آگے کیا ہوگا؟ خدا جانے۔

مولانا مرحوم کے بارے میں ایک شاگرد کی کیا حیثیت ہے کہ وہ زبان کھول سکے جب کہ خدا گواہ ہے ان کے سامنے آنکھ تک اٹھانے کی جرأت نہ تھی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا تو سوال ہی کہاں اٹھتا ہے۔ شاگرد کو اپنے اطوار سے مودب بنا دینے کا انوکھا سلیقہ جو ان کو آتا تھا وہ ہمارے کالج کے دوسرے استادوں میں برائے نام ہی تھا۔ ڈاکٹر سید اظہر علی صاحب کا بھی اپنا الگ مقام تھا۔ ان کا بھی بڑا رعب داب تھا مگر مولانا مرحوم کے ہم پلہ وہ بھی نہ ہو سکے۔

نواب خواجہ عبدالمجید دلی والے کو دلی والے خوب جانتے ہیں۔ بڑے ٹھاٹھ دار صحیح معنوں میں نامور رئیس تھے۔ ان کا ایک مختصر سا مضمون رسالہ نقوش لاہور میں چھپا تھا۔

Marfat.com

سمٹا ہوا مضمون ہے مگر حضرت مولانا مرحوم کی حیات، عادات پر ایک عالمانہ جچا تلا تبصرہ ہے جو مولانا کی وفات کے بعد سپردِ قلم ہوا۔ اتفاق کہیے، دلّی کی بدنصیبی کہیے کہ تقسیم ملک سے صدیوں کی تہذیب کے علم برداروں کو پاکستان جانا پڑا اور اس طرح دلّی ہمیشہ کے لیے یتیم ہوگئی۔ مولانا عبدالرحمٰن، خواجہ عبدالمجید، ڈاکٹر اظہر علی بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو پاکستان کی بھینٹ چڑھ گئے۔ وہاں ان لوگوں پر کیا گزری یہ ایک دل خراش المناک عبرتناک داستان ہے۔ اس کے بیان کا یہ موقع نہیں نہ قلم میں یہ سکت:

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

تقریباً تیس سال تک مشن کالج سے متعلق رہے مگر اپنے تعلیمی کام کے علاوہ کسی اور کام میں دخل نہیں دیا۔ عزت واحترام ان کا مقدر تھا اور ان کے وقار اور تہذیب کی وجہ سے تھا۔ وہ دلّی یونیورسٹی میں عربی، فارسی اور اردو کے صدر رہے اور یہ کہنا بالکل درست ہے کہ مشرقی شعبۂ لسانیات کی صدارت سے یہ عہدہ ایسا ممتاز ہوا کہ آج بھی ان کی ذات اس کے لیے شمس وقمر کی مانند ہے۔ الغرض شرافت، نجابت، لیاقت، استعداد کا یہ نمونہ فی الحال اپنی جگہ فقید المثال ہے۔

جے پور، راجستھان ایک غیر مسلم ریاست تھی، مگر وہاں عربی فارسی اور اردو کی بڑی قدردانی تھی۔ نامور علما کی سرپرستی ریاست کرتی تھی۔ مولانا کے والد جے پور کی ریاست کی فوج میں ملازم تھے۔ انھوں نے اپنے فرزند مولانا عبدالرحمٰن کی تعلیم وتربیت کی طرف پوری توجہ دی اور کیوں کہ جے پور میں بڑے بڑے علما موجود تھے اس لیے ہمارے مولانا کی تعلیم وتربیت میں اچھے بزرگوں کی شفقت شامل رہی جو انگریزی اسکولوں میں علومِ شرقیہ پڑھاتے تھے۔

ہمارے مولانا نسبی طور پر راجپوت نومسلم گھرانہ سے متعلق تھے جو اسلام قبول کرکے سفری مسلمان کہلائے۔ یہ اورنگ زیب علیہ الرحمہ کی فوج میں ملازم تھے۔ یہ ایک بزرگ کی کرامت دیکھ کر اسلام کے دائرے میں آئے۔ وقت بدلا۔ مغلیہ دور کا زوال ہوا تو یہ لوگ فوج کی ملازمت سے محروم ہوکر آوارہ گرد غارت گر ہوگئے۔ مابعد بادشاہ کی مہربانی سے کاشتکاری کرنے لگے۔ مویشی پالنے لگے۔ یہ حال عام طور پر آج بھی ہے مگر کچھ لوگ ان

ہی میں سے اوپر اٹھے۔ علم کے میدان میں آگے بڑھے اور انگریزوں اور راجاؤں کی ملازمت کرنے لگے اور علم و ادب کی دنیا میں نامور ہوئے۔ ان میں سے ایک ہمارے مولانا علمی دنیا میں شمس وقمر بن کر چمکے۔

ایک کتاب محمد اسلم خاں مرحوم نے ۱۹۹۷ء میں فارسی میں لکھی جس میں مولانا عبدالرحمٰن کے بارے میں کچھ معلومات موجود ہیں۔ کتاب کا نام ہے ''ویژہ نامہ فرہنگ فارسی درہند'' اس کتاب میں مولانا مرحوم کی مشہور تصنیف مرأۃ الشعر مطبوعہ ۱۹۲۴ء کا تذکرہ ہے جو عربی فارسی اور اردو شاعری کے سلسلہ میں قابلِ قدر کتاب ہے، جس کی ہر سطر سے مصنف کی علمی معراج کا پتہ چلتا ہے۔ اللہ بھلا کرے محترم پروفیسر ڈاکٹر ذاکر صاحب کا جنھوں نے یہ کتاب برائے مطالعہ راقم کو عطا فرمائی۔ ضرب الامثال عربی اور ان کی دیگر تحقیقاتی خدمات جو انھوں نے برطانیہ کے سفر میں انجام دیں قابلِ ستائش ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں ان کی خدمات کے اعتراف میں شمس العلماء کے خطاب سے سرفرازی حاصل ہوئی۔ ۱۹۳۹ء میں وہ دلّی یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئے۔

سچ ہے علم پتھر کو ہیرا بنا دیتا ہے۔ اور ایسا ہی ہوا شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن کے ساتھ جو شمس وقمر کی تابانیوں کے ساتھ پردۂ عدم میں مشہور ہو گئے مگر ان کا نام فصاحت اور بلاغت کی دنیا میں ہمیشہ چاند بن کر چمکے گا۔ ان کے قدردان، ان کے ثناخوان ان کو دیکھنے سننے والے ابھی موجود ہیں۔ پڑھنے لکھنے والوں کو تو کاغذی معلومات ہیں۔ ہاں! چشم دید گواہ جو زندگی کے آخری دور میں ہیں ان سے پوچھو یہ مردِ مجاہد کس شان، کس آن بان کا آدمی تھا جو نظروں سے اوجھل ہو گیا مگر دلوں کی گہرائیوں میں اس کی یاد اجالے بکھیر رہی ہے۔

محمد یوسف بخاری نے اپنی کتاب ''یادِ رفتگان'' میں حضرت مولانا کی تاریخ ولادت ۱۰ر فروری ۱۸۷۳ء لکھی ہے۔ جے پور میں پیدا ہوئے اور ۳۰ر جولائی ۱۹۵۴ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔ عمر ۸۱ سال ہوئی۔ مولانا کی تصانیف راقم کی نظر سے کم گزریں سوائے ''مرأۃ الشعر'' کے جو عزیزی پروفیسر ڈاکٹر ذاکر صاحب نے مجھے برائے مطالعہ عنایت فرمائی۔ اس سلسلہ میں محترم نثار علی صاحب نے حسبِ معمول جو امداد فرمائی اس کے

Marfat.com

لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ نثار علی صاحب ایران کلچرل ہاؤس میں ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں اور صاحبِ ذوق بزرگ ہیں۔ یوسف بخاری صاحب نے مندرجہ ذیل کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جو مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی علمی کاوش کا نتیجہ ہیں۔

(۱) مرأۃ الشعر، (۲) شرح اصطرلاب، (۳) حیات اورنگ زیب علیہ الرحمہ (۴) ترجمہ ابن خلدون۔ ان کتابوں سے مولانا مرحوم کی علمی گہرائیوں کا پتہ صاحبانِ علم کو آسانی سے ہوسکتا ہے۔ برسبیلِ تذکرہ ان کی ایک تقریر کا بھی ذکر کرتا چلوں جو انھوں نے ۱۶ر اکتوبر ۱۹۲۹ء کو ریڈیو پر شمس العلماء مولانا نذیر احمد کے بارے میں نشر کی تھی۔ اس تقریر سے مولانا کی علمی شغف اور علما کی علمی خدمات پر گہری نظر کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے ڈپٹی نذیر احمد کی ۱۹۰۳ء کی ایک تقریر کا تذکرہ کیا ہے جو لاہور میں انھوں نے سنی تھی۔ مولانا کی تحریر پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ڈپٹی صاحب کھڑے بول رہے ہیں۔ ان کا ہیولیٰ، ان کے الفاظ ماضی کے علماء کا چلتا پھرتا عکس۔ مولانا عبدالرحمٰن نے عجیب دلنشیں الفاظ میں زیب قرطاس کیا ہے۔ یہ تقریر منجملہ دیگر حضرات کی تقاریر میں سے ایک ہے جو مکتبہ جامعہ، دہلی نے ''کیا خوب آدمی تھا'' کے عنوان سے شائع کی تھی۔ مذکورہ کتاب میں گیارہ تقاریر ہیں جو مقتدر علم داں حضرات نے ریڈیو سے نشر کرائیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کے بارے میں اپنی تقریر میں یہ تاریخی واقعہ قلم بند کرتے ہوئے مولانا عبدالرحمٰن صاحب فرماتے ہیں:

> ''اب ملاقات کا حال سنیے۔ ۱۹۰۶ء میں سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں عربی کے پروفیسر کی ضرورت ہوئی۔ اخبارات میں اشتہار نکلا۔ ہماری درخواست لاہور سے ہمارے ایک شاگرد نور محمد نے ہمیں مجبور کر کے دلی بھجوائی۔ یہاں دہلی میں کالج کے پرنسپل مسٹر انڈروز گویا مولانا (ڈپٹی نذیر احمد) کے مرید تھے۔ درخواستیں آئیں تو انتخاب مولانا (ڈپٹی نذیر احمد) کے سپرد ہوا۔ مولانا (نذیر احمد) کا قرعۂ انتخاب ہمارے نام پر آیا۔ پرنسپل آنجہانی لاہور پہنچے اور رنگ محل ہائی اسکول سے فوراً ریلیو (Releive) کرا کے ہمیں دلی لے آئے اور (پرنسپل صاحب نے) کہا کہ مولوی صاحب (ڈپٹی نذیر احمد) سے ملنا

Marfat.com

چاہیے۔ مئی کا مہینہ تھا۔ کوئی دس بجے کا عمل ہوگا کہ ہم مولانا کے ہاں پہنچے۔ خدمت گار نے کہا اوپر ہیں، زینہ سے اوپر چلے جاؤ۔ ہم اوپر پہنچے مولانا (ڈپٹی نذیر احمد) سے ملے۔ محبت سے پیش آئے۔ اپنے انتخاب کرنے کا ذکر زبان پر نہ لائے۔ ہم نے خود شکریہ ادا کیا کہ اسکول چھڑیا اور کالج پہنچایا۔ اونہہ کرکے اور حق بہ حقدار رسید کہہ کر خاموش ہو گئے''۔

مولانا عبدالرحمٰن نے اپنی تقریر کے آخر میں مولانا نذیر احمد کی زبان کے وہ فقرے بھی دہرائے جو حصولِ علم کے سلسلے میں ان کی محنت شاقہ کے آئینہ دار اور آج کے طلبا کے لیے سنہری ہدایت ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن فرماتے ہیں:

''مرنے سے دوڈھائی برس پہلے تک ۱۹۱۰ء بایں ہمہ مشغولیت دو ایک سبق حماسہ و متنبی وغیرہ کے سبق طلبا مدرسہ فتح پوری (جو آج مدرسہ عالیہ کہلاتا ہے) و دیگر مدارس عربیہ کے ان کے ہاں برابر ہوتے رہے۔ غریب اور ذہین طلبا سے بہت خوش رہتے۔ ان کی مدد بھی کرتے اور اکثر ان سے کہتے کہ میں نے بھی کئی برس تک مسجد کے حجرہ میں رہ کر پنجابی کٹرہ کی روٹیاں کھا کھا کر پڑھا تھا۔ دہلی کالج میں داخل ہونے پر چار روپیہ وظیفہ ہوا تو ان ٹکڑوں سے نجات ملی۔ محنت کرو محنت، ہمیں جو کچھ آیا محنت اور شوق سے آیا ہے۔ بہت دنوں تک ایک خارجی سبق کی خاطر کتاب ہاتھ میں لیے مولوی مملوک علی کے ہوادار کے ساتھ دوڑا ہوں۔ ٹھوکریں کھا کر گرا ہوں۔ یہ دیکھو گھٹنوں اور کہنیوں پر زخموں کے اب تک نشان موجود ہیں یہ کہتے اور رو پڑتے۔ لوگ امیر ہو کر اپنی سابقہ غربت اور فلاکت کو چھپایا کرتے ہیں مگر مولانا اس کا مبالغہ سے اظہار کرتے۔ خواہ مخواہ نہیں بلکہ اس لیے کہ لوگ ان کے حال و قال سے سبق لیں۔ غرض خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں''۔

مولانا عبدالرحمٰن کی ریڈیو پر یہ تقریر ۱۶/اکتوبر ۱۹۲۹ء کو نشر ہوئی۔ ڈپٹی صاحب کا انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ سترہ سال کا عرصہ گزر چکا مگر مولوی عبدالرحمٰن صاحب نے احسان شناسی کے تحت نہیں واقعاتی طور پر ڈپٹی صاحب کو جو خراجِ عقیدت پیش کیا اس سے محسوس

Marfat.com

ہوتا ہے کہ علم حاصل کر کے انسانیت، شرافت کی قدریں اگر اجاگر نہ ہوں تو پھر حصولِ علم کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ مگر آج الا ماشاء اللہ ہی ایسا ہو رہا ہے۔ ہمارے اسلاف کے بارے میں مولانا عبدالرحمٰن نے ڈپٹی صاحب کی زبان سے دورانِ تقریر یہ خوبصورت، دلنشیں شعر سنا کر ضمیر کو ہی نہیں جھنجھوڑا بلکہ ہم کو ہماری اوقات یاد دلا دی۔ سنیے، کچھ اپنا جائزہ لیجیے، کمی کو پورا کیجیے اور صحیح معنوں میں ڈپٹی نذیر احمد مرحوم عبدالرحمٰن بن جائیے ورنہ کاغذی سندیں تو کہیں کا بھی نہ رکھیں گی۔ شاید اپاہجوں کے پاس یہ کاغذی سندوں کا انبار دیکھ کر غالب مرحوم نے کہا ہو:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

مولانا مرحوم تو اللہ کو دیارِ غیر میں پیارے ہو گئے مگر ان کی آخری آرام گاہ سے علم داں حضرات کے لیے یہ آواز، یہ مطالبہ ابھر رہا ہے:

یوں نہ کر پتھروں کے حوالے مجھے
آئینہ ہوں میں گھر میں سجالے مجھے

□□

Marfat.com

ڈاکٹر مظہر احمد

بابو پالش والے

(دلّی کے ایک صوفی کرخندار)

۱۳؍اگست ۱۹۸۴ء کی صبح ابو نے گھر آ کر یہ افسوسناک خبر دی کہ تمھارے نانا کا انتقال ہوگیا ہے۔ یعنی تین دن کی مختصر علالت کے بعد بابو محمد میاں المعروف بہ 'بابو پالش والے' اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے اور اس طرح دلّی کی ایک مخصوص، رنگا رنگ اور متنوع شخصیت کی ۸۳ سالہ زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ زندگی یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم کی جیتی جاگتی مثال کے ساتھ ساتھ دلّی کی شائستگی اور تہذیب کی ایک بہت مستحکم روایت سے بھی عبارت تھی۔ بابو پالش والے، اپنے قرب وجوار میں ہی مشہور نہیں تھے بلکہ ان کی شخصیت کی ہمہ گیری اور مختلف النوع ہونے کی خوبی نے ان کی شہرت کی خوشبو ملک کے دوسرے حصوں میں بھی پھیلا دی تھی۔ ان کے انتقال کا غم اہلِ خاندان کو ہی نہ تھا بلکہ بلاشبہ ان سینکڑوں شاگردوں کو بھی تھا جنھوں نے ان کے سر پر استادی کی دستار باندھی تھی اور ملمع سازی اور کیمیا گری کے گُر سیکھے تھے۔ ساتھ ہی یہ صدمہ ان مریدوں کا بھی تھا، جنھوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور ایک بڑے اور اہم صوفیا سلسلے سے منسلک ہوگئے تھے۔

حاجی بابو محمد میاں غلام حافظ چشتی نظامی نے ۱۹۰۱ء میں محلّہ لال کنواں میں واقع گلی میر جملہ میں مقیم ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے جدِ اعلیٰ شاہجہاں کے زمانے میں حضرتِ دلّی آئے، ان کا پیشہ سپہ گری تھا۔ آپ کے والد کا اسمِ گرامی امیر بخش تھا جو زردوزی کا کام کرتے تھے۔

Marfat.com

بچپن سے ہی ذہانت و فطانت کے مظہر بابو محمد میاں کی شخصیت میں ایک جاہ وجلال پایا جاتا تھا۔ ان کا بچپن دلّی کے گلی کوچوں میں گزرا۔ وہ دلّی جو اپنی تہذیب و تمدن کے لیے چہار دانگ میں معروف و مشہور تھی۔ جہاں کا ہر گلی کوچہ صاحبانِ علم وفن سے آباد تھا۔ اسی لیے میر نے ان کوچوں کو ''اوراقِ مصور'' کہا ہے۔ نیز اگلے وقتوں کی روایتوں اور وضعداریوں نے ابھی دم نہیں توڑا تھا۔ انھوں نے ماں کی گود میں دہلوی گھرانوں کے زبان وکلام پر عبور حاصل کیا ہوگا اور باپ کے سائے میں زندگی کے سرد وگرم کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی ہوگی۔ گلی کوچوں اور بازاروں کی رونقوں اور مجلسوں میں لڑکپن گزرا ہوگا۔ بڑوں کی محفلوں میں با ادب اور ہم عمروں کی محفلوں میں ظریف اور بذلہ سنج رہے ہوں گے۔ کہتے ہیں کہ روایتی علم کے مقابلے مجلسی علم میں زندگی کے تجربات اور زمانے کے سرد وگرم کو سمجھنے کے گُر زیادہ ہوتے ہیں اور تہذیب درسی کتابوں سے نہیں بلکہ باہم صحبتوں سے حاصل کی جاتی ہے اور اس دور کی دلّی میں ایسی محفلوں کا کال نہ تھا۔ یہی وہ تربیتی گہوارے تھے جن میں نونہالانِ دلّی کی شخصیات پروان چڑھتی تھیں۔

دنیاوی علوم کے پہلو بہ پہلو دینی اور قرآنی علم کے لیے والد نے قومِ پنجابیان کے ایک گھر میں قرآن کی تعلیم کے لیے بٹھا دیا۔ وہاں استانی سے سبق بھی لیا کرتے اور دلّی کی ایک معزز برادری سے قرابت کے بموجب اپنے شہر کی تہذیب وتمدن، وضع قطع، رکھ رکھاؤ اور زبان و بیان سے اور بھی قریب سے آشنا ہوئے۔ پنجابیوں کے پھاٹک کے اسی گھر سے بابو محمد میاں نے روحانیت کا درس بھی لیا۔ استانی کے بھائی حاجی مقبول الٰہی کی شخصیت کی جاذبیت، ان کی روحانی سیرت، زہد وتقویٰ اور عبادت و ریاضت سے بے پناہ متاثر ہوئے اور ان کی مجلسوں، محفلوں اور صحبتوں میں باقاعدگی سے شریک ہونے لگے۔

انسانی شخصیت کی تشکیل میں بچپن اور لڑکپن جو کردار ادا کرتا ہے، اس کے نتائج بڑے دیرپا ہوتے ہیں۔ بظاہر ننھے سے معصوم دل پر پڑنے والے اثرات، اس کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اور پھر شخصیتیں اکہری نہیں ہوتیں۔ پیچ در پیچ اور پرت در پرت ہوتی ہیں اور ان کے اوصاف متضاد بھی ہوا کرتے ہیں۔ بابو پالش والے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ دلّی کے کرخندار تھے اور تمام زندگی کرخندار ہی رہے۔ مگر لڑکپن میں

Marfat.com

تصوف کے ماحول نے انھیں زہد وتقویٰ کے ساتھ ساتھ روحانیت سے بھی آشنا کیا اور ایک متوازن اور پرکشش شخصیت کی تشکیل عمل میں آئی۔ تاحیات باعمل زندگی کے نشیب وفراز سے ناطہ بھی جوڑے رکھا، خاندان اور اہلِ خاندان کے لیے سرگرمِ عمل رہے اور تصوف کے طفیل زندگی کے لہو ولعب اور اس کی حقیقتوں کا ادراک کیا اور بے نیازی و سرشاری کی روایت کو فروغ بھی دیا۔

اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ پنجابی برادری کے جس گھر میں بابو محمد میاں نے برائے تعلیم قرآن، آمدورفت کی ابتدا کی، وہیں حاجی مقبول الٰہی صاحب کی ذاتِ بابرکات سے بے طرح متاثر ہوئے۔ حاجی صاحب نے بیگم اور اولاد کے ناگہانی انتقال کے بعد لبادۂ فقر زیبِ تن کیا اور تصوف کی گود میں پناہ لی۔ بابو محمد میاں نے انھیں کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کے سلسلے کی ترقی وترویج میں اپنی عمرِ عزیز کا ایک طویل حصہ صرف کیا۔ حاجی مقبول الٰہی نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ کے قریب ایک حجرے کو اپنا ٹھکانہ قرار دیا اور وہیں شمعِ روحانیت کو روشن کیا۔ بابو محمد میاں دست بستہ ان کی خدمت میں حاضر ہوکر راہِ سلوک کی منزلیں طے کرنے لگے۔ کہتے ہیں کہ حاجی جی انھیں اپنے مریدوں میں سب سے زیادہ پسند فرماتے تھے۔ کسی بات، واقعہ، شعر یا حکایت کو ایک بار سن کر ہمیشہ کے لیے حفظ کرنے کی قدرت سے متاثر ہوکر انھوں نے بابو محمد میاں کو ''غلام حافظ'' کے خطاب سے سرفراز کیا۔

بابو محمد میاں نے اپنی والدہ کی ایما پر حضرت جمالی کمالی کے عرس کی بنیاد آزادی سے دس سال قبل رکھی اور آخر عمر تک باقاعدگی سے بڑے تزک واحتشام کے ساتھ عرسِ جمالی منعقد کرتے رہے۔ حضرت جمالی دہلوی کو دلّی کے زردوز اپنا روحانی پیشوا گردانتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ جمالی کے آستانے سے انھیں زردوزی کے نت نئے نقش ونگار عطا ہوتے ہیں۔ یہی عقیدت مندی ان کی والدہ کے لیے باعثِ کشش رہی ہوگی۔ آزادی سے قبل عرس کے انعقاد کے لیے انھیں انگریز حاکم کی اجازت لینی پڑتی تھی اور عرس کی تقریبات حضرت جمالیؒ کے آستانے پر ہی منعقد کی جاتی تھیں۔ آزادی کے بعد یہ سلسلہ گھر پر منتقل کردیا گیا۔ باقاعدگی سے میلاد ونعت وفاتحہ کا سلسلہ رہتا اور پھر محفلِ سماع بھی آراستہ کی

Marfat.com

جاتی۔ ملک کے نامی گرامی قوال، محفلِ سماع میں نہایت عقیدت و احترام سے شریک ہوتے۔ بزرگانِ دین سے قربت کا یہ عالم تھا کہ شجرے کی قرأت میں حضرت معین الدین چشتیؒ اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے اسمائے گرامی کی ادائیگی کے وقت رقت طاری ہو جاتی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے۔ عرس کے لنگر کا یہ عالم تھا کہ منوں کے حساب سے کھانا بنوایا جاتا اور دعوت کا سلسلہ دوپہر ۱۲ بجے سے دیر شام تک جاری رہتا۔ آج بھی مقررہ تاریخ پر دور دور سے اشخاص عرس میں شرکت کے لیے تشریف لاتے ہیں۔

حاجی مقبول الٰہی نے اپنی حیات میں ہی بابو محمد میاں کو سجادہ نشین مقرر کر دیا تھا مگر واہ رے بے نیازی کہ وہ پیرو مرشد کے سجادے پر کبھی نہیں بیٹھے۔ بلکہ گھر سے ہی اپنے سلسلے کو آگے بڑھانے کے انتہائی ذمہ دارانہ کام میں منہمک ہو گئے۔ سینکڑوں کی تعداد میں ان کے مرید ملک اور بیرونِ ملک کے مختلف حصوں میں آج بھی موجود ہیں۔ اور یہ سلسلہ دلّی، مرادآباد اور ممبئی سے ہوتا ہوا ساؤتھ افریقہ، انگلینڈ اور امریکہ پر ختم ہوتا ہے۔

بابو پالش والوں نے تمام زندگی روحانیت و دنیاداری کا نہایت متوازن نظریہ حیات نہ صرف پیش کیا بلکہ عملی طور پر اسے جی کر بھی دکھایا۔ ان کی شب بیداریاں، عبادات، وظائف، روزمرہ کے معمولات اور روزگار کی ضرورتوں سے ہمیشہ ہی ہم آہنگ رہے۔ دنیا میں رہ کر دنیا سے بے نیازانہ گزر جانا بڑے جان جوکھوں کا کام ہے مگر بابو محمد میاں نے اسے انتہائی سہل بنا دیا تھا۔ اگر تصوف انسانی روح سے غیر اللہ کے ملمع کو اتارنے سے عبارت ہے تو بابو محمد میاں نے یہ کام اپنی ذات کے ساتھ ساتھ اپنے مریدوں کی ذات کے لیے بھی کیا، مگر عام زندگی میں ملمع کاری اور کیمیا گری کے ذریعے عام اور بے جان اشیا (ظروف) کو نئے اور خوبصورت پیکروں میں بھی ڈھالتے رہے۔

اپنا کارخانہ قائم کرنے سے پہلے انھوں نے تجارت کو اپنا پہلا ذریعۂ معاش بنایا۔ میلوں ٹھیلوں میں تجارت کا سامان لے جاتے اور فروخت کر کے اپنا روزگار چلاتے۔ کالکا جی کے میلے میں دوکان لگانے کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنا پہلا کارخانہ نئی سڑک پر قائم کیا۔ ملمع سازی اور کیمیا گری یعنی نکل پالش میں جگت استاد ہوئے۔ اس

Marfat.com

میدانِ خاص میں نئی نئی ایجادیں کیں اور مہارت حاصل کی۔ مراد آبادی پیتل کے برتنوں پر کیمیاوی پچکاری میں دلّی میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ کرخنداری کا یہ سلسلہ اگلی پشت سے ہوتا ہوا آج تک جاری وساری ہے۔ بلا شبہ شہر میں سینکڑوں کی تعداد میں شاگرد ہوئے اور بعد میں تو دادا استاد بھی کہلائے۔ لوگ اپنی اولادوں کو کچھ سیکھنے اور پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے ان کی خدمت میں یہ کہہ کر دے جاتے "آپ کے حوالے کیا جو چاہے کریں مگر کچھ بنادیں"۔ اور پھر کتنے ہی بن کر نکل گئے۔ انگریزوں کے زمانے میں بابو پالش والوں کو اس دور کے ریلوے کا ٹھیکہ ملا۔ اور یہ سلسلہ تقریباً پچاس سال جاری رہا۔ نئی سڑک کا کارخانہ تقسیم سے پہلے ہی بلبلی خانے میں منتقل ہوگیا۔ نیچے کارخانہ تھا اور اوپر رہائش بعد میں انھوں نے یہ مکان خرید لیا اور یہیں اپنی باقی ماندہ زندگی گزار دی۔

دلّی والے اپنی وضع قطع یعنی لباس اور اپنی زبان وکلام سے پہچانے جاتے ہیں۔ بابو محمد میاں کا لباس دلّی کا روایتی لباس تھا۔ عام طور پر شلوار قمیض زیب تن کیے رہتے۔ گھر سے باہر نکلتے تو ہاتھ میں چھڑی یا چھتری کا اہتمام ضرور ہوتا۔ یہ چھتری نہایت نازک، سبک اور نوکدار ہوتی اور اس کا قد اتنا ہوتا کہ بوقتِ ضرورت عصا کا کام بھی کرتی۔ محفلوں اور تقاریب میں شیروانی زیب تن کرتے۔ چہرے کا رنگ گہرا، تیکھے اور کرخت نقوش، آنکھوں میں یک گونہ وحشت، چوڑا ماتھا، ستواں ناک، دراز قد، چہرے پر لمبی داڑھی جو آخر آخر میں سفید براق ہوگئی تھی۔ سر پر اپنے سلسلے کی دستار، چال میں پھرتی، مقررہ وقت سے پہلے پہنچ جانے کی عادت نے ان کی شخصیت میں دبدبہ، جاذبیت اور کشش پیدا کردی تھی۔

دلّی اردو کا شہر ہے۔ یہاں کے رہنے والے بجا طور پر اس زبان پر فخر کرتے ہیں۔ میر امن خود کو دلّی کا روڑا کہتے ہیں۔ اور میر تقی میر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بولی جانے والی زبان کو سند قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دلّی کے ہر محلے کی اپنی زبان تھی اور پھر دلّی کی برادریوں کی بھی اپنی مخصوص زبان ہوا کرتی تھی۔ بابو محمد میاں کی زبان روایتی کرخنداری سے کچھ ہٹ کر تھی کہ اس میں علمی چاشنی کا ذائقہ بھی شامل تھا۔ وہ نرم دمِ گفتگو اور گرم دمِ جستجو پر عمل پیرا تھے۔ چوں کہ شخصیت میں بڑا دبدبہ تھا لہٰذا اہلِ خانہ وخاندان کے لیے ان کی

ایک آواز حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ لب و لہجہ کو موقع کی مناسبت سے اختیار کرتے تھے۔ شاگردوں کو اولاد کی طرح چاہتے، محبت بھی کرتے مگر خطا بالکل برداشت نہ ہوتی اور جب غیظ و غضب کا شکار ہوتے تھے تو زبان و بیان کی درشتی اور تیزی و تندی اچھے اچھوں کے لیے سوہانِ روح بن جاتی تھی۔ گفتگو میں شعرا کے اشعار اور بزرگانِ دین کی حکایات کے ساتھ ساتھ، ماضی کی یادوں کی آمیزش اور حال کی بدحالی کا نوحہ بھی شامل ہو جاتا تھا اور یوں دلّی کا ایک چشم و چراغ اپنی زبان و کلام سے ہردلعزیز بن جاتا تھا۔ محفلوں میں اکثر سنجیدہ خاموشی اختیار کیے رہتے مگر جب گفتگو ناگزیر ہو جاتی تو گویا پھول جھڑنے لگتے۔ وعظ و بیانات نہایت پراز معلومات اور دلچسپ ہوا کرتے۔ پیرومرشد نے ''غلام حافظ'' کا خطاب عطا کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ حافظہ بلا کا تھا۔ بزرگانِ دین کے واقعات و حکایات بڑی تعداد میں یاد تھے اور اپنے بیانات میں بحسن و خوبی انھیں استعمال بھی کرتے تھے۔

بابو پالش والوں نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیگم کا انتقال شادی کے کچھ عرصے بعد ہو گیا تھا۔ یہ صدمہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ خود بیان فرماتے تھے کہ اکثر قبرستان میں وقت گزرتا اور دنیا سے دل اُچاٹ ہو گیا تھا۔ چنانچہ بزرگوں نے غور و فکر کے بعد دوسری شادی کا اہتمام کیا۔ یہ بمشکل راضی ہوئے۔ مگر جلد ہی بیگم کے ظاہری و باطنی حسن کی کشش سے کشاں کشاں زندگی کی ڈگر پر لوٹ آئے۔ بڑے صاحبزادے محمد نعیم کا انتقال عین جوانی میں ہوا، بیگم اس صدمے کی تاب نہ لاسکیں اور جلد ہی اپنے بیٹے سے جاملیں۔ دو صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں اللہ کے فضل و کرم سے بقیدِ حیات ہیں۔

ان تمام تفصیلات سے قطع نظر وہ میرے لیے میری امی کے ''بابو جی'' یعنی میرے نانا تھے۔ اپنے بچپن اور لڑکپن میں جیسا میں نے انھیں دیکھا اور محسوس کیا وہ میری یادوں کا حصہ ہے۔ اور ان یادوں کے ذریعہ جو تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے وہ ایک ایسے شخص کی ہے جو اپنے شہر کی تہذیب، روایات اور شرافت و اعلیٰ ظرفی کا جیتا جاگتا نمونہ تھا۔ آیئے آپ بھی چند مناظر کے ذریعہ بابو پالش والوں کو ذرا نزدیک سے دیکھیں۔

برسات اپنے پورے عروج پر ہے، پورب سے کالی کالی گھٹائیں سرمستی کا پیغام لے کر آوارد ہوتی ہیں۔ دلّی کے بانکے اور سیلانی موسم کی اس فراخ دلی سے بے طرح متاثر

ہیں۔ نانا نے بھی سیر سپاٹے کا پروگرام بنالیا ہے۔ ماموں کو حکم دیا جاتا ہے کہ علی الصباح تانگوں کا انتظام کرو اور پھر تانگے بھی تو ایک ہی خاندان سے منگوائے جاتے ہیں۔ بابو جی کا حکم سر آنکھوں پر، صبح دروازے پر تانگے تیار ہیں۔ ہم بچوں کی فوج بڑوں سے بے نیاز تانگوں پر بہتر سے بہتر مقام حاصل کرنے کی کوشش میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہے۔ خدا خدا کر کے تقریباً پورا خاندان تانگوں پر سوار ہوتا ہے۔ قیام و طعام کے تمام لوازمات تانگوں پر لادلیے گئے ہیں۔ تانگے ترکمان گیٹ سے باہر نکلتے ہی سرپٹ دوڑنے لگتے ہیں۔ نئی دلّی کی عمارتیں، ہم بچوں کے لیے باعثِ کشش ہیں۔ سڑکیں آج کے مقابلے تقریباً ویران ہیں۔ اِکّا دُکّا کاریں گردش میں ہیں۔ قطب روڈ پر تانگے والوں سے چلّا چلّا کر تیز دوڑانے کی التجا کی جارہی ہے۔ چشمِ زدن میں دوڑ شروع ہوجاتی ہے۔ تانگے دور تک دوڑتے چلے جاتے ہیں۔ بچے اس دوڑ سے لطف اندوز ہورہے ہیں۔ بڑے کچھ نانا کے احترام میں، کچھ بڑپّن کی وجہ سے بہ ادب بیٹھے ہیں۔ عورتوں کا برا حال ہے۔ اچھل اچھل کر ان کے دل حلق میں آگئے ہیں۔ خیر سے اولیا مسجد سامنے نظر آتی ہے، جہاں محل برسات کے پانی سے دھلا دھلایا یوں ایستادہ ہے جیسے ابھی غسل کر کے اولیا مسجد میں نماز ادا کرے گا۔ کہتے ہیں کہ اولیا مسجد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اپنے دستِ مبارک سے تعمیر کی تھی۔ بزرگانِ دین کے مصلّے آج بھی اس مسجد کے تقدس کو چار چاند لگاتے ہیں۔ اندھیرا باغ اور شمسی تالاب پر سیلانیوں کی چہل پہل ہے۔ ہمارا سارا خاندان ایک وسیع احاطے میں اتر جاتا ہے۔ نانا کے لیے مسند کا انتظام کیا جارہا ہے۔ وہ مہرولی کی عمارات اور اولیا مسجد کی تاریخ پر نہایت معلومات افزا گفتگو کررہے ہیں۔ نانی، امی اور خالاؤں نے چولہے چڑھادیے ہیں۔ قیمے کے ساتھ ساتھ آلو چھولوں کی سبزی تیار کی جارہی ہے۔ اتنی دیر میں گھٹاؤں نے سر اٹھانا شروع کردیا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اندھیری گھر آتی ہے اور لیجیے مینہ برسنا شروع ہوگیا۔ ہم بچے دیوانہ وار برسات کی موسلا دھار میں نہارہے ہیں۔ ادھر گرم گرم کچوریاں کڑھائی سے اترنا شروع ہوگئی ہیں۔ بڑوں کے بعد بچوں کا نمبر آتا ہے۔ ہر ایک، دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا ہے۔ اچانک آموں پر نظر پڑتی ہے، جنھیں ٹھنڈا کرنے کا اہتمام پہلے ہی کیا جاچکا ہے۔ کھانے کے بعد

Marfat.com

موسم کے آموں سے لطف اندوز ہوا جا رہا ہے اور آم کھانے کا مزا تو اجتماعی طور پر ہی آتا ہے۔ دستِ خود، دہانِ خود کا معاملہ ہے۔ غرض صبح سے شام کیسے ہو جاتی ہے پتہ نہیں چلتا۔ واپسی میں قطب مینار کی سیر سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے اور پھر تانگے شہر کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔

منظر بدلتا ہے۔ جمنا کا کنارہ ہے۔ کون سی جمنا، وہ جمنا جو باقاعدہ ایک ٹھاٹھیں مارتی ندی ہے۔ آج کا گندہ نالہ نہیں۔ سامنے ہمایوں کا مقبرہ اپنی تمام تر تاریخی شان و شکوہ کے ساتھ نہایت مضبوطی سے سربلند ہے۔ حضرت نظام الدین کے پل کے نیچے جمنا کا پاٹ کافی چوڑا ہے۔ خاندان کے تقریباً تمام مرد اور بچے کہ یہاں عورتوں کا داخلہ ممنوع ہے نانا کے پابہ رکاب ہیں۔ جیسے ایک چھتنار درخت ہے کہ سرو کی طرح ایک جگہ منجمد نہیں بلکہ کشاں کشاں نہایت تندہی سے زندگی کا سفر طے کر رہا ہے اور اس کے سائے میں تمام اہلِ خاندان محفوظ ہیں۔ برسات کے بعد ندی پُرسکون ہے۔ عمدہ اور لذیذ شکار کی امید ہے۔ مچھواروں کے ہمراہ ہماری کشتی بھی لہروں کے رحم و کرم پر ہے۔ ہم ذرا محتاط اور کچھ سہمے ہوئے کشتی میں سوار ہیں۔ جال ڈالا جاتا ہے اسے کھینچ کر کنارے پر لانے کا مرحلہ انتہائی دشوار ہے۔ یہاں بڑے بڑے جواں مرد بھی جواب دے جاتے ہیں۔ نانا دور کنارے پر بیٹھے، یہ نظارہ دیکھ رہے ہیں۔ خدا خدا کر کے ساحل نظر آتا ہے۔ بڑی تعداد میں شکار ہاتھ آیا ہے۔ مختلف اقسام کی چھوٹی بڑی مچھلیاں اب ہماری ملکیت میں شامل ہو گئی ہیں۔ چاندی کے سے بدن کی سڈول اور بھاری بھرکم مچھلیوں کو بابو جی اور ان کے بچوں کے لیے الگ کیا جاتا ہے۔ اور پھر وہیں انھیں تلنے کا سامان بھی میسر آ گیا ہے۔ تازہ تازہ مچھلی کے قتلے اور دور تک پھیلی ہوئی اشتہا انگیز خوشبو پیٹ کی آگ بھڑکا رہی ہے۔ سامانِ خورد و نوش اتنی وافر مقدار میں ہے کہ پیٹ بھر چکا ہے مگر نہ دل بھرتا ہے اور نہ سینیاں خالی ہوتی ہیں۔ بچے دوڑ کر پھر کشتی پر سوار ہو جاتے ہیں۔ بڑے اپنی گفتگو میں ظرافت کی مٹھاس گھول رہے ہیں۔ قصے کہانیوں کا دور دورہ ہے۔ ماضی کی حسین یادیں، حال کے دریچوں سے جھانکتی ہیں۔ نانا نہایت نرم گفتاری سے اپنے تجربات و مشاہدات بیان کر رہے ہیں، جہاں دیدہ ہیں۔ ان کی زبان سے ادا کیا گیا ایک ایک لفظ ہمارے لیے سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

Marfat.com

انھوں نے دنیا دیکھی بھی ہے اور برتی بھی ہے اور حسبِ استطاعت اسے بدلنے کی کوشش بھی کی ہے۔

اجمیر شریف میں پورا خاندان موجود ہے۔ عرس کا زمانہ ہے۔ تمام فضا پر کیف وسرور طاری ہے۔ ہر طرف نعتوں اور منقبتوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ فقرا اور قوال گلی گلی بزرگانِ دین کی تعریف وتوصیف میں مصروف ہیں۔ درگاہ شریف کی جانب جانے والے راستے پر کھوے سے کھوا چھلتا ہے، چلنا تو کجا سانس لینا دشوار ہے۔ غریب نواز کا جیسے دربار لگا ہے۔ ہر صبح درگاہ پر حاضری دی جارہی ہے۔ جنتی دروازے سے ایک بار گزر جانے کی حسرت ہے۔ عطر ولوبان کی خوشبو سے فضا معمور ہے۔ رجب کی سات تاریخ کو تارا گڑھ کے راستے میں ایک بزرگ حضرت ابراہیم شاہ صاحب کے عرس کا اہتمام ہمارے خاندان کے ذمے ہے۔ یہ درگاہ نہایت ہی پُرفضا مقام پر واقع ہے۔ روضے کے پہلو میں ایک بڑا ہال ہے۔ جس میں محفل آراستہ کی جارہی ہے۔ نعت خواں حضور رسالت مآبؐ کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کررہے ہیں۔ نیاز کے بعد شیرینی تقسیم کی جارہی ہے۔ بچے چھت سے شہر کا نظارہ کررہے ہیں۔ اوپر بڑے پیر کا چلّا ہے، نیچے غریب نواز کی درگاہ کا گنبد اور دیگر عمارتیں بائیں ہاتھ پر ڈھائی دن کا جھونپڑہ ہے۔ تقریب کے بعد نانا بھی چھت پر تشریف لے آتے ہیں۔ اجمیر کی تاریخی عمارتوں اور بزرگانِ دین کے ذکر سے فضا پر روحانیت سی طاری ہے۔ راستے میں فقیروں کی قطار نے ایک سلسلہ سا قائم کردیا ہے۔ یہاں سکوں کے بجائے کوڑیاں تقسیم کی جارہی ہیں۔

محرم کی نو تاریخ ہے۔ آج ہماری نانیہال میں نیاز کا اہتمام ہے۔ یہ سلسلہ سالہا سال سے جاری ہے۔ حضرت امام حسنؓ کے نام کی سبیلیں جگہ جگہ لگی ہوئی ہیں۔ کربلا کے پیاسوں کی یاد میں تمام شہر سوگوار سا ہے۔ جگہ جگہ شہادت کے بیانات ہورہے ہیں۔ صبح مالو دودھ والوں کے یہاں سے کئی من دودھ آچکا ہے، جسے جوش دے کر شربت بنانے کی تیاری ہورہی ہے۔ دوپہر کے بعد نیاز ہوگی۔ لیجیے شربت بانٹنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بچے زینے کے پاس کھڑے ہوکر آواز دے رہے ہیں ''آؤ بچو! شربت پی لو''۔ اور پھر چھوٹے بڑے، پڑوسی، راہ گیر، عورت مرد، غرض ایک سلسلہ ہے جو تادیر جاری رہتا ہے۔ محرم کی نو تاریخ کی

Marfat.com

یہ نیاز قرب و جوار میں مشہور ہے۔ تمام اہلِ محلّہ اس سے بخوبی واقف ہیں اور نہایت عقیدت کے ساتھ اس میں شریک ہوتے ہیں۔

یادوں کے دھندلکوں سے ایک منظر اور طلوع ہوتا ہے۔ آج ۲۲ر رجب ہے۔ کونڈوں کی نیاز ہوگی۔ امی اور تینوں خالائیں ایک رات پہلے ہی نانا کے یہاں جا چکی ہیں۔ صبح فجر کے بعد پوریاں بنائی جائیں گی۔ حلوہ بھی تیار ہوگا۔ تمام انتظامات کر لیے گئے ہیں۔ سامانِ خوردونوش سجا دیا گیا ہے۔ نیاز کے بعد مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جو بلا مبالغہ کئی گھنٹے جاری رہتا ہے۔ ہر خاص و عام کو شرکت کی اجازت ہے۔ عقیدت مند، اہلِ محلّہ اور احباب و رشتے دار قرب و جوار سے چلے آتے ہیں۔ تبرک میں شریک ہوتے ہیں اور تا دیر یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

آج آخری بدھ ہے۔ کہتے ہیں ماہِ صفر کے آخری بدھ کو آنحضرتؐ نے بیماری سے صحت یاب ہو کر غسلِ صحت فرمایا تھا۔ دلّی کے کرخندار اور ان کے کاریگر آج کے دن نہ صرف یہ کہ اپنے کام بند رکھتے ہیں بلکہ کاریگروں کو مٹھائی اور انعامات بھی تقسیم کرتے ہیں۔ بابو محمد میاں کے کاریگروں کے لیے آج کا دن عید سے کم نہیں ہے۔ ان کے جاہ و جلال کے آگے یوں تو کوئی شخص بھی بے تکلف نہیں ہوتا اور حدِ ادب سے تجاوز کرنا تو کجا آنکھ اٹھا کر بات کرنا بھی یہاں محال ہے۔ مگر آج کا دن ضد کرنے اور منوانے کا دن ہے اور نانا بھی آج فراخ دلی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

غرض یہ چند تصاویر ہیں جن کے ذریعے ناظرین و سامعین بابو پالش والوں کی طرحداریوں، فراخدلیوں اور بانکپن کے ساتھ کہ جو دلّی والوں کا طرۂ امتیاز ہے، ان کی شخصیت کے مختلف و متضاد پہلوؤں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میلے ٹھیلے، سیر سپاٹے، بزرگانِ دین اور تصوف سے دلّی والوں کی رقبت اور انسیت، نذر و نیاز، تہذیبی روایات، عقائد و رسوم غرض دلّی والوں کی یہ تمام خوبیاں بابو پالش والوں کی ذات میں یکجا ہوگئی تھیں۔ وہ دلّی والے تھے اسی لیے تو دل والے تھے اور دل والے تھے اسی لیے تو دلّی والے تھے۔

انتقال سے ایک روز قبل امّی کی ہدایت پر میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھیں عالمِ وجد و کیف میں پایا۔ عجب سیمابیت تھی کہ یک گونہ ٹھہراؤ بھی تھا۔ میں باادب دوزانو

Marfat.com

بیٹھ گیا۔ ایک نظر اٹھا کر دیکھا اور اپنا دایاں ہاتھ میرے زانو پر رکھا۔ اس احساسِ لمس میں نرمی بھی تھی اور کسی قدر گرفت کا احساس بھی تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ دستِ شفقت میرے وجود سے جدا ہو گیا۔ یہ آخری لمس آج بھی میں اپنے زانو پر محسوس کرتا ہوں بطورِ خاص ان مواقع پر جب مجھے کسی ہدایت کی ضرورت ہوتی ہے یا نشانِ راہ کی جستجو ہوتی ہے اور وہ لمس آج بھی میری رہنمائی کرتا ہے۔

بابو محمد میاں کے انتقال کی خبر آناً فاناً تمام شہر میں پھیل گئی اور شہر کے قرب و جوار سے بھی ان کے احباب، شاگرد، مرید وغیرہ بڑی تعداد میں یکجا ہو گئے۔ بعد نمازِ ظہر جنازہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے لیے روانہ ہوا اور باؤلی گیٹ کے نزدیک پیرومرشد کی آخری آرامگاہ سے چند گز کے فاصلے پر انھیں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

□□

Marfat.com

سبھدرا جوشی

محترمہ سبھدرا جوشی کو ہم فرقہ پرستی، تنگ نظری اور مذہبی جارحیت کے خلاف ایک ایسی زندۂ جاوید علامت کے طور پر یاد کرتے ہیں جنھوں نے سیکولر ہندوستان کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے بیش بہا قربانیاں دیں۔ وہ ملک کی تحریکِ آزادی میں جس جذبۂ صادق کے ساتھ شامل ہوئیں اس پر زندگی کے آخری لمحوں تک عمل کرتی رہیں۔ انھوں نے اپنے لیے روز اول سے جس نظریہ اور اصول کو منتخب کیا تھا اس سے کبھی پیچھے نہیں ہٹیں۔ نظریہ کی پاکیزگی اور جہد مسلسل نے ان کی شخصیت کو ایک ایسے پیکر کی شکل دی ہے کہ جب بھی ملک میں فرقہ پرستی اور مذہبی تنگ نظری کے خلاف عملی جہاد کرنے والوں کی فہرست تیار ہوگی اس میں سبھدرا جوشی کا نام سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔ انھوں نے پوری زندگی فرقہ وارانہ بھائی چارے، سماجی انصاف اور قومی یکجہتی کے نام وقف کی اور سماج کے کمزور طبقوں بالخصوص اقلیتوں کو انصاف دلانے کی لڑائی میں ہمیشہ صفِ اول میں نظر آئیں۔

سبھدرا جوشی نے سیکولرزم اور مذہبی رواداری کی جس روایت کو فروغ دیا وہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور کثرت میں وحدت کے فلسفے سے عبارت ہے اور یہی وہ فلسفہ ہے جس پر اس ملک کی بنیاد قائم ہے۔ وہ اس حقیقت کو دوسروں سے کہیں زیادہ جانتی اور پہچانتی تھیں کہ اگر اس ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور مذہبی رواداری کی شمعیں مسلسل روشن نہ کی گئیں تو ظلمت پسند طاقتیں ملک کی سیکولر بنیادوں میں ریت بھر دیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں جوں جوں سبھدرا جوشی جیسے ستون گرتے چلے جاتے ہیں سیکولرزم کی

Marfat.com

عمارت کمزور ہونے کا احساس بڑھتا چلا جاتا ہے۔آج ہمیں دور دور تک کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جو نفرت کی آگ میں کود کر اسے اپنے ہاتھوں سے ٹھنڈا کرنے کا حوصلہ رکھتی ہو، جو قتل و غارت گری، لوٹ مار اور حیوانیت کے ماحول میں لوگوں کے بیچ اتر کر انھیں انسانیت کا سبق یاد دلا سکے۔ جو خطرناک ہتھیاروں کے ہجوم میں نہتے کود کر لوگوں کے ہاتھ پکڑے اور ان سے کہے کہ تم نے انسانی بستیوں کو خاک میں ملانے کے جو منصوبے بنائے ہیں وہ دراصل شیطان کے منصوبے ہیں۔کون ہے جو سینہ سپر ہو کر فرقہ پرستوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہنے کی جرأت رکھتا ہو:

دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

ملک کی تقسیم کے دوران جب ہر طرف حیوانیت نے اپنے ڈیرے جما لیے تھے اور انسانیت کی آوازیں معدوم ہوا چاہتی تھیں۔قتل و غارت گری کا تانڈو جاری تھا۔ بستیاں ویران کی جا رہی تھیں۔عورتیں، بوڑھے، بچے، جوان سب کے سب مذہبی منافرت اور تنگ نظری کی بھینٹ چڑھ رہے تھے اور بڑے بڑے سورماؤں نے ان حالات کے آگے سپر ڈال دی تھی تو ایسے میں ایک بیمار عورت جو لاہور کے ایک اسپتال میں زیر علاج تھیں اپنی بیماری کو بھول کر دہلی کے فساد زدہ علاقوں میں کود پڑی اور تمام بے سروسامانی کے عالم میں لوگوں سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر امن قائم کرنے کی دیوانہ وار اپیل کرتی رہی۔ یہی نہیں سینکڑوں زخمیوں، لاچاروں، بے گھروں اور مجبوروں کی دادرسی کی، انھیں ریلیف پہنچائی، علاج کرایا اور سر پر چھت مہیا کی۔

آپ ذرا تصور کیجیے کہ اس خاتون کے دل و دماغ میں ایسا کون سا عشق تھا جس نے اسے آتشِ نمرود میں کودنے پر مجبور کیا۔اپنی جان کی پروا کیے بغیر وہ فرقہ واریت کے جنون سے لڑتی رہی، جھگڑتی رہی، چیختی اور چلاتی رہی۔ ۱۹۴۶ء میں جب دہلی فرقہ وارانہ تشدد کے شعلے اگل رہی تھی تو سبھد را جوشی نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی بحال کرنے کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے۔اس کے لیے پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور رفیع احمد قدوائی نے انھیں خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک عوامی جلسہ میں کہا تھا کہ ''میں نے اپنی زندگی میں سبھد را جوشی جیسے خود کو فنا کرنے والے ورکر بہت کم دیکھے ہیں''۔

ملک کی آزادی اور تقسیمِ وطن کے بعد آزاد ہندوستان میں سبھد راجوشی کا سب سے بڑا مشن فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کے فروغ سے عبارت تھا۔ وہ کبھی اپنے اس مشن سے غافل نہ رہیں اور ہمیشہ فرقہ پرستوں کے خلاف سینہ سپر ہو کر میدان میں اتریں۔ اس راہ میں کوئی آفتِ ناگہانی یا خطرات اور دھمکیاں ان کے پیروں کو پکڑنے میں ناکام رہیں۔ وہ پوری جرأت مندی کے ساتھ فرقہ پرستوں سے لڑیں اور اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک انھوں نے ہار نہیں مانی۔

محترمہ سبھد راجوشی کی پیدائش سیالکوٹ کے ایک متوسط مگر معروف گھرانے میں سنہ ۱۹۱۹ء میں ہوئی۔ ان کے والد انگریزی حکومت میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود نہ صرف قوم پرست نظریات کے پیروکار تھے بلکہ کانگریس کی تحریک آزادی کے پُرجوش حامی بھی تھے۔ پورے گھرانہ پر اس کا اثر پڑنا فطری تھا، چنانچہ سبھد راجوشی بھی اس سے اچھوتی نہیں رہیں اور اسی ماحول میں ان کے نظریات پروان چڑھے۔

جے پور میں ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے انھیں لاہور کے لیڈی میک لیگن ہائی اسکول میں داخل کرایا گیا جہاں ان کی بڑی بہن بھی زیرِ تعلیم تھیں۔ اس اسکول کی سرگرمیوں پر انگریزی حکومت کا متعصّبانہ کنٹرول تھا۔ ان دنوں لاہور میں سیاسی سرگرمیاں زوروں پر تھیں اور طلبا میں انگریزی حکومت کے خلاف جارح قومی جذبات پروان چڑھ رہے تھے۔ وہاں کا پورا ماحول ہی ایسا تھا کہ اس سے سبھد را کے دل میں بھی انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ اسکول کی ایک تقریب کے دوران انھوں نے یونین جیک کو سلامی دینے سے انکار کر دیا اور اسکول انتظامیہ کے لاکھ سمجھانے پر بھی وہ اس پر راضی نہ ہوئیں۔ بالآخر انتظامیہ نے دونوں بہنوں کا نام اسکول سے خارج کر دیا۔ اس کے بعد انھیں ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے لیے جالندھر یونیورسٹی کا رُخ کرنا پڑا۔ وہاں انھیں ضبط شدہ انقلابی ادب کے مطالعہ کا موقع ملا اور اسی دوران کئی سیاسی کارکنوں اور مجاہدینِ آزادی سے بھی رابطہ قائم ہوا، جن کے ذریعہ انھیں گاندھی جی کے افکار و نظریات اور ان کی سرگرمیوں کی بابت معلومات حاصل ہوئیں۔

ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سبھد را نے آگے کی تعلیم لاہور کے فورمین

Marfat.com

کرشچین کالج میں شروع کی اور سیاسیات میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ کالج کے دنوں سے ان کی صحت عام طور پر خراب رہتی تھی۔ ان کے والد نے انھیں علاج کی غرض سے کوئمبٹور بلا لیا جہاں وہ تعینات تھے۔

اس دوران سبھد را گاندھی جی کے رابطہ میں آ چکی تھیں۔ گاندھی جی نے انھیں سیوا گرام بلا لیا۔ کوئمبٹور سے واپسی پر کچھ دن وہ وردھا کے سیوا گرام آشرم میں ہی رہیں۔ اب تک وہ کھادی پوش ہو چکی تھیں۔ وہ سیوا گرام کے سادہ مگر پرکشش ماحول اور گاندھی جی کے معمولاتِ زندگی سے بے حد متاثر ہوئیں۔ سچائی، عدم تشدد، تمام مذاہب کا احترام اور انسانیت کے بارے میں گاندھی جی کے واضح نظریات آخری سانسوں تک سبھد را کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیتے رہے۔

آزادی کی جدوجہد آخری مرحلہ پر تھی، ہندوستان چھوڑو تحریک شروع ہو چکی تھی۔ کرو یا مرو کا نعرہ گونج رہا تھا۔ ایسے وقت میں سبھد را بھی خود کو دہلی آنے سے روک نہ سکیں۔ ان دنوں دہلی تحریک آزادی کا مرکز بنا ہوا تھا، جہاں قومی تحریک سے وابستہ کانگریس کے کئی فعال رہنماؤں سے ان کا رابطہ قائم ہوا۔ دہلی میں اپنے گزر بسر اور روپوش رہ کر سیاسی سرگرمیاں چلانے کے مقصد سے انھوں نے ایک مقامی پرائیویٹ اسکول میں استانی کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ انھوں نے دہلی کی ہریجن بستیوں میں ایوننگ اسکول قائم کیے۔ اس دوران ان کا رابطہ کچھ ایسے نوجوانوں سے ہوا جو انگریزی حکومت کے خلاف خفیہ طور پر آزادی سے متعلق ادبی تخلیقات شائع کرنے اور انھیں تقسیم کرنے میں مشغول تھے۔ انھیں لوگوں کے ذریعہ شائع ہونے والے ایک اخبار ''ہمارا سنگرام'' کی ادارت کی ذمہ داریاں سبھد را نے اپنے کاندھوں پر لے لیں۔ اس دوران ان کی ملاقات بی ڈی جوشی سے ہوئی جو کہ ان دنوں تحریک آزادی کی خفیہ سرگرمیوں میں مشغول تھے اور مزدور یونینوں کی قیادت کرتے تھے بعد کو دونوں نے شادی کر لی۔

۱۹۴۲ء کی بھارت چھوڑو تحریک میں فعال حصہ لینے کی وجہ سے سبھد را کو گرفتار کر کے لاہور ویمنس سینٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ جیل سے رہائی کے بعد سبھد را نے صنعتی مزدوروں کے درمیان کام کرنا شروع کر دیا۔ ۴۷-۱۹۴۶ء کے فرقہ وارانہ فسادات سے

ان کے ذہن پر بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ان فسادات کے بارے میں انھیں اسپتال میں معلوم ہوا جہاں وہ اپنا علاج کرا رہی تھیں۔ وہ فوراً اسپتال چھوڑ کر دہلی روانہ ہوگئیں تاکہ فسادات سے متاثرہ علاقوں میں جا کر لوگوں کو سمجھا سکیں اور متاثرین کی امداد کرسکیں۔ اسپتال سے اس طرح چلے جانے کے لیے انھیں ڈاکٹروں کی ڈانٹ بھی سننی پڑی۔ جب گاندھی جی ان سے ملنے اسپتال پہنچے تو گاندھی جی کے لیے سبھدرا کے دل میں گہری عقیدت پیدا ہوگئی اور یہ عقیدت فرقہ واریت سے لڑنے کے لیے ایک بے خطا ہتھیار بن گئی۔ وہ گاندھی جی کا اعتماد جیت کر ان کے مشن کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے دل وجان سے اس میں مشغول ہوگئیں۔ انھوں نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے سیکولر نظریات کی مختلف سیاسی پارٹیوں، سماجی اکائیوں اور مزدور یونینوں کے فعال کارکنوں کو جمع کرکے ''شانتی دل'' نام کا ایک رضا کار ادارہ تشکیل دیا۔ انہی دنوں سبھدرا کی ملاقات اندرا گاندھی سے ہوئی۔ گاندھی جی نے ان دونوں کو پرانی دلّی کے فساد زدہ علاقوں میں جا کر کام کرنے کی تلقین کی۔ ہر قسم کے خوف اور اندیشہ کو درکنار کرکے دونوں فسادات کی آگ میں کود پڑیں۔ ان علاقوں میں اپنے تحفظ کی پروا کیے بغیر متاثرین کو کیمپوں تک پہنچایا اور ان کے لیے دوا، کھانا اور قیام کا معقول بندوبست کیا۔

فسادات کے متاثرین کے لیے ''شانتی دل'' کی خدمات کو دلّی انتظامیہ سمیت پولیس و دوسرے افسران نے خوب سراہا۔ اس طاقتور، مقبول اور منظم تحریک کی پنڈت نہرو نے بھی تعریف کی اور مکمل حمایت کا اعلان کیا۔ یہی وجہ تھی کہ راجدھانی میں امن بحالی کے لیے سبھدرا کے مشوروں کو نہرو جی نے فوراً منظوری دے دی اور ان کے نفاذ میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ سبھدرا نے پوری تندہی کے ساتھ تحریک چلاتے ہوئے امن بحال کرنے میں مکمل تعاون کیا۔ آنجہانی وزیر اعظم اندرا گاندھی سبھدرا جوشی کی بے پناہ قدر کرتی تھیں۔ انھوں نے فرقہ پرستی کے خلاف ممبرانِ پارلیمنٹ کی ایک میٹنگ میں کہا تھا کہ ''اگر آپ میں سے ہر ایک سبھدرا جی کی طرح وقف ہو کر کام کرے تو اس ملک سے فرقہ پرستی کا مسئلہ حل کرنے میں کوئی وقت نہیں لگے گا''۔

۱۹۶۱ء میں مدھیہ پردیش کے جبل پور۔ ساگر علاقہ میں فسادات پھوٹ پڑے تو وہ

Marfat.com

فوراً وہاں گئیں اور تقریباً تین چار مہینے تک وہاں رہ کر متاثرین کو راحت رسانی اور ان کی بازآبادکاری میں مشغول رہیں۔ انھوں نے فسادات کی جوڈیشل انکوائری کے لیے انتظامیہ پر دباؤ ڈالا۔ جمشید پور، رانچی، میرٹھ، احمد آباد، علی گڑھ، مرادآباد، جلگاؤں و بھیونڈی اور وہ کون سی جگہ ہے جہاں گزشتہ دہائیوں میں فسادات ہوئے ہوں اور سبھدرا جی نے وہاں جاکر متاثرین کی خدمات انجام نہ دی ہو۔ انھوں نے سیکولر طاقتوں کو متحد کر کے امن قائم کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

وہ فرقہ واریت مخالف علامت کے طور پر پورے ملک میں تسلیم کی جاچکی تھیں یہی وجہ ہے کہ کانگریس نے انھیں ۱۹۶۲ء کے عام انتخابات میں یوپی کے بلرام پور حلقۂ انتخاب سے اٹل بہاری باجپئی کے خلاف الیکشن لڑنے کو کہا۔ اس پر اٹل بہاری باجپئی نے بڑے تمسخرانہ انداز میں کانگریس کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے یہ تبصرہ کیا تھا کہ ''کوئی سبھدرا جوشی آئی ہیں... اسے کون جانتا ہے یا کس نے اس کا نام سنا ہے؟ اسے ہندو سنسکرتی سے کیا لینا دینا ہے؟ وہ نہ تو سیندور لگاتی ہیں اور نہ چوڑیاں پہنتی ہیں۔ معلوم نہیں شادی شدہ بھی ہیں یا نہیں''۔ سبھدرا جوشی نے اس انتخاب میں اٹل بہاری کو شکست دی تھی۔

اسی برس سبھدرا جوشی نے فرقہ واریت سے لوہا لینے کے لیے فرقہ واریت مخالف سیکولر سیاسی نظریات کے افراد کو متحد کر کے ''آل انڈیا سامپردائیکتا ورودھی کمیٹی'' نام کا ایک ادارہ قائم کیا۔ اس ادارہ کے زیر اہتمام جلسے، سیمینار، ثقافتی پروگرام اور اشاعتوں کے ذریعہ سیکولرزم اور مذہبی ہم آہنگی کے حصول کے لیے سماج میں کام کرتی رہی ہیں۔ ان نظریات کے فروغ و فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو تقویت پہنچانے کی غرض سے انھوں نے ۱۹۶۶ء میں انگریزی ماہنامہ ''سیکولر ڈیموکریسی'' کی اشاعت شروع کی۔ قومی یکجہتی کے لیے سرگرم افراد اور جماعتوں کو منظم کرنے کے لیے انھوں نے ۱۹۷۱ء میں قومی ایکتا ٹرسٹ کی بنیاد ڈالی جس کی وہ چیئرپرسن تھیں۔ یہ ٹرسٹ آج بھی ان کی سب سے بڑی یادگار ہے۔

فرقہ واریت کے خلاف ان کی لڑائی محض ایک نظریاتی یا سیاسی جدوجہد سے عبارت نہیں تھی بلکہ وہ فرقہ واریت کو اس کی جڑوں کے ساتھ نیست و نابود کرنے پر یقین رکھتی تھیں۔ ملک میں فرقہ واریت کی سب سے بڑی پیروکار تنظیم آر ایس ایس کی وہ شدید

Marfat.com

مخالف تھیں۔ مختلف فسادات کے تحقیقاتی کمیشنوں نے آر ایس ایس کو فساد بھڑکانے کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ اس بنیاد پر وہ آخری دم تک آر ایس ایس پر پابندی لگائے جانے کے لیے جدوجہد کرتی رہیں۔ نام نہاد مکمل آزادی کے دنوں میں آر ایس ایس کے جمہوریت اور قوم دشمن کارناموں کی پول کھولنے میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہیں۔ اندرا گاندھی سے قربت کے باوجود انھوں نے ایمرجنسی کے دوران ہوئی زیادتیوں کی کبھی حمایت نہیں کی۔

۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۷ء تک وہ پانچ مرتبہ پارلیمنٹ کی ممبر رہیں۔ انھوں نے اس دور میں ملک کی خدمت کا کارواں جاری رکھتے ہوئے فرقہ واریت کے خلاف پُرزور آواز بلند کی۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو بگاڑنے کو ایک قابلِ سزا جرم کا درجہ دلوانے کے لیے انھوں نے انڈین پینل کوڈ میں ترمیم کروائی۔ انھوں نے اپنی سیاسی زندگی میں کبھی سستی شہرت کی خواہش نہیں کی بلکہ وہ ہمیشہ کمزور طبقات کو انصاف دلانے کے لیے نبرد آزما رہیں۔ انھوں نے سیاسی زندگی میں کبھی طاقت اور اقتدار کی چاہ بھی نہیں دکھائی۔ ہندوستان کی تحریک آزادی اور آزاد ہندوستان کی نظریاتی اساس مضبوط کرنے والی اس آہنی خاتون نے ۲۹؍اکتوبر ۲۰۰۳ء کو آخری سانس لی۔ ہم اس عظیم المرتبت خاتون کے کارناموں، جدوجہد اور جذبۂ حب الوطنی کو سلام کرتے ہیں۔

□□

Marfat.com

مودود صدیقی

میر مشتاق احمد

میر دلی۔ میر مشتاق احمد مرحوم ایک عظیم سماجی کارکن، ایک انقلاب آفریں شخصیت، غریبوں کے مسیحا اور دہلی میں کوآپریٹیو تحریک کے روحِ رواں تھے۔ انھوں نے ۲۵/اپریل ۱۹۱۵ء کو شملہ میں معروف مجاہد آزادی میر عبدالستار کے آنگن میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے دادا کا نام میر محمد اسماعیل تھا۔ ان کے جدِامجد سولہویں صدی کے وسط میں کشمیر سے لدھیانہ چلے آئے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں ان کے بیٹے اور میر صاحب کے والدِ محترم میر عبدالستار کی شادی جگراؤں کے ایک خاندان میں رحمت بی بی سے ہوئی۔ عبدالستار شادی کے بعد بسلسلہ کاروبار شملہ قیام پذیر ہوئے۔ ان کی اولادوں میں سب سے بڑے لڑکے کا نام میر غلام محمد تھا جو ۱۹۳۵ء میں انتقال کر گئے۔ چھوٹے لڑکے کا نام میر مشتاق احمد تھا جو اپنے والد کے انتقال کے وقت چھ سال کے تھے اور محض چھ ماہ کی عمر میں اپنی والدہ کی آغوش سے بھی محروم ہو گئے۔ ان کی پرورش ان کی ہمشیرہ نے کی۔ دورانِ تعلیم انھوں نے ٹیوشن پڑھا کر اسکول کا خرچ اٹھایا تاکہ بہن اور بہنوئی پر زیادہ بوجھ نہ رہے۔ ۱۹۳۲ء میں تعلیم کی غرض سے دہلی آئے۔ ۱۹۳۴ء میں ہائی اسکول اور یہاں کی دوسو سالہ قدیم درسگاہ اینگلو عربک کالج سے بی۔اے کیا۔ ۱۹۳۷ء میں انھیں دہلی یونیورسٹی اسٹوڈینٹس یونین کا صدر منتخب کیا گیا۔ کالج کی ایک تقریب میں میر صاحب نے محمد علی جناح کی موجودگی میں ''دوقومی نظریے'' کی انتہائی مدلل انداز میں مخالفت کی، جس نے بہت زیادہ کھلبلی مچادی۔ بی۔اے کے بعد نیشنل آرکائیوز میں ملازمت مل گئی جہاں فارسی ریکارڈ کا انگریزی میں ترجمہ کرنا میر صاحب کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔ لیکن اس دوران ان کا رابطہ کانگریس اور

Marfat.com

مجاہدینِ آزادی سے قائم ہوا۔ ترجمہ کے دوران انھیں یہ معلوم ہوا کہ مجاہدینِ آزادی پر کیسے کیسے ظلم ڈھائے گئے اور کس کس کو پھانسی دی گئی۔ اس سے انھیں جنگِ آزادی میں حصہ لینے کی ترغیب ملی۔ اور انھوں نے آزادی کی تحریک میں عملی طور پر حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔

ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا تھا کہ ''پنڈت نہرو کی شخصیت کا جادو مجھ پر کالج کے دنوں سے تھا اور گاندھی جی کا عدم تشدد میرے لیے مشعلِ راہ بنا اور میں نے اس کے لیے اپنی زندگی وقف کردی''۔ ۱۴/اپریل ۱۹۴۱ء کو کناٹ پلیس میں آزادی کے حق میں نعرے لگاتے ہوئے گرفتاری دی، دوسرے دن مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہو کر تسلیم کیا کہ میں نے نعرے لگا کر اپنے پیدائشی حق کے لیے آواز بلند کی تھی، جس پر عدالت نے ایک سال کی سزا سنائی اور راولپنڈی جیل بھیج دیے گئے۔ جیل سے رہائی کے بعد اس وقت کے کانگریس صدر مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کی۔ انھوں نے میر صاحب کو ان کے والد میر عبدالستار کے ساتھ بچپن میں دیکھا تھا، وہ پہچان گئے۔ سر پر دستِ شفقت رکھا اور کہا نشیب و فراز کو سامنے رکھ کر قدم اٹھانا۔ میر صاحب نے جواب دیا میں نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے ''تخت یا تختہ'' اس جواب سے مولانا آزاد بہت خوش ہوئے اور انھیں دلّی کانگریس کمیٹی کا ممبر نامزد کردیا۔ میر صاحب نے مہاتما گاندھی کی قیادت میں انڈین نیشنل کانگریس کی جانب سے چلائی جانے والی انفرادی ستیہ گرہ کی تحریک میں حصہ لیا اور ۱۹۴۰ء میں ایک سال کے لیے قید بامشقت کی سزا پائی۔ ۱۹۴۱ء میں میر صاحب کو نئی دہلی ضلع کانگریس کمیٹی کا سکریٹری منتخب کیا گیا اور بعد میں دہلی پردیش کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری کے طور پر نامزد ہوئے۔ اس عہدے پر وہ سات سال تک رہے۔ ان کو ہندوستان چھوڑو تحریک کے دوران بھی دو سال کی قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

مشہورِ زمانہ آئی این اے مقدمہ کی سماعت کے دوران انھوں نے لال قلعہ کے سامنے مظاہرہ کیا جس کی پاداش میں انھیں گرفتار کر کے ڈیڑھ سال کے لیے جیل میں بند کردیا گیا۔

تقسیمِ ملک کے دوران میر صاحب نے سماجی کارکن کے طور پر ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ دہلی انتظامیہ کی جانب سے انھیں اسپیشل مجسٹریٹ بنایا گیا تھا۔ وہ گلے میں ریوالور لٹکائے علاقے میں امن و امان قائم کرنے، ہجرت کرنے والوں کو روکنے اور

باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو بسانے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ انھوں نے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور لٹے پٹے لوگوں کی ڈھارس بندھائی اور انھیں ہر ممکن مدد پہنچانے کی کوشش کی۔ جب ملک آزاد ہوا اس وقت میر صاحب کی عمر صرف ۳۲ سال تھی۔ یہ عمر کچھ کرنے اور کر دکھانے کی تو ضرور ہوتی ہے۔ اس عمر میں امنگیں جوان اور ولولے نقطۂ عروج پر ہوتے ہیں لیکن میر صاحب نے قوم کے غم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ کناٹ پلیس کی رہائش ترک کر کے جامع مسجد کے سامنے اردو ناہال میں قیام پذیر ہو گئے اور دوسروں کا گھر بساتے بساتے اپنا گھر بسانا ہی بھول گئے۔ اہم سرکاری عہدوں پر رہنے کے باوجود کبھی سرکاری رہائش گاہ لینا پسند نہیں کی۔

۱۹۴۷ء کے پرآشوب دور میں میر صاحب نے بڑے مدبرانہ ڈھنگ سے پہلے تو فرقہ وارانہ فسادات پر قابو پانے کی کوشش کی، پھر متاثرین کو کیمپوں میں منتقل کیا۔ جب حالات سنبھلنے لگے تو انھیں خالی گھروں میں آباد کرنے کی ابتدا کی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ اس کے بعد سب سے کٹھن مرحلہ شروع ہوا مسلمان لڑکیوں اور عورتوں کو شر پسندوں کے چنگل سے چھڑانے کا۔ اس کام میں بڑے بڑے لیڈروں کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس موقع پر میر صاحب کا ساتھ دینے والوں میں نامور صحافی جمنا داس اختر سب سے آگے تھے۔ ان حضرات نے مل کر اور مختلف جگہوں پر چھاپے مار کر معصوم بچیوں اور عورتوں کو چھڑانے کا سلسلہ شروع کیا۔ بالا خانوں سے بھی بہت سی عورتوں کو چھڑا کر ان کا گھر بسانے کی کوشش کی۔

ایک واقعہ جناب جمنا داس اختر نے راقم الحروف سے بیان کیا کہ بنگال کی ایک مسلمان دوشیزہ کو ہم لوگوں نے شر پسندوں کے ہاتھوں سے چھڑا کر میر صاحب کے مشورہ سے جامع مسجد دہلی میں اس کے نکاح کا پروگرام رکھا۔ ایک سماجی کارکن کو اس سے شادی کرنے کے لیے تیار کیا۔ نکاح کے بعد چھوہارے تقسیم کرنے کے لیے پیسے دیے جب نکاح کا وقت آیا تو ولی کے خانے میں، میں نے اپنا نام جمنا داس اختر لکھوایا اور اسے اپنی بیٹی کی طرح سے رخصت کیا۔ میر صاحب اس میں پیش پیش تھے۔

مہاتما گاندھی کی رحلت کے بعد ۱۹۴۸ء میں میر صاحب پرجاتانترک سوشلسٹ

Marfat.com

پارٹی میں شامل ہو گئے۔ وہ دہلی یونٹ کے سکریٹری اور پی ایس پی کی ایگزیکٹیو کمیٹی کے رکن بنائے گئے۔ وہ ۱۹۶۲ء تک اس پارٹی میں رہے۔ ۱۹۶۲ء میں نہرو جی کی دعوت پر کانگریس میں دوبارہ شامل ہوئے اور دلی کانگریس کمیٹی کے صدر نامزد کیے گئے۔ اس دوران ۱۹۵۲ء میں دہلی کی پہلی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۶۷-۱۹۶۶ء میں وہ دہلی کے چیف ایگزیکٹیو کونسلر اور ۱۹۷۲ سے ۱۹۷۷ء کے دوران دہلی میٹروپولیٹن کونسل کے چیئرمین (اسپیکر) رہے۔

میر صاحب نے کئی برسوں تک دہلی اسیٹ کوآپریٹیو یونین کے صدر کی حیثیت سے کام کیا اور بہت سے تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے۔ گوا کی آزادی کے دوران وہ آل انڈیا گوا لبریشن فرنٹ کی دہلی یونٹ کے کنوینر تھے۔ میر صاحب نے ۱۹۵۱ء میں ہفت روزہ اخبار ''ایشیا'' جاری کیا جو اپنے بے لاگ تبصروں اور بے باک مضامین کے لیے مشہور تھا۔ میر صاحب سے میرا تعلق ''ایشیا'' میں پارٹ ٹائم ملازم کی حیثیت سے ہوا۔ میں نے پندرہ سال تک اس اخبار میں کام کیا۔ میر صاحب کی ایک کتاب ''مضامینِ میر'' کے نام سے ان کے دورِ اقتدار میں ہی شائع ہوئی تھی جس کا پیش لفظ سابق صدر جمہوریہ مرحوم فخرالدین علی احمد صاحب نے لکھا تھا۔ میر صاحب ذہنی طور پر پنڈت نہرو، فخرالدین علی احمد، بابو جگجیون رام، رام منوہر لوہیا، ارونا آصف علی، سبھدرا جوشی وغیرہ سے بہت قریب تھے۔

مولانا آزاد کے یومِ ولادت اور یومِ وفات کے موقع پر دری، قالین، چاندنی، کرسی، مائک، قرآن خوانی اور پھولوں کا اہتمام میر صاحب کی سرپرستی میں ہوتا تھا۔ میر صاحب مولانا آزاد اسٹڈی سرکل کے صدر تھے۔ ۱۹۸۸ء میں مولانا آزاد کے صد سالہ جشن کے موقع پر ان کے مزار پر نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما کے علاوہ بہت سے مرکزی وزرا بھی اس میں شریک ہوئے۔ ۱۹۹۲ء میں میر صاحب کو پدم شری کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔

ہفت روزہ ''ایشیا'' میں کام کرنے کے علاوہ ان سے میری پندرہ سالہ قربت دوران ان کی تحریریں، مضامین، غزلیں، قطعات اور سب سے زیادہ نعتیں پڑھنے کے مواقع ملے تو محسوس ہوا کہ الفاظ میں گہرائی، لہجے میں گھن گرج اور کہیں نرم خوئی پائی جاتی ہے۔ 'کون سنتا ہے فغانِ درویش' اور 'نغماتِ سرمدی' ان کی پسندیدہ سرخیاں ہوا کرتی تھیں، جس طرح

Marfat.com

مولانا عثمان فارقلیط کو یہ مصرعہ بہت پسند تھا اور ان کے مستقل مضامین کی سرخی بھی یہی تھی۔ 'شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات' یا ناز صاحب کا پسندیدہ عنوان تھا 'سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا'۔ میر صاحب کی تحریر بہت پختہ، غیر مبہم اور دوٹوک ہوتی تھی۔ وہ مجاہد آزادی یا سوشلسٹ رہنما ہی نہیں تھے، وہ اعلیٰ پایے کے مفکر و مدبر اور سماجی مصلح بھی تھے۔ میر صاحب کے دورِ اقتدار میں دہلی کی آبادی ۴۰ لاکھ تھی آج یہ آبادی بڑھ کر ایک کروڑ تیس لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ انھوں نے اپنے دورِ اقتدار میں ۴۰ لاکھ لوگوں کے لیے پانی، بجلی، دوا اور تعلیم جیسی ضروری اشیا کو گھر گھر پہنچانے کے لیے جنگی پیمانے پر کام کیے اور حکمتِ عملی اختیار کی۔ بے درو دیوار لوگوں اور چھتوں سے محروم عوام کے لیے رین بسیرے کی طرح ڈالی، جھگی جھونپڑی والوں کو سرکاری زمین الاٹ کر کے پختہ مکان بنانے کے مواقع فراہم کیے۔ آمد ورفت میں پریشانی کو دیکھتے ہوئے بسوں کی تعداد میں اضافہ کیا، فصیل شہر کی گنجان آبادی کے لیے شاہجہاں آباد نامی ایک پلان بنایا جس پر اگر عمل ہو گیا ہوتا تو آج دہلی کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ ٹیکسی یونین کے تو وہ خود صدر تھے ہی کل کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کا ہر دکھ ان کا ذاتی دُکھ تھا۔ وہ ریلوے قلی یونین کے بھی صدر تھے۔ ٹیکسی یونین کا دفتر آج کل پانڈونگر میں ہے اور اس سہ منزلہ عمارت کا نام میر مشتاق بھون ہے۔ ان لوگوں نے میر کے نام اور کام کو فراموش نہیں کیا ہے۔ اسی طرح ۱۹۵۶ء میں میر صاحب نے جنتا کوآپریٹیو بینک کی بنیاد جامع مسجد علاقہ میں رکھی تاکہ علاقہ کے چھوٹے موٹے کاروباری اور بے روزگار لوگ بینک سے قرض لے کر اپنے روزگار میں اضافہ کر سکیں۔ ان کا لگایا ہوا ننھا سا پودا آج تناور درخت بن چکا ہے۔ اس بینک کی جمع رقم ۳۵ کروڑ تک پہنچ چکی ہے اور اس کے ممبران کی تعداد بھی سات ہزار سے زائد ہے۔

میر مشتاق احمد شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری میں غمِ دوراں کی جھلکیاں بڑی شدومد سے ملتی ہیں۔ انھوں نے غزلیں اور نظمیں کہنے کے بجائے قطعات کو زیادہ ترجیح دی۔ انھوں نے فارسی اور انگریزی میں بھی شاعری کی۔ ان کی شاعری ان کے وارداتِ قلب کا آئینہ تھی۔ وہ اپنے احساسات اور جذبات کو سادہ لفظوں میں بیان کر دیتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی شاعری میں ''آمد'' کم ہی نظر آتی ہے اور جس پر آشوب دور سے گزرے

Marfat.com

تھے اور جتنے مصائب انھوں نے جھیلے تھے اس کے پیشِ نظر ان سے آمد کی توقع کرنا ہی عبث تھا کہ ان کی شاعری میں حسن وعشق اور زلف ورخسار کی باتیں ہوں گی۔

میر صاحب سیدزادے تھے، بزرگانِ دین سے عقیدت رکھتے تھے اور اللہ والوں سے محبت بھی کرتے تھے۔ ان کے یہاں تعصب وتنگ نظری کسی بھی شکل میں موجود نہیں تھی۔ وہ شیخ و برہمن کی بحث میں بھی نہیں الجھتے تھے۔ ان کے پاس آنے والوں میں ہر طبقہ اور برادری کے لوگ ہوتے تھے۔ ان میں برہمن بھی ہوتے اور دلت بھی، سرمایہ دار بھی ہوتے اور مزدور بھی۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں میں گداگری کرنے والے مفلوک الحال لوگ بھی ہوتے تھے اور شاعر وادیب بھی اور سیاست داں ودانشور بھی۔ وہ ایک انجمن ''انجمن تعمیر اردو'' کے روحِ رواں بھی تھے۔ جس کے کرتا دھرتا گلزار دہلوی صاحب تھے۔ اس کی ماہانہ نشستوں میں فراقؔ اور جوشؔ جیسے شعرا شرکت کرنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ دوسری طرف وہ مولانا آزاد، مولانا احمد سعید، مفتی کفایت اللہ، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن جیسے جید علما کی مجلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔

اردو بازار میں مولانا سمیع اللہ قاسمی کی بیٹھک، میر صاحب کا اردو نا ہال اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر واقع ''چنڈو خانہ'' کے نام سے مشہور چائے کی دکان ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں کی آماجگاہ تھی۔ دہلی، بیرونِ دہلی اور پڑوسی ممالک کے اردو تہذیب وتمدن کے دلدادہ لوگ ان جگہوں پر حاضری ضرور دیا کرتے تھے۔

میر صاحب کا دوسرا سب سے بڑا کارنامہ اردو اکادمی، دہلی کا قیام ہے۔ میر صاحب نے سید شریف الحسن نقوی صاحب کے ساتھ اس کے قیام کے لیے سب سے زیادہ کوششیں کیں۔ اور اسے دفتری فائلوں سے نکال کر اردو برادری کے خواب کو حقیقت کا رنگ دے دیا۔ اسی طرح دہلی وقف بورڈ، دلّی حج کمیٹی کے قیام میں ان کے تعاون کو کسی بھی شکل میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مسلم تعلیمی اداروں جیسے اینگلو عربک اسکول، فتح پوری کے وہ برسہا برس تک منیجر رہے۔ مرکزی حکومت کے ادارہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ابتدائی شکل ترقی اردو بورڈ کے قیام میں میر صاحب نے بہت اہم رول ادا کیا۔

میر صاحب قلندرانہ صفات کے حامل تھے۔ کنجوس اور کنجوسی سے نفرت کرتے تھے۔

کسی ضرورت مند کو اپنے دروازے سے نامراد نہیں لوٹاتے تھے۔ ہر کس و ناکس کا کام ہر وقت کرنے کو تیار رہتے تھے۔ اپنے دشمنوں سے بھی انتقام نہیں لیتے تھے بلکہ معاف کر دیا کرتے تھے۔ سیاسی داؤ پیچ اور سازش سے عملاً نا آشنا تھے۔ دو جوڑے کپڑے ایک اوور کوٹ، ایک لحاف اور ایک چادر میں انھوں نے پوری زندگی گزار دی۔ اکثر و بیشتر وہ اپنا کپڑا کسی نہ کسی ضرورت مند کو دے دیا کرتے تھے۔ کبھی کسی فقیر کو اپنا لحاف اوڑھا دیتے، کبھی کسی بے سرو مان کو اپنا کوٹ دے دیتے۔ دوسرے دن کوئی نہ کوئی میر صاحب کے لیے لحاف یا کوٹ بنوا دیتا تھا۔ میر صاحب پان کے بڑے شوقین تھے۔ چائے بھی کثرت سے پیتے تھے۔ نازک مزاج بھی تھے ایک سیکنڈ میں ان کا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا تھا لیکن بعد میں خود ہی پشیمان بھی ہوتے تھے۔ عوام کے ساتھ ان کا رویہ بہت نرم لیکن سرکاری افسروں کے ساتھ رویہ بڑا سخت رہتا تھا۔ وہ آسمان کی طرح بلند اور سمندر کی طرح وسیع القلب اور چٹان کی طرح مضبوط تھے۔ سرخ و سفید رنگ، چوڑا بیضوی چہرہ، خوبصورت آنکھیں، گھنی پلکیں، بلند پیشانی، پتلے ہونٹ، کھڑی ناک، دراز قد اور بھرا بھرا جسم، وہ ایک پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ کم سخن تھے اور نہایت خلیق، رفاقت پسند، بردبار اور شائستہ انسان تھے۔

میر صاحب ایک اچھے مقرر بھی تھے۔ ان کی شعلہ نوائی مشہور تھی۔ ان کی تقریروں نے لاکھوں لوگوں کے دلوں کو بدلنے کا کام کیا۔ ان کی تقریر سننے کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے اور پنڈال بھر جایا کرتا تھا۔ عوامی زندگی میں جو لوگ امتیازی حیثیت کے حامل رہے ہیں ان میں کوئی نہ کوئی کمزوری بھی رہی ہے۔ کہیں عزیزوں پر نوازشیں تو کہیں کنبہ پروری تو کہیں اپنے سگوں کو سرکاری یا غیر سرکاری ملازمتیں دلوانے کے واقعات سننے میں آئے، لیکن جہاں تک میرے علم میں ہے، پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایسی کسی قسم کی کمزوریاں میر صاحب کے آس پاس دور دور تک نہیں تھیں۔ ان کا کوئی بھائی بھتیجا ہی نہیں تھا اور ان کے نزدیک خاندان تو گویا پوری قوم تھی۔ ان کی نظر میں بلا کسی امتیاز اور بھید بھاؤ کے قوم کا ہر فرد یکساں و برابر تھا۔ ہر مذہب اور ہر فرقہ کے لوگ ان کی نظر میں ان کے جائز تعاون کے برابر کے حقدار تھے اور وہ ہر ایک کے دُکھ سکھ میں کام آنے میں روحانی مسرت محسوس کرتے تھے۔

ان کی زندگی کا ہر پہلو انفرادی طور طریقوں کا حامل تھا۔ انھیں بچوں سے پیار تھا۔ کسی

ے کام کے لیے اگر کہیں جانا ہوتا تو بغیر سواری کے پیدل ہی چلے جاتے۔ اردو بازار سے گزرتے تو ہر ایک سے ملتے ہوئے مصافحہ کرتے اور مزاج پرسی کرتے ہوئے۔ ملنساری، رفاقت پسندی اور یکجہتی کا بے غرض و بے لوث جذبہ ان کی فطرت میں تھا جو قدرت نے ازل کے دن ودیعت فرمادیا تھا۔ ہر چھوٹے اور بڑے سے یکساں اخلاق اور شیریں کلامی سے پیش آنا ان کی عادت تھی۔

وہ علم، صداقت، شرافت، نیکی، انصاف پسندی، عاجزی، سیکولرزم، ہندو مسلم اتحاد، حب الوطنی، خدمت انسانیت اور بلند آدرشوں کی آبیاری میں ساری عمر کوشاں رہے۔ لیکن ۱۹۸۲ء کے بعد میر صاحب نے بدلتی زوال پذیر سیاسی قدروں کے باعث جلسوں، محفلوں، ہنگاموں سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔

میر صاحب کی حیات و خدمات پر ایک اہم کتاب ناز صاحب نے لکھ کر ان کے معتمد خاص شری ہرنرائن شرما کی خدمت میں پیش کی تھی کہ وہ اپنی سہولت کے مطابق اسے شائع کروالیں۔ کچھ عرصہ بعد ناز صاحب کا انتقال دورانِ حج مکہ معظمہ میں ہوگیا، اور اس کے کچھ ماہ بعد ہی شری ہرنرائن بھی چل بسے۔ اس لیے کتاب نہیں چھپ سکی اور وہ مسودہ بھی کہیں کھو گیا۔

ناز انصاری صاحب اور ہرنرائن جی میر صاحب کے دو بازو تھے۔ ان دونوں حضرات کے انتقال کے بعد میر صاحب کی صحت بہت تیزی سے گرنے لگی اور وہ بالکل گوشہ نشین ہوگئے۔ پہلے بستی حضرت نظام الدین میں رہتے تھے پھر ہرنرائن جی کے بچوں کے ساتھ ساکیت میں قیام پذیر ہوگئے۔ وہیں ۲۹ رجون ۲۰۰۱ء کو اذانِ جمعہ سے قبل غسل کے لیے گئے اور اچانک داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے۔

دوسرے دن جامع مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھائی گئی۔ اور دس بجے دلّی گیٹ قبرستان میں سپردِ خاک کردیے گئے۔ اس موقع پر دہلی کی وزیرِ اعلیٰ محترمہ شیلا دکشت اور لیفٹننٹ گورنر کے علاوہ کئی وزرا، مقامی اور غیر مقامی ایم ایل اے، سیاست داں، سماجی کارکن، بینک کے ملازمین، مختلف اداروں کے بڑے حکام، علما، طلبا، مجاہدینِ آزادی اور کثیر تعداد میں غیر مسلم حضرات بھی شریک ہوئے۔ پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ تدفین عمل میں آئی۔ تابوت کے اوپر قومی پرچم رکھا گیا۔ اس کے اوپر پھول رکھے گئے، ماتمی دھن بجائی گئی

Marfat.com

اور سلامی دی گئی۔

پیدائش سے موت تک یہ انقلابی شخص زندگی بھر تنہائی سے جھوجتا رہا اور بالآخر ہمیشہ کے لیے تنہائی ہی کی گود میں چلا گیا۔

زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

میں دو سال سے میر صاحب کی شخصیت اور کارناموں پر ایک کتاب مرتب کر رہا ہوں۔ تقریباً پانچ سو صفحات کمپوز ہو چکے ہیں۔ امید ہے چار چھ ماہ میں یہ کتاب شائع ہو جائے گی۔ مسودات کی تلاش کے دوران مجھے میر صاحب کی اردو، فارسی اور انگریزی شاعری کی پانچ ڈائریاں ملیں۔ آخری ڈائری کے آخری صفحہ پر چند اشعار ہیں جو پیش کرتا ہوں۔ یہ اشعار کب لکھے گئے، کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔ خیال ہے یہ موت سے ایک سال قبل لکھے گئے ہوں گے:

بہیں گے خون کے آنسو، سنو گر داستاں میری
بیاں کرتا ہوں گر اس کو، لرزتی ہے زباں میری
ہوا تقسیم ہندوستاں، نہ پوچھو دل پہ کیا گزری
نہ ہوتا گر یہ اچھا تھا، نکل جاتی یہ جاں میری

ایک قطعہ اور ملاحظہ فرمائیے، جس کا عنوان ہے ''مرنے کے بعد''

نہ سمجھے کور چشم اس کو، نہ پایا تیرہ بختوں نے
کہ وہ اک مردِ حُر تھا، آدمیت کا نمونہ تھا
وہ تھا شیدا مذاہب کا، وطن سے عشق کرتا تھا
وہ تھا ہندوستانی، ملک اس کا آدمیت تھا
اسے نفرت سے نفرت تھی، محبت اس کا مذہب تھا
اخوت اور مروت کی، وہ ایک تصویر تھا گویا
جسے کافر کہا لوگوں نے، وہ مردِ مسلماں تھا

□□

Marfat.com

بادشاہ پہلوان

محمد بادشاہ نام، ''بادشاہ پہلوان'' کے لقب سے مشہور زمانہ۔ انھیں بادشاہ کباڑی بھی کہا جاتا تھا۔ بادشاہ پہلوان کی پیدائش نہایت اہم دن ہوئی تھی۔ وہ تاریخی دن تھا ۱۹۰۱ء کا یعنی ملکہ وکٹوریہ کی تاجپوشی کا دن تھا۔ ان کے والد کشمیری سوداگر چندا پہلوان تھے، جو کشمیر سے دہلی آکر آباد ہوئے تھے۔ انھوں نے دہلی کے ایک تاجر گھرانے میں شادی کی اور یہاں محلہ گنج میر خاں میں سکونت اختیار کی۔ چندا پہلوان کی پہلی اہلیہ کے بطن سے چار بیٹے پیدا ہوئے۔

(۱) محمد مغل (۲) محمد بادشاہ (۳) محمد وزیر (وزیرا) (۴) محمد وکیل (وکیلا) اور چندا پہلوان کی دوسری اہلیہ سے ایک بیٹا پیدا ہوا جو پاکستان ہجرت کر گیا۔

بادشاہ پہلوان انڈین اسٹائل کشتی کے ماہر تھے۔ ان کے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئے۔ عمر دین، محمد دین، احمد دین، فیروزالدین، معین الدین اور بیٹیاں شہزادی بیگم، صاحبزادی بیگم۔ بیٹیوں کے نام بادشاہ پہلوان نے شاید اپنے نام کی مناسبت سے رکھے تھے۔

بادشاہ پہلوان کے بیٹوں کو پہلوانی کا بچپن سے شوق تھا، مگر پہلوانی وفنِ کشتی میں ان کے صاحبزادے احمد دین نے خاص دلچسپی لی اور نام پیدا کیا۔ انھوں نے دہلی و بیرونِ دہلی فنِ کشتی کا مظاہرہ کیا اور تمغے، شیلڈ اور گرز انعام میں حاصل کیے۔ بادشاہ پہلوان فنِ کشتی میں استاد ممتاز پہلوان (گوندی والے) کے شاگرد تھے۔ فنِ بیرا کی میں ماہرِ فن تھے۔

"کل نفس ذائقة الموت" ہر متنفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ چنانچہ انسانوں کو

Marfat.com

پل پل ہنسانے والے اس شخص نے ۱۵ ارنومبر ۱۹۸۹ء کو دہلی کے سوئیوالان محلہ کی گلی ''بادشاہ پہلوان'' میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اِنّا لِلّٰہِ و اِنّا الیہ راجعون'' عمر کے آخری حصہ میں وہ بہت مذہبی ہوگئے تھے اور اپنے مخصوص لہجہ میں نماز کی تبلیغ بھی انجام دیتے تھے۔

جب ہم بادشاہ پہلوان کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ جہاں وہ ایک پہلوان تھے وہیں ایک مزاحیہ اداکار بھی تھے۔ انھوں نے مدتوں اپنے مزاح پاروں سے انسانوں کے مزاجوں کو شگفتگی اور شادمانی عطا کی۔ انھوں نے فلموں میں بھی کام کیا۔ وہ ایک اچھے اداکار بھی تھے۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ اردو ادب کے طنز و مزاح نگاروں نے اپنے قلم کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ قاری ان کی تحریر کو پڑھ کر نہایت محظوظ ہوتا ہے۔ ہر طنز نگار اپنے اسلوبِ نگارش سے قارئین کو متاثر کرتا ہے۔ ہم چاہے شوکت تھانوی کو پڑھیں یا مشتاق یوسفی کے فن پاروں سے حظ حاصل کریں، ابن انشاء کا سفرنامہ پڑھیں یا شفیق الرحمٰن کی تخلیقات کے مطالعہ سے کیف حاصل کریں۔ یا یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کی تحریروں کو سن یا پڑھ کر ان کے اثرات سے ہنستے ہنستے بے حال ہو جائیں۔ ان صاحب قلم حضرات کے علاوہ کچھ تلمیذ الرحمٰن ہستیاں بھی ایسی ہوتی ہیں جو صاحبِ قلم تو نہیں ہوتیں ہاں صاحبِ قلم حضرات کی فکر کا موضوع بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ہم صاحبِ قلم حضرات کی تخلیقات کو پڑھ پڑھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن ان کی فکر کا موضوع بننے والی ہستیوں کی اہمیت کو یا تو سمجھ نہیں پاتے یا نظر انداز کر دیتے ہیں، جو اپنے شگفتہ جملوں، چہرے مہرے اور ایکشن سے دلوں کو موہ لیتے ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت دہلی کے ''بادشاہ پہلوان'' کی تھی۔

کشتی کے فن میں بادشاہ تھے۔ ایک ماہر پہلوان تھے۔ انھوں نے دہلی اور بیرون دہلی اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اور دہلی و بیرونِ دہلی کے اس زمانہ کے پہلوانوں پر اپنی برتری قائم رکھی۔ بڑودہ، احمد آباد، بنگلور اور میسور میں وہ تقریباً ۲۵ سال تک رہے۔ سائیکل کی تجارت کے ساتھ ساتھ پہلوانی کے شوق کو بھی جاری رکھا۔ بیرونِ ممالک ڈھاکہ (بنگلہ دیش) اور سری لنکا میں مدمقابل پہلوانوں کو شکست دے کر دادِ تحسین حاصل کی۔ سری لنکا

Marfat.com

میں ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ ایک خاتون پہلوان جو کُشتی میں بہت سے پہلوانوں کو زیر کر چکی تھی اور جس کی دھاک پہلوانوں پر بیٹھ گئی تھی۔ اُس خاتون پہلوان کا مقابلہ بادشاہ پہلوان سے ہونا طے ہوا۔ بادشاہ پہلوان اپنے مخصوص اداکارانہ انداز (زنانہ انداز) میں اکھاڑے (رنگ) میں اترے تو کُشتی دیکھنے والوں نے پیشگی یقین کی حد تک فیصلہ کرلیا کہ یہ عورت بادشاہ پہلوان کو پل بھر میں چت کردے گی، مگر چار منٹ میں اچانک نتیجہ ان لوگوں کی توقعات کے برعکس برآمد ہوا۔ بادشاہ پہلوان نے خاتون کو زیر کرلیا تھا۔ تماشہ بین لوگوں کی توقع کے خلاف نتیجہ برآمد ہوا تو بادشاہ سلامت کی ہوا آ گئی۔ ''بادشاہ پہلوان زندہ باد'' کے نعروں سے ماحول گونج اٹھا۔ لوگوں نے جوش میں بادشاہ کو کاندھوں پر اٹھالیا۔ بادشاہ پہلوان نے کئی مرد پہلوانوں کی شکست کا بدلہ جو لے لیا تھا۔ بادشاہ پہلوان کی خوب جے جے کار ہوئی۔ بادشاہ پہلوان کی اہمیت اس بات سے اور بھی بڑھی کہ انھوں نے ہندوستان کے چندگی رام (بھارت کیسری) اور مہردین پہلوان دونوں پر سبقت قائم رکھی تھی۔ مسز اندرا گاندھی نے دہلی اور ہندوستان کے نامور پہلوانوں کو اپنے یہاں بلاکر تمغوں سے سرفراز کیا ان میں بادشاہ پہلوان بھی شامل تھے۔ میرے پاس اُس موقع کی تصویر محفوظ ہے۔

بادشاہ پہلوان بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بچے اگر کسی سے خوش رہیں تو اللہ بھی اس سے راضی ہوتا ہے۔ چنانچہ بچوں کو خوش کرنے کے لیے وہ فنونِ لطیفہ کی ایک شاخ جس میں وہ پرندوں کی آواز، کبوتر کی 'گٹرگوں' (بقبکاہٹ)، مرغ کی آواز 'ککڑوکوں' اور مادہ یعنی مرغی کی 'کٹ کٹ کٹاک'، مینا کی آواز، جانوروں یعنی چوپایوں میں گائے، بھینس کا ڈکارنا، بلّی اور کتے کی آواز نکالنا، رات میں بلی کی آواز گھر میں نکالتے تو سوتے ہوئے افراد بلی کو بھگاتے، ہُش بلّی، ہُش بلّی کرتے دوڑتے۔ اس کے علاوہ بچے کے رونے کی آواز، عورت کی آواز وغیرہ۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ بادشاہ پہلوان بمبئی کے کسی ہوٹل میں مقیم تھے۔ رات کو انھیں کیا سوجھی کہ ایکٹی ونی کی جائے چنانچہ رات کو اپنا کمرہ بند کر کے مرد اور عورت کی آواز میں لڑائی شروع کردی۔ کبھی عورت کی آواز نکالتے کبھی مرد کی۔ چند لمحوں میں ہوٹل کا مالک معہ اپنے اسٹاف کے آکر دروازہ

Marfat.com

پیٹنے لگا۔ دروازہ کھلا تو ون پیس بادشاہ پہلوان کے علاوہ کوئی بھی نظر نہ آیا۔ سب نے باتھ روم وغیرہ حد ہے کہ بیڈ کے نیچے بھی دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ ان کی ناکامی دیکھ کر بادشاہ پہلوان نے زنانہ آواز میں کہا کہ میری جیب میں بھی تو دیکھ لیجیے۔ جب لوگوں کو صحیح بات کا پتہ چلا تو ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے۔ اس کے بعد روزانہ بادشاہ پہلوان کا پروگرام ہوٹل والوں کا معمول بن گیا۔ ہوٹل میں ٹھہرے مسافروں کو تفریح مہیا ہوئی۔ ہوٹل والوں کی فری پبلسٹی ہو گئی۔ بادشاہ پہلوان نے اپنا یہ ڈراما حاجی ہوٹل جامع مسجد، دہلی میں بھی پیش کیا۔

بادشاہ پہلوان کو اسپورٹس کا بھی شوق تھا۔ وہ فٹ بال اسٹیڈیم میں ہر میچ میں موجود ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ سابق صدر جمہوریہ ہند مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کسی میچ میں انعامات تقسیم کرنے تشریف لائے تو وہ بادشاہ پہلوان کی پُر لطف فقرہ بازی، ایکٹنگ اور لباس سے کافی متاثر ہوئے چنانچہ اکثر بادشاہ پہلوان کو راشٹر پتی بھون بلاتے تھے۔ بادشاہ پہلوان مزاح میں ایک ماہرِ فن تھے۔ خوب رو، کسرتی بدن، میانہ قد وقامت، ان کے جسم پر ہر لباس خوب سجتا تھا۔ اس سلسلے میں موصوف اپنے نام کی مناسبت کو بھی قائم رکھتے تھے۔ کبھی انگرکھا، چوڑی دار پاجامہ، کبھی چوڑی موری کا پاجامہ اور چکن کا کرتا، دہلی میں ینگ مین گراؤنڈ (موجودہ امبیڈکر اسٹیڈیم) میں فٹ بال لیگ میچ ہوں یا ڈی سی ایم، ڈیورنڈ ٹورنامنٹ، یا اور کوئی بھی فٹ بال ٹورنامنٹ بادشاہ پہلوان پورے ٹورنامنٹ میں شاہی لباس زیب تن کیے گراؤنڈ میں میچ شروع ہونے سے پہلے پہنچ جاتے۔ شاہی پگڑی بمعہ تاج، کارچوبی چغہ، زری کی سلیم شاہی جوتی، ہاتھ کی انگلیوں میں انگوٹھیاں، دولڑکے پیچھے پیچھے دراز حقہ اٹھائے۔ ایک لڑکا سٹک (نے) بادشاہ سلامت کے دستِ مبارک کے قریب کیے۔ اور بادشاہ سلامت شاہانہ بے نیازی سے حقہ کا کش لگاتے خراماں خراماں گراؤنڈ میں داخل ہوتے۔ ہر طرف سے ان پہ فقرہ کشی شروع ہو جاتی اور پھر بادشاہ سلامت کے دلچسپ، منہ توڑ اور پُر مزاح جوابات کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ غرض حاضرین وشائقین میں ایک عجیب ہلچل مچ جاتی۔ اور وہ اس وقت شاہانہ انداز میں پورے گراؤنڈ کا چکر لگا کر اپنی موجودگی لوگوں کے ذہنوں میں درج کراتے اور ماحول کی جان بن جاتے۔

دیوان سنگھ مفتوںؔ جن کا صحافت میں ایک خاص مقام تھا اور وہ ''ریاست'' کے ایڈیٹر

تھے۔ مفتون صاحب ایک بار کسی کام سے احمد آباد گئے۔ گرمی کا موسم تھا۔ وہ سابر متی کے کنارے چہل قدمی کرر ہے تھے کہ انھوں نے وہاں اچانک دیکھا کہ بادشاہ پہلوان مجمع لگائے ہوئے ہیں۔ دو چار ڈبے جن میں منجن اور چار شیشے کے جار جن میں سانپ بند ہیں اور ایک سانپ گلے میں ڈال رکھا ہے۔ اپنے مسخرے پن میں مگن ہیں۔ لوگ جمع ہیں دھندہ ہو رہا ہے۔ مفتون صاحب نے اس موقع کا ایک ایک فوٹو کھینچا اور اپنے رسالے ''ریاست'' میں شائع کیا۔ میں نے خود یہ پرچہ دیکھا ہے۔ یہ بات تقریباً ۴۵ سال پرانی ہے۔

بادشاہ پہلوان کی شخصیت اردو اخبارات تک ہی محدود نہ رہی اکثر انگلش اخبارات میں بھی ان کے متعلق آرٹیکل اور تصاویر شائع ہوتی تھیں۔ ان اخبارات میں "Sun" کی فوٹو کاپیاں میرے پاس موجود ہیں اور دو عدد فوٹوز بھی یادگار کے طور پر محفوظ ہیں۔

یہ دنیا بھی عجب ہے بقول جگر صاحب:

کوئی مست ہے کوئی تشنہ لب تو کسی کے ہاتھ میں جام ہے
مگر ان کا کوئی کرے گا کیا یہی میکدہ کا نظام ہے

تجربہ اور مشاہدہ یہی ہے، جسے دیکھو کسی نہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے۔ چہروں پہ اصلی ہنسی کا فقدان ہے۔ مسکراہٹیں مصنوعی معلوم ہوتی ہیں۔ اس عالم میں اگر کوئی شخص اپنی حرکات اور اپنے الفاظ سے کسی شخص کے غم پل دو پل کے لیے بھلا دے اور حقیقی مسکراہٹ بخش دے تو اس سے بڑھ کر نیکی دنیا میں کون سی ہو سکتی ہے۔ بادشاہ پہلوان بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھے، جنھوں نے ہمیشہ دنیا میں رہ کر انسانوں کو خوش کرنے اور ہنسانے کی کوشش کی۔ انھیں زندگی کے خوبصورت چند لمحات دیے۔ ان کی ان نیکیوں پر دلی ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔

انسانوں کے دلوں کو دکھانے والوں کی اس دنیا میں کوئی کمی نہیں، بادشاہ پہلوان جیسے لوگ کم اور بہت کم ہوتے ہیں۔ اسٹیج پر آ کر یا سماج میں پبلک کو فیس کرنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اچھے اچھوں کی سٹی گم ہو جاتی ہے۔ اچھے اچھوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے اور جب کوئی شخص مزاح کا چولا پہننے کی کوشش کرے تو یہ بہت ہی مشکل

Marfat.com

کام ہوتا ہے۔

مزاح اور مسخرہ پن کو اپنانے والا شخص سب سے پہلے خود نشانہ بنتا ہے اور یہ عمل یقیناً دشوار ترین ہے۔ یہ ایسا عمل ہے کہ اس شخص کو مدتوں ریاض کرنے کے ساتھ ساتھ آتشِ عمل میں بھی تپنا پڑتا ہے تب جا کر وہ کندن بنتا ہے۔ تب ہم اسے فن کار کا درجہ دیتے ہیں۔ بادشاہ پہلوان بھی اسی قبیل کے فن کار تھے، جنھوں نے اپنی شخصیت بنانے میں جہاں ریاض کیا، وہیں خلقت کے دلوں میں بھی جگہ بنائی۔ کہا جاتا ہے کہ سنجیدہ ادب کے مقابلہ میں طنز و مزاح کا موضوع نہایت مشکل ہے، جہاں تک Comedy کا تعلق ہے یہ روایت بہت پرانی ہے، شاہی درباروں، امرا و نوابین کے درباروں میں ایسے فن کار خاص طور سے مدعو کیے جاتے تھے جو محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے اور ان کے فن کی دلچسپیوں میں کھو کر کچھ دیر کے لیے انسان ہر غم اور ہر پریشانی بھول جاتا تھا۔ بادشاہ پہلوان عوامی فنکار تھے، انھوں نے اپنے فنون کا مظاہرہ سماج میں رہ کر عوام کے لیے کیا۔ پہلوانی ہو یا حسِ مزاح یا اداکاری ان کا ہر فن عوام کے لیے تھا۔ وہ عوام کے پسندیدہ فن کار اور ''بادشاہ پہلوان'' تھے۔ بادشاہ پہلوان کی تمام خصوصیات کو دیکھتے ہوئے سابق چیف ایگزیکٹیو کونسلر آنجہانی شری رادھا رمن جی نے غالباً ۱۹۷۳ء میں یومِ جمہوریہ کی پریڈ میں دلّی کی جھانکی کے لیے بادشاہ پہلوان کو منتخب کیا۔ جھانکی میں خاص بات یہ تھی کہ جامع مسجد اور لال قلعہ کی مناسبت سے بادشاہ پہلوان کو بادشاہ کے روپ میں معہ درباریوں کے پیش کیا گیا تھا۔

میرا یقین ہے کہ پسِ مرگ اگر کسی شخص کو خلقت اچھے الفاظ سے یاد کرے، اس کے کارناموں کو سراہے تو یہ اس شخص کے جنّتی ہونے کی دلیل ہے۔ چوں کہ یہ بھی سچ ہے کہ

''زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو''

کاش ہم بادشاہ پہلوان کی عملی زندگی سے سبق حاصل کریں اور انسانوں کو چاہے پل دو پل کے لیے ہی سہی کچھ خوشیاں دے سکیں۔

آخر میں یہی عرض کروں گا۔

''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا''۔

□□

Marfat.com

ننند کشور وکرم

دیویندر ستیارتھی

لگ بھگ بیس برس تک ملک کے طول وعرض میں قلندروں اور فقیروں کی طرح گھوم گھوم کر ہزاروں لوک گیت جمع کرنے کا غیر معمولی کارنامہ انجام دینے والے واحد ادیب جناب دیویندر ستیارتھی جنھیں اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی چاروں زبانوں پر دسترس حاصل تھی ۱۲ رفروری ۲۰۰۳ء کو انتقال کر گئے اور اس طرح ہم ایک ایسے بزرگ اور منفرد ادیب، افسانہ نگار اور شاعر سے محروم ہو گئے جن کی شہرت بیسویں صدی کے چوتھے دہے کے اواخر میں سارے ہندوستان میں اتنی پھیل گئی تھی کہ ان کے کام کی تعریف مہاتما گاندھی، گورودیو رابندر ناتھ ٹیگور، پنڈت مدن موہن مالویہ، نندلال بوس، راہل سانکر تائن اور دیگر مشاہیرانِ وطن نے کی تھی۔

ستیارتھی جی کی ولادت ۲۸ رمئی ۱۹۰۸ء کو پنجاب کے ضلع سنگرور میں واقع گاؤں بھدوڑ میں ہوئی تھی اور میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ کوئی ڈیڑھ سال تک ڈی اے وی کالج لاہور میں بھی تعلیم پاتے رہے لیکن پھر اسی دوران ان پر مایوسی کا ایسا دورہ پڑا کہ اگر علامہ اقبال نے سمجھا بجھا کر انھیں راہِ راست پر لانے کی کوشش نہ کی ہوتی تو انھوں نے لاہور کے نیلے گنبد کے چوک میں خودکشی کر لی ہوتی۔ علامہ اقبال کے سمجھانے بجھانے سے ان میں ایک نئی امنگ پیدا ہوئی اور پھر اچانک ہی انھیں ہندوستان کے لوک گیتوں کو جمع کرنے کی ایسی دھن سمائی کہ ملنگوں کی طرح گھربار چھوڑ کر لوک گیتوں کی تلاش میں ایک لمبے سفر پر چل پڑے۔ اور لگ بھگ بیس برس تک ملک کی مختلف ریاستوں میں گھوم گھوم کر اور طرح طرح کی دشواریوں کا سامنا کر کے انھوں نے ہمیں دیش کے مختلف علاقوں میں

Marfat.com

رائج لاتعداد لوک گیتوں کا قومی ورثہ عطا کیا۔ یہ ایک ایسا عظیم کارنامہ تھا جو غالباً کسی اور ہندوستانی ادیب نے انجام نہیں دیا تھا۔

لوک گیتوں کی تلاش کا جنون اُن پر ایسا چھا گیا تھا کہ وہ دنیا و مافیہا کو بھول گئے اور گھر بار تیاگ کر اس منتہائے مقصود کی تکمیل کے لیے ملک کے وسیع و عریض علاقے کی خاک چھاننے لگے۔ کبھی وہ شانتی نکیتن پہنچ جاتے تو کبھی سری لنکا۔ ملک کا کوئی ایسا کونہ نہیں تھا جہاں وہ اس مقصد کے لیے نہیں گئے۔ پنجاب، آسام، بنگال، کشمیر، اتر پردیش، مدھیہ پردیش، گجرات اور نہ جانے کہاں کہاں گئے اور لوک گیتوں کے ایسے بیش بہا قومی ورثے کو تلاش کیا کہ گاندھی جی بھی عش عش کر اٹھے اور وہ ان کے اس کارنامے سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اس کی تعریف میں انھیں خطوط ہی نہیں لکھے بلکہ اس کام کو اہم بتاتے ہوئے انھوں نے ہندی ساہتیہ سمیلن میں، جس کے وہ صدر تھے، لوک گیتوں سے متعلق تجاویز بھی پیش کیں اور ۱۹۳۶ء میں انھیں اندور میں منعقد ہونے والے ہندی ساہتیہ سمیلن میں شرکت کی دعوت بھی دی اور اس سلسلے میں وہ اپنے ایلچی کاکا کالیلکر کو ان کو دعوت دینے کے لیے خاص طور پر بھیجا۔

۱۹۲۷ء میں ستیارتھی جی تعلیم ادھوری چھوڑ کر لوک گیت جمع کرنے کے مقصد سے لاہور سے روانہ ہوئے تھے اور پنجاب، کشمیر، بنگال، آسام، مدھیہ پردیش، گجرات وغیرہ مختلف ریاستوں میں جگہ جگہ گھوم کر لوک گیت اکٹھے کرتے رہے۔ اس دوران ۱۹۲۹ء میں جب وہ کچھ مدت کے لیے گھر آئے تو والد نے ان کی 'آوارہ گردی' کو ختم کرنے اور دنیاوی بندھنوں میں باندھنے کے لیے ان کی شادی کر دی، لیکن ازدواجی زندگی بھی انھیں اپنے جنون، اپنے مقصد سے روک نہ پائی اور جگہ جگہ گھوم کر لوک گیت جمع کرنے کے لیے وہ پھر لوک گیت جمع کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ اسی تلاش و جستجو کے دوران وہ شانتی نکیتن بھی گئے اور وہاں انھوں نے گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور اور دیگر مشاہیر سے ملاقات کی اور پھر ہزاروں لوک گیت جمع کر کے تقریباً بیس برس بعد لاہور لوٹے۔ ۱۹۳۸ء میں وہ کچھ عرصہ اجمیر کے ویدک یںترالیہ میں جہاں سے آریہ سماج کا ''ستیارتھ پرکاش'' شائع ہوا کرتا تھا، پروف ریڈر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ یہاں کام کرنے کا ہی اثر تھا کہ ستیارتھ

Marfat.com

پرکاش کی ہی طرز پر انھوں نے اپنے نام کے ساتھ بھی ''ستیارتھی'' کا اضافہ کرلیا۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے اپنی رفیقۂ حیات اور آٹھ سالہ بیٹی کویتا (پیدائش ۲۵/اگست ۱۹۳۲ء وفات ۹/دسمبر ۱۹۶۱ء) کے ساتھ سری لنکا کا سفر کیا۔ مئی ۱۹۴۶ء تا فروری ۱۹۴۸ء وہ دہلی میں ''انڈین فارمنگ'' کے مدیر رہے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ مستقل طور پر دہلی میں بس گئے اور مارچ ۱۹۴۸ء میں انھیں پبلی کیشن ڈویژن میں وزارتِ اطلاعات ونشریات کے مشہور ہندی ماہنامہ ''آج کل'' کا مدیر مقرر کیا گیا اور وہ ۱۹۵۶ء تک اس رسالہ سے وابستہ رہے۔ دسمبر ۱۹۵۶ء میں وہ یک لخت گھر سے غائب ہوگئے اور بغیر کسی کو بتائے پاکستان چلے گئے اور لگ بھگ چار مہینے تک لاہور میں مقیم رہے۔ اس دوران وہ کراچی بھی گئے جہاں وہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے مہمان کی حیثیت سے قیام پذیر رہے۔

انھیں کئی اداروں اور اکادمیوں کی جانب سے انعامات واعزازات دیے گئے۔ ۱۹۴۹ء میں بھاشا وبھاگ پٹیالہ نے شریشٹھ نثر نگار کا اعزاز عطا کیا۔ ۱۹۷۶ء میں حکومتِ ہند نے پدم شری کے اعزاز سے نوازا۔ ۱۹۷۷ء میں پنجاب سرکار نے شریشٹھ ہندی لیکھک کا اعزاز عطا کیا۔ ۱۹۸۸ء میں پنجابی ساہتیہ اکادمی، دہلی نے انعام سے نوازا۔ پنجابی ماہنامہ ''آرسی'' نئی دہلی نے ان پر خصوصی نمبر شائع کرنے کے علاوہ انھیں ایک لاکھ روپے کا انعام بھی دیا۔

لوک گیتوں سے متعلق ستیارتھی جی کی پہلی کتاب اردو میں 'میں ہوں خانہ بدوش' منظر عام پر آئی اور اس کو اتنی شہرت ملی کہ ان کے چرچے بڑے زور وشور سے ادبی حلقوں میں ہونے لگے بعد ازاں ''دھرتی گاتی ہے'' اور ''گائے جا ہندوستان'' کی اشاعت سے وہ اتنے مقبول ومعروف ہوگئے کہ ان کے ہمعصر رشک وحسد سے کبھی ان کی داڑھی کا اور کبھی ان کی شخصیت کا مذاق اڑانے لگے یہاں تک کہ کچھ ان کو ''فراڈ'' اور ''بور'' کہنے سے بھی نہ ہچکچائے مگر وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز اپنی منزلِ مقصود کی جانب رواں رہے اور تقریباً ستر سال تک ادبی خدمت انجام دیتے رہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی لوک گیتوں کو جمع کر کے ستیارتھی جی نے ایک اہم مقام حاصل کرلیا تھا اور اس حیثیت سے اُن کا کوئی ثانی نہیں ہے لیکن بطور کہانی نویس بھی

Marfat.com

انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہندوستانی تہذیب و تمدن کے نمائندہ ادیب تھے جنھوں نے ہماری تہذیب، ہماری تاریخ اور ہمارے لوک گیتوں کے پس منظر میں ایک منفرد انداز واسلوب اپنا کر ہمیں کئی یادگار ادبی تخلیقات عطا کیں۔

ستیارتھی جی نے اس زمانے میں کہانی کے میدان میں قدم رکھا جب کرشن چندر، منٹو، بیدی، غلام عباس، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی اور احمد ندیم قاسمی کا دور دورہ تھا اور وہ آسمانِ ادب پر چھائے ہوئے تھے۔ اگرچہ آج وہ ہندی اور پنجابی کے ادیب کے طور پر زیادہ مشہور ہیں تاہم انھوں نے بطور کہانی نویس اردو میں ہی شروعات کی تھی اور ان کی پہلی کہانی ''اور بانسری بجتی رہی'' ہندی یا پنجابی میں نہیں بلکہ اردو میں اشاعت پذیر ہوئی تھی اور اسے چھاپنے کا شرف ۱۹۴۰ء کے اواخر میں لاہور کے مشہور اردو ماہنامے ''ادبِ لطیف'' کو حاصل ہوا تھا، (مگر افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان کی وفات کو یا تو ہم اردو والوں نے کوئی اہمیت نہ دی تھی یا انھیں یہ خبر دیر سے ملی تھی لہٰذا اردو اخبارات میں جو چند مختصر خبریں شائع بھی ہوئیں تو اس سے معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی وفات کس تاریخ کو ہوئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اردو والے اپنے اُن ادیبوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیتے ہیں جو اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کو بھی اپنا لیتے ہیں کیوں کہ سوائے پریم چند کے باقی سب ادیبوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ آج مہاشہ سدرشن کو کتنے لوگ جانتے ہیں حالاں کہ ایک زمانہ میں اردو ادب میں ان کا مقابلہ پریم چند سے کیا جاتا تھا جیسے بنگالی میں شرت چندر کا مقابلہ رابندر ناتھ ٹیگور سے کیا جاتا رہا ہے۔ اسی طرح اختر حسین رائے پوری اور ہنس راج رہبر کا بھی معاملہ ہے۔ ہنس راج رہبر کی موت تو دہلی میں واقع ہوئی تھی مگر میرے خیال میں ان کی وفات پر ایک آدھ انجمن کے علاوہ یہاں کسی انجمن یا ادارے کی جانب سے کوئی جلسہ بھی نہیں کیا گیا تھا حالاں کہ وہ بنیادی طور پر اردو کے ادیب تھے اور ان کے تین افسانوی مجموعے، پانچ ناول اور دو تنقیدی کتابیں اردو میں شائع ہو چکی ہیں اور ان کی پریم چند پر کتاب تو اردو میں پہلی تنقیدی کتاب ہے لیکن آج اس کے حوالے بھی کم دیے جاتے ہیں حالاں کہ بعد ازاں اردو میں پی ایچ۔ ڈی کرنے والوں کے لیے یہ بہت مددگار ومعاون بھی ثابت ہوئی۔ رہبر صاحب کا تو ایک طرح سے بائیکاٹ کیا گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی

Marfat.com

کہ انھیں ریڈیو اور دور درشن پر اردو والوں نے کبھی بلانے کی زحمت نہیں کی تھی جب کہ ہندی میں دور درشن والوں نے ان پر ان کی وفات سے پیشتر فلم تک بنائی تھی اور ان کی وفات پر دلّی دوردرشن سے دو تین قسطوں میں اسے ٹیلی کاسٹ بھی کیا گیا تھا اور متعدد ہندی اداروں نے ملک کے مختلف حصوں میں ان کی وفات پر تعزیتی جلسے بھی کیے تھے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے یہ ایک اہم بحث طلب مسئلہ ہے اور اس پر ہمیں ایک مذاکرہ کرانا چاہیے)

بہر حال یہی نہیں کہ ستیارتھی جی کا پہلا افسانہ اردو میں شائع ہوا تھا بلکہ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''نئے دیوتا'' بھی اردو ہی میں شائع ہوا تھا جب کہ ان کے ہندی افسانوی مجموعے ''چٹان سے پوچھ لو'' اور ''چائے کا رنگ'' اس اشاعت کے سات سال بعد ۱۹۴۹ء میں پہلی بار منظر عام پر آئے اور ہندی میں زیادہ آؤ بھگت ہونے کی وجہ سے وہ بھی ہندی کے ہو کر رہ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ''بٹوارے'' کے بعد ہندی میں ان کے آٹھ افسانوی مجموعے ''چٹان سے پوچھ لو'' (۱۹۴۹ء)، ''چائے کا رنگ'' (۱۹۴۹ء)، ''نئے دھان سے پہلے'' (۱۹۵۰ء)، ''سڑک نہیں بندوق'' (۱۹۵۰ء)، ''گھونگھٹ میں گوری جلے'' (۱۹۹۰ء)، ''مس فوک لور'' (۱۹۹۴ء)، ''دیویندر ستیارتھی کی چنی ہوئی کہانیاں'' (۱۹۹۶ء) اور ''دس پرتی ندھی کہانیاں'' (۱۹۹۷ء) شائع ہو چکے ہیں۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ آزادی کے بعد اردو میں ان کا کوئی افسانوی مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آیا اور ان پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ حالاں کہ ستیارتھی جی کے کئی افسانوں کا بڑا چرچا رہا۔ سعادت حسن منٹو نے جب ان سے متعلق افسانہ ''ترقی پسند'' لکھا تو جواب میں انھوں نے ''نئے دیوتا'' ایسی یادگار کہانی لکھی جس کا ذکر آج بھی کیا جاتا ہے۔

ابتدا میں ستیارتھی جی نے ''من کی موج'' کے تحت کہانیاں لکھیں اور انھوں نے تکنیکی پہلوؤں پر زیادہ توجہ نہیں دی اور فطری مناظر اور لوک گیتوں کے حوالے سے کردار نگاری پر زور دیا لیکن بعد ازاں انھوں نے تکنیکی پہلوؤں کو بھی پیش نظر رکھنا شروع کر دیا اور چوں کہ وہ گیتوں کی کھوج میں ملک کے مختلف علاقوں میں گھومتے رہے تھے اور سفر کے دوران انھیں مختلف قسم کے واقعات اور کرداروں سے واسطہ پڑتا رہا تھا لہٰذا ان کی کہانیوں کا کینوس بہت وسیع ہو گیا اور ان میں واقعات اور کرداروں پر مبنی ایسی کہانیوں کی تخلیق کی گئی جو ایک

Marfat.com

مسافر، ایک سیاح اور ایک شاعر کی داستان معلوم ہوتی ہیں جن میں لوک گیتوں کی مدھرتا اور موسیقی کا جادو بسا ہوا ہے اور جن کا انداز و اسلوب بھی دیگر افسانہ نویسوں سے یکسر جدا ہے۔ ان کی کہانیاں حب الوطنی، جنسیاتی مسائل، معاشی عدم مساوات، غریبوں اور مزدوروں کی ناگفتہ بہ حالت اور ان کے استحصال ایسے مسائل پر مبنی ہیں اور ان میں سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ بنگال کا قحط، برصغیر کی تقسیم، فرقہ وارانہ فسادات اور دوسری جنگِ عظیم جیسے موضوعات کو انھوں نے بڑے دل پذیر انداز میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں اپنے زمانے کی سچائیوں کو منفرد انداز میں پیش کیا ہے اور ان میں لوک گیتوں کی مدھر موسیقی پیدا کردی ہے اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ان کہانیوں میں انھوں نے اپنے ہمعصروں کے برعکس ایک ایسا جدا اور منفرد اسلوب اپنایا تھا جو ان کی شناخت بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بعض کہانیوں جیسے ''گومتی کی پیاس''، ''یہ قربتیں یا دوریاں''، ''پیرس کا آدمی''، ''نئے دیوتا''، ''قبروں کے بیچ''، ''ستلج پھر بھرا'' نے اہلِ ادب پر گہری چھاپ چھوڑی ہے۔

ستیارتھی جی ایک اہم کہانی نویس ہونے کے علاوہ ایک اچھے ناول نویس بھی تھے اور ان کے کئی ناول جیسے ''رتھ کے پہیے، کٹھ پتلی، دودھ گاچھ، برہم پتر، کتھا کہو اُروشی، تیری قسم ستلج، منظر عام پر آئے تھے نیز انھوں نے شاعری بھی کی اور مضامین بھی لکھے۔ لیکن جو شہرت اور مقبولیت انھیں لوک گیتوں کی تلاش اور کچھ یادگار کہانیوں کی وجہ سے نصیب ہوئی ہے وہ دیگر اصناف میں حاصل نہیں ہوئی اور انھوں نے ان کی بدولت دنیائے ادب میں ایک ایسا منفرد مقام حاصل کرلیا ہے جو بہت کم تخلیق کاروں کو نصیب ہوا ہے۔

□□

Marfat.com

بیگم ممتاز مرزا

مشاعروں کی تہذیب میں خواتین کا کلام پڑھنا کسی زمانے میں معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مشاعروں کی اس روایت کی وجہ سماجی و مذہبی پابندیاں تھیں جو تقسیمِ وطن سے قبل ہندوستانی سماج پر مسلط تھیں۔ ہندو، مسلم خواتین پردے کی پابندی کرتی تھیں اور مشاعرہ گاہ میں خواتین کے لیے الگ بیٹھنے کا انتظام کیا جاتا تھا، لیکن آزادیِ وطن نے ان تمام روایتوں کو ہوا میں تحلیل کردیا۔ نئے سماجی ڈھانچے میں خواتین مردوں کے شانہ بشانہ نظر آنے لگیں۔ اردو مشاعروں کی روایت بھی اس نئے نظام سے متاثر ہوئی اور دہلی کے لال قلعہ میں ۱۹۵۲ء میں منعقد کیا جانے والا جشن جمہوریت کا مشاعرہ وہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں ایک شاعرہ نے دیوانِ عام کے اسٹیج پر کھڑے ہوکر اپنی غزل سنائی۔ یہ شاعرہ تھیں بنگلور کی سیدہ اختر۔ اس روایت کے ٹوٹنے کے بعد ایک اور شاعرہ دلّی کے مشاعروں میں ابھری جو آنجہانی کنور مہندر سنگھ بیدی کی دین تھی۔ اور جن کی شاعری کے بارے میں دبی زبان سے شکوک وشبہات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ ۵۸۔۱۹۵۷ء کے قریب دلّی کے مشاعروں میں ایک جینوین شاعرہ ابھری جس کو آپ اور ہم بیگم ممتاز مرزا کے نام سے جانتے ہیں۔ دلّی میں ممتاز مرزا اور رام کشن مضطر دو ایسی شخصیتیں تھیں جو فارسی زبان وادب پر دسترس رکھتی تھیں اور فارسی، اہلِ زبان کی طرح بولتی تھیں۔

اردو زبان کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کی تعمیر کرنے والوں میں ایسے لوگوں کا بھی ہاتھ ہے جو صرف ادیب وشاعر ہی نہ تھے بلکہ حکیم قوم بھی تھے اور انھوں نے حب الوطنی کو اپنا شعار بنالیا تھا، ایسے ممتاز ترین لوگوں میں مولانا الطاف حسین حالی کا شمار ہوتا ہے۔ انھوں

Marfat.com

نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے مرزا غالب سے استفادہ کیا اور اس تعلق کو انھوں نے ایک عظیم تخلیق کی صورت میں پیش کیا اور ''یادگارِ غالب'' جیسی تصنیف اردو کو دی جو غالب شناسی کا نقشِ اول ہے اور اس کی بنیاد کے بغیر غالبیات کی کوئی عمارت کھڑی نہیں ہوسکتی۔

مولانا الطاف حسین حالی کا وطن پانی پت تھا، انھوں نے اس سرزمین میں رہ کر علم و ادب کی آبیاری کی اور ایک ایسے خاندان کی پرورش کی جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ جو ذرّہ جس جگہ ہے وہی آفتاب ہے۔ اگر نام گنانے کی بات آئے تو خواجہ غلام الثقلین، خواجہ غلام السیدین، خواجہ احمد عباس اور اس خانوادہ کی خواتین میں صالحہ عابد حسین، ممتاز مرزا، صابرہ زیدی، ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی جیسی معروف ادیباؤں اور شاعرات کے نام شامل ہیں۔

ممتاز مرزا کا بچپن دہلی میں گزرا۔ انور دہلوی کے مطابق ان کی والدہ کا انتقال ۸ سال کی عمر میں ہوگیا تھا۔ ان کی پرورش و پرداخت ان کے بھائی انور دہلوی نے ہی کی۔ ان کا گھریلو نام کنو تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب بھلے ہی پانی پت تک پہنچتا ہو لیکن انھوں نے دہلی کی پرانی قدروں، تہذیب اور ثقافت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ ان کے کام کی ابتدا صحافت سے ہوئی۔ دیوان سنگھ مفتون کے مشہور ہفتہ وار ''ریاست'' میں وہ کام کرتی تھیں اور یہیں انھوں نے صحافت کی باریکیاں سیکھیں۔ کئی سال تک نقوش رسالہ ایڈٹ کیا، قرآن نمبر اور رسولؐ نمبر پر کام کیا۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ اخلاق مرزا سے ان کی شادی ۱۹۴۶ء میں ہوئی تھی جو ایران ایمبیسی میں کام کرتے تھے۔ اس حوالہ سے وہ فارسی بالخصوص جدید فارسی پر کامل قدرت رکھتی تھیں اور ایران کلچرل ہاؤس میں انھوں نے نہ جانے کتنے طالب علموں کو فارسی پڑھائی ہوگی اور فارسی لب ولہجہ سکھایا ہوگا۔ میں خود ان کی شاگرد رہی ہوں۔ میں جب ساتویں کلاس میں پڑھتی تھی تو فارسی میرا ایک مضمون تھا۔ والد صاحب مجھے دریا گنج (انصاری روڈ) پر واقع ایران کلچرل ہاؤس لے گئے کہ یہاں داخلہ لے لو اور فارسی اچھی طرح سیکھ لو۔ وہاں خاتون، مجسم تہذیب ملیں، والد صاحب سے بہت تپاک سے ملیں اور ہمارا داخلہ ہوگیا۔ والد صاحب مرزا صاحب کے دوستوں میں تھے اور ممتاز آپا

Marfat.com

ان سے اچھی طرح واقف تھیں۔ اس زمانے میں سفارت کار کی بیگم فارسی پڑھاتی تھیں لیکن جب وہ کسی وجہ سے چھٹی پر ہوتیں تو کلاس بیگم ممتاز مرزا لیتیں۔ اس نسبت سے وہ مجھے اپنا شاگرد کہتی تھیں اور جب مشاعرہ کے اسٹیج پر یہ جملہ ادا کرتیں تو بعض شاعر گردن اٹھا کر دیکھتے اور سمجھتے کہ وہ میری شاعری کی استاد ہیں۔ بہت محبت کرتی تھیں، جب میرا مجموعۂ کلام بے نام شجر کا اجرا ہوا تو پھولی نہیں سمارہی تھیں۔ کتاب پر لکھا" نور جہاں کے لیے صمیم ترین دعاؤں اور محبت کے ساتھ۔ گزشتہ تیس سالہ یادوں کے ہمراہ"۔ ممتاز مرزا۔ بے شمار مشاعروں میں ساتھ رہا۔ جموں کے آخری مشاعرے میں بھی مجھے جانا تھا، مگر ان کا فون خراب تھا اور رابطہ قائم نہ ہونے کی صورت میں میں نے جانا ملتوی کر دیا تھا۔ ورنہ...

ان کی آواز میں غضب کا جادو تھا، جو ان کی رنگا رنگ شخصیت کی غمازی کرتا تھا۔ ان کی اس خصوصیت کا آل انڈیا ریڈیو نے خوب خوب استعمال کیا۔ وہ ریڈیو کے ڈراموں کی جان بن گئی تھیں۔ اردو سروس اور اردو مجلس سے انھیں خصوصی تعلق تھا۔ انھوں نے مدتوں اردو مجلس کے سامعین کے خطوط کے جواب اس انداز سے دیے کہ ہر سننے والا انھیں اپنا محسوس کرتا تھا۔ وہ ریڈیو پروگراموں کی اناؤنسر بھی تھیں اور کبھی کبھی اسکرپٹ بھی لکھتی تھیں۔

ان کی شخصیت کے جوہر اس وقت کھلے جب انھوں نے ۱۹۵۸ء میں پہلی بار ایکسٹرنل سروسز ڈویژن کے ایک مشاعرے میں اپنا کلام پڑھا۔ فارسی کی شیرینی، اردو محاورہ اور دلّی کی ٹکسالی زبان اور شین قاف سے درست بیان اور سونے پر سہاگہ ان کا دل گداز شاعرانہ ترنم۔ انھوں نے مشاعرہ لوٹ لیا اور اس دن کے بعد دہلی کا کوئی ایسا اہم مشاعرہ نہ تھا جس میں ممتاز مرزا اپنا کلام نہ پڑھتی ہوں۔ انھیں اپنے وقت کے مشہور دہلی کلاتھ ملز کے مشاعرے کی انتظامی کمیٹی کا ممبر بنا دیا گیا تھا۔ اس حوالہ سے انھوں نے مشاعرے کی ترتیب و تنظیم اور شعرا کے انتخاب میں نمایاں رول ادا کیا۔ وہ قصباتی مشاعروں سے دور بھاگتی تھیں اور ہمیشہ ایسے ہی مشاعروں میں جانا پسند کرتی تھیں جو صحیح معنوں میں 'آل انڈیا'، 'انڈو پاک' یا انٹرنیشنل ہوں۔

ایک زمانے میں وزارت صحت نے فیملی پلاننگ کے فروغ کے لیے مشاعرے

Marfat.com

کرنے شروع کیے تھے، ممتاز مرزا اس کمیٹی کی فعال رکن تھیں۔ دہلی اور سری نگر میں یہ مشاعرے اپنے خصوصی مقاصد کے ساتھ، ادب کی خدمت کے لیے بھی بہت مقبول ہوئے۔ پھر گنپتی اتسو کے موقع پر سریش کلماڈی کی قیادت میں پونے میں آل انڈیا مشاعروں کی طرح ڈالی گئی جس کی کنوینر تاحیات ممتاز مرزا رہیں۔ اہلِ ادب جانتے ہیں کہ جن مشاعروں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ہر اعتبار سے کامیاب و معیاری مشاعرے تھے۔ کیوں کہ کنوینر کی شخصیت کا پرتو ان مشاعروں میں شامل تھا۔ بات مشاعروں کی چلی ہے تو دل گرفتگی کے باوجود یہ کہنا پڑے گا کہ اپنی خرابی صحت کے باوجود وہ گورنمنٹ جموں وکشمیر کے مشاعرہ میں جموں گئیں۔ کامیابی سے مشاعرہ پڑھا اور صبح ریلوے اسٹیشن پر گاڑی تک پہنچنے سے قبل ہی حرکتِ قلب بند ہونے سے ان کا انتقال ہوگیا۔ (کاش میں ان کے ہمراہ ہوتی)۔ گویا آخری وقت تک وہ شعر گوئی میں مصروف رہیں۔ دراصل وہ سراپا شاعری تھیں۔

ان میں ایک ہندوستانی خاتون کے تمام اوصاف موجود تھے۔ وہ بہترین لباس نہایت سادگی اور وقار کے ساتھ پہنتی تھیں۔ سفید رنگ ان کا مرغوب ترین رنگ تھا۔ کھانا بہترین بناتی تھیں اور دوستوں کو اپنے گھر بلا کر ان کی ضیافت کرتی تھیں۔ ان کا مکان نہایت صاف ستھرا اور قرینے سے سجا ہوا ہوتا تھا۔ ایک کمرہ ان کی لائبریری کے لیے مخصوص تھا جس میں فارسی اور اردو کی نایاب کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ سنا ہے کہ ان کی تمام کتابیں حالی لائبریری، پانی پت کو نذر کردی گئی ہیں۔

انھوں نے ایک دردمند دل پایا تھا اور بغیر جتائے وہ ضرورت مندوں کی مدد کرتی تھیں۔ شعر گوئی میں انھوں نے اپنے وقت کے استاد اور ماہر فن میکش اکبرآبادی سے استفادہ کیا تھا۔ ان کے شعری مجموعے ''یادوں کے سائے'' میں میکش صاحب کی وقیع رائے موجود ہے۔ اسی طرح ان کی فارسی دانی سے یوسف حسین خاں بہت متاثر تھے۔ انھوں نے ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ نادانستہ طور پر ممتاز مرزا کے یہاں فرانسیسی اور فارسی زبانوں کا ارتباط ہے۔ اور یہ بات یوسف حسین خاں نے ممتاز مرزا کی کتاب ''یادوں کے سائے'' کے اجرا کے وقت اپنی تقریر میں کہی تھی۔

Marfat.com

ممتاز مرزا لاولد تھیں۔ انھوں نے اپنی بہن مختار عبداللہ کی بچی کو گود لے لیا تھا۔ ان کا آبائی مکان دریا گنج میں تھا، جس کی نشاندہی میرے والد نے کی تھی۔ اس کے بعد وہ چرخے والان میں آباد ہوگئیں اور آخری لمحوں میں وہ نظام الدین ویسٹ کے اپنے مکان سے ابدی رہائش گاہ منتقل ہوئیں۔

ممتاز مرزا کی شخصیت و شاعری اور مقبولیت کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومتِ ہند نے انھیں پدم شری کے خطاب سے نوازا تھا۔ یہ خطاب پانے والی وہ اردو کی پہلی شاعرہ تھیں، تاحال یہ اعزاز کسی اور شاعرہ کو نہیں ملا ہے۔ ان کی رنگا رنگ شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں۔ ان کے پاس ایک مینا تھی، جسے انھوں نے خوب بولنا سکھایا تھا۔ وہ مینا ان کی باتوں کا جواب دیتی تھی اور ان سے لڑتی بھی تھی۔ ایک بار ٹیلی ویژن پر بھی اس کا پروگرام دکھایا گیا تھا، لیکن وہ ممتاز آپا کی زندگی میں ہی اللہ کو پیاری ہوگئی تھی۔ ورنہ سیتارام کیسری کے کتّے کی طرح وہ بھی ان کا جنازہ اٹھنے کے ساتھ ہی دم توڑ دیتی۔

ممتاز مرزا اردو شاعری کی بلبل بھی تھیں اور مینا بھی۔ ہم انھیں ان شعروں، ان کی اخلاقیات، محبت و مروت اور دہلوی تہذیب کے حوالے سے ہی یاد رکھ سکتے ہیں۔

□□

ذخیرہ محمد وقار انجم لاہور

Marfat.com

ڈاکٹر یونس جعفری

علامہ راشد الخیری

دریا گنج میں درگاہ صابر بخش سے متصل جو مسجد ہے اس کے بالکل روبرو یعنی برخ قبلہ سڑک کے اس پار سبزی کی منڈی ہے۔ جس کا ایک راستہ شمالی جانب کوچہ چیلان میں نکلتا ہے۔ جہاں یہ راستہ گلی کوچہ چیلان سے جا ملتا ہے یہیں کونے پر ایک دو منزلہ مسجد ہے۔ منڈی کے اس راستے سے نکل کر جب آپ گلی کوچہ چیلان میں آئیں گے تو سامنے دروازے پر آپ کو ایک نیم دائرہ محراب نظر آئے گی۔ یہی علامہ راشد الخیری کا مکان تھا۔ اگرچہ اس وقت یہ مکان سہ منزلہ ہے مگر ۱۹۵۰ء تک ایک منزلہ ہی تھا اور اس پر وہ آرائش و زیبائش نہ تھی جو آج نظر آتی ہے۔

منڈی کے احاطے میں جو مسجد ہے اس کی پشت پر ایک دو مکان چھوڑ کر ایک گلی ہے جس میں داخل ہوتے ہی بائیں جانب جو پہلا مکان ہے وہ رسائل بنات اور خاتونِ مشرق کا دفتر تھا۔ اس میں شک نہیں کہ سرسید نے مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ دینے کے لیے نمایاں کام انجام دیا، مگر بنات اور خاتونِ مشرق جیسے جرائد سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ راشد الخیری بھی تعلیمِ نسواں سے بے خبر نہ تھے۔ انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اسکول بھی جاری کیا تھا، جہاں میری بڑی بہن بھی پڑھنے گئی تھیں۔ مگر مالی مشکلات کے بنا پر یہ اسکول زیادہ دن نہ چل سکا۔

اس گھر میں، میں اپنی دادی کے ساتھ گیا۔ اس وقت میری عمر اتنی کم تھی کہ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ جنازہ کیا ہوتا ہے۔ بس اتنا یاد ہے کہ اس مکان کے اندرونی دالان کے بیچ کے در میں ایک چارپائی رکھی تھی اور اس پر ایک سبز چادر بچھی ہوئی تھی۔ شاید میت رکھے کافی

Marfat.com

دیر ہو چکی تھی اور عورتیں نوحہ و بین کر کے تھک چکی تھیں اسی لیے وہ دنیاداری کی باتوں میں لگ گئی تھیں اور ہر عمر رسیدہ ماں کی آنکھیں کسی ایسی دوشیزہ کو تلاش کر رہی تھیں جو اس کے جوان بیٹے کی شریک حیات بن سکے۔

اتنے میں صدا بلند ہوئی کہ پردہ کرلو۔ چند مرد آئے اور خاموشی سے وہ چارپائی اٹھا کر لے گئے۔ جس وقت چارپائی جارہی تھی اس وقت بھی کوئی نوحہ یا بین نہیں ہوا۔

ان سے ہماری کیا رشتہ داری ہوتی تھی یہ مجھے معلوم نہیں۔ وہ خود کو خیری کیوں لکھتے تھے یہ بھی معلوم نہیں۔ شاید حضرت شاہ ابوالخیر کی نسل سے ہوں۔ البتہ ان کی اہلیہ میری پھوپھی کی نند تھیں۔ میری پھوپھی کا اصل نام تو حبیب بیگم تھا مگر جب کپتان حبیب الرحمٰن سے ان کی شادی ہوئی تو وہ سکندر بیگم کے لقب سے مشہور ہوئیں۔

علامہ راشدالخیری کی کتاب ''نانی عشو'' ان کے زمانۂ حیات اور مرنے کے بعد ۱۹۴۷ء تک افرادِ خاندان بالخصوص خواتین میں بہت زیادہ مقبول تھی۔ جن خواتین نے انھیں دیکھا تھا اور ان کی شگفتہ مزاجی سے واقف تھیں وہ اس کتاب کے ہر جملے پر قہقہے لگایا کرتی تھیں۔ لیکن آج جب اس کے نفس مضمون کا تجزیہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نفسیاتی علاج، جادو ٹونے، جھاڑ پھونک کی مذمت کی ہے اور یہ کہنا چاہا ہے کہ ہندوستانیوں بالخصوص دہلی کے مسلمانوں کے یہ فرسودہ خیالات ہیں۔ صحیح علاج کا طریقہ وہی ہے جو مغرب سے ہمارے پاس آیا ہے۔

علامہ راشدالخیری کو مصورِ غم کہا جاتا ہے۔ موصوف نے بہادر شاہ کے کسی فرزند کے مرنے پر ان کی جس طرح آہ و زاری کی کیفیت بیان کی ہے اس کے بعد ہی انھیں مصورِ غم کے لقب سے نوازا گیا۔ ان کے اس مضمون کے پڑھنے سے خاندان مغلیہ کے ساتھ قاری کو ہمدردی تو ہوتی ہے مگر کہیں ایسا کوئی شائبہ تک پیدا نہیں ہوتا کہ انھوں نے غیر ملکی حکومت کے خلاف ایک لفظ بھی کہا ہو۔

نانی عشو اور بہادر شاہ کی رودادِ غم کے پس منظر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی ڈپٹی نذیر احمد کی طرح نئی اور پرانی تہذیب کے درمیان ہم آہنگی چاہتے تھے۔ یعنی ایک طرف تو وہ اپنی کوتاہیوں پر غور کریں اور دوسری طرف نئی حکومت سے جو مسلمانوں میں غم و غصہ تھا اور

Marfat.com

اس سے انھیں نفرت تھی اس کو دور کر کے وہ اس کی خوبیوں پر نظر ڈالیں۔

علامہ راشد الخیری کو سیر و تفریح کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ وہ سال میں ایک دو بار لاری کرائے پر لے لیا کرتے تھے اور خاندان کی عورتوں اور ان کے بچوں کو اس پر سوار کرا کے کبھی مقبرہ ہمایوں، کبھی مقبرہ صفدر جنگ اور کبھی مہرولی کی طرف نکل جاتے۔ اگرچہ خواتین ان مقابر کی چہار دیواری میں آزادی سے گھوم پھر تو سکتی تھیں مگر کسی کی کیا مجال کہ وہ کیاری میں کوئی پھول یا درخت پر سے کوئی پھل توڑ لے۔ کیوں کہ وہ ہر شخص پر نظر رکھتے۔ اگر کوئی بچہ بھی پھول یا پھل توڑنے کی جرأت کرتا تو وہ اسے کبھی پیار سے اور کبھی درشت لہجے میں منع کر دیتے۔

موصوف آموں اور خربوزوں کے بہت شوقین تھے۔ اگرچہ دہلی کے شرفا راستے میں چلتے ہوئے کسی چیز کے کھانے کو عیب سمجھتے تھے اور اب بھی سمجھتے ہیں مگر علامہ راشد الخیری ان آداب سے بے نیاز تھے۔ میرے والد محترم نے جب انھیں راستہ چلتے خربوزہ کھاتے دیکھا تو انھیں سخت حیرت ہوئی۔ چنانچہ جب بھی کبھی خاندان میں علامہ راشد الخیری کا ذکر آجاتا تو وہ ان کی اس عادت کا بہت مذاق اڑاتے تھے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے کہ علامہ راشد الخیری کے دو لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔ بڑے لڑکے کا نام انھوں نے رازق الخیری رکھا تھا اور چھوٹے کا صادق الخیری۔ ان کی لڑکی کا نام اس وقت ذہن میں نہیں ہے۔ ملا واحدی نے جس وقت ماہنامہ رسالہ ''ادیب'' شائع کیا تھا تو اس کے پہلے شمارہ میں سرورق پر جو تصویر شائع کی تھی وہ صادق الخیری کی تھی، جس میں ان کے نام کے ساتھ بی۔ اے اس طرح لکھا گیا تھا گویا یہ ڈگری ان کے نام کا حصہ ہو۔ اگرچہ صادق الخیری زیادہ ملنسار آدمی نہ تھے مگر خوش مزاج تھے۔ میری بڑی بہن عصمت خاتون نے جو اس وقت کراچی میں گلشنِ اقبال نامی کالونی میں مقیم ہیں بتایا تھا کہ پاکستان پہنچنے کے بعد وہ بہت کم گو ہو گئے تھے۔ رشتہ داروں سے ملنا جلنا بھی ترک کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ اپنی بیگم کے ساتھ کسی تقریب میں جانے کے لیے تیار تھے، ان کی بیگم نے نائیلون کی ساڑی پہن رکھی تھی، کسی کام سے باورچی خانے میں گئیں۔ گیس کو جو انھوں نے دیا سلائی دکھائی تو اس کے شعلے نے نائیلون کے کپڑے کو پکڑ لیا، جس کے باعث ان کا سارا بدن

Marfat.com

جھلس گیا۔ انھوں نے ان پر فوراً ہی کمبل ڈال دیا اور اسی میں لپیٹ کر اسپتال لے گئے مگر وہاں پہنچتے پہنچتے وہ دم توڑ چکی تھیں چنانچہ انھوں نے انھیں اسی حالت میں دفن کر دیا اور تدفین کے بعد ہی رشتہ داروں کو ان کے مرنے کی خبر دی۔

رازق الخیری نے کراچی میں مکان بنایا تھا، جب مکمل ہو گیا تو اس کے افتتاح کی تقریب بھی انھوں نے منعقد کی تھی۔ جس کا دعوت نامہ انھوں نے میری پھوپھی سکندر بیگم کو بھی بھیجا تھا۔

اب یاد نہیں کہ صادق الخیری کے یا رازق الخیری کے ایک لڑکے حکومت پاکستان کی طرف سے سعودی عرب کے سفیر ہو گئے تھے۔

دہلی میں جامع مسجد کے نزدیک اردو بازار میں جہاں اس وقت کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہے اس کے مقابل گلی کے نکڑ پر جو دوکان ہے اس میں علامہ راشد الخیری کی کتابیں سنہ ۱۹۴۷ء تک فروخت ہوئی تھیں۔ جنھیں ان کے ایک رشتہ دار احسان الرحمٰن شائع و فروخت کرتے تھے۔

علامہ راشد الخیری کا مزار دہلی کے اس قبرستان میں ہے جو دہلی دروازے کے باہر واقع ہے۔ قبرستان کے دفتر کے نزدیک نیم کے پیڑ کے نیچے ہے۔ جس پر کبھی کتبہ لگا ہوا تھا۔ مزار چبوترے کی شکل میں موجود ہے مگر کتبہ مفقود۔

ان کے مرنے کے بعد ان کے بارے میں کوئی کتابچہ بھی بروز چہلم شائع ہوا تھا، جس میں ان کے سوانح حیات و کارنامے درج تھے۔

اس وقت دہلی میں بیگم راشد الخیری کے دو بھتیجے ہیں۔ بڑے کا نام انعام الرحمٰن ہے اور چھوٹے کا اکرام الرحمٰن۔

انعام الرحمٰن حکومت ہند کی وزارتِ تعلیم میں اعلیٰ افسر تھے۔ اگرچہ ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں مگر اب بھی ثقافتی زندگی میں سرگرم رہتے ہیں۔

اکرام الرحمٰن صاحب ذاکر حسین کالج میں لائبریرین تھے وہ بھی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں اور فراغت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں اینگلو عربک کالج کی تباہی کے بعد جب یہ کالج دہلی کالج

Marfat.com

کے نام سے پھر زندہ ہوا تو ۱۹۴۸ء میں اس کالج کے ہال میں یومِ غالب کی مناسبت سے مشاعرہ ہوا تھا۔ ہال کی مشرقی دیوار پر تین روغنی تصاویر نصب تھیں جن میں ایک سرسید کی تھی، دوسری محمد حسین آزاد کی اور تیسری علامہ راشد الخیری کی۔

میرزا محمود بیگ مرحوم نے یہ تصاویر اس جگہ سے منتقل کرا کے اس عمارت کے کمرے میں نصب کرادی تھیں جو نواب شجاع الدین نے انگریز پرنسپل واکر کی سکونت کے لیے بنوایا تھا، جس میں وہ کبھی نہ رہا۔ پھر اس جگہ کا نام گرلز کامن روم پڑ گیا۔ چند سال قبل جب وہاں اینگلو عربک نرسری اسکول قائم ہوا اور اس کمرے کی مرمت کی گئی تو وہ تصاویر وہاں سے اتار دی گئیں۔ دو تین سال قبل میں نے الیاس نامی اینگلو عربک اسکول کے ملازم سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے نہایت سادگی سے جواب دیا کہ انھیں تو کباڑیہ لے گیا۔ کوچہ چیلان، جس میں کبھی بادشاہوں کے مرید رہا کرتے تھے چیلوں کی بستی رہی ہو یا نہیں رہی ہو اس سے سروقت بحث نہیں، لیکن یہاں علامہ راشد الخیری کے گھر سے پھاٹک مفتی والان تک شرفا ہی آباد تھے۔ ان کے گھر سے چند قدم آگے ملا واحدی کا مکان تھا۔ جہاں سے وہ رسالہ 'المشائخ' اور 'ادیب' شائع کرتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی ان کے یارِ غار تھے اور وہیں وہ ان سے ملنے کے لیے آیا کرتے تھے۔

اس سے آگے چند قدم کے فاصلے پر ہی آصف علی بیرسٹر کا مکان تھا، جو اپنی سیاسی سرگرمیوں کے باعث بعد میں پشیمان ہوئے۔ آصف علی کے مکان کے بعد گلی کے دوسری طرف اشرف صبوحی کا مکان تھا جو انھوں نے ۱۹۴۲ء میں تعمیر کرایا تھا اور اس کا نام گوشۂ عافیت رکھا تھا۔

اس سے ذرا آگے کپتان حبیب الرحمٰن کا مکان تھا۔ ان کے مکان کی مناسبت سے گلی کپتان والی کہلاتی تھی۔ اب اس کا نام گلی کیپٹن ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کپتان صاحب کے گہرے دوست تھے۔ ۱۹۴۶ء میں انھوں نے اسی مکان میں کہا تھا کہ اول تو پاکستان کے وجود کا تصور مہمل ہے اور بفرضِ محال وہ وجود میں آ بھی گیا تو ہم یہاں مسلمانوں کے حقوق کی پاسبانی کریں گے۔ اس وقت آصف علی بیرسٹر بھی موجود تھے اور انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی بات سے اتفاق کیا تھا۔ اگرچہ اسی کوچہ چیلان میں مولانا احمد سعید کا بھی

Marfat.com

مکان تھا مگر ۱۹۴۷ء تک ان کا شمار ادبا، شعرا اور واعظین میں نہیں ہوتا تھا۔ کپتان حبیب الرحمٰن کے مکان کی پشت پر پروفیسر سعید رہا کرتے تھے۔ ان کے مکان کے روبرو برکت اللہ وکیل کا مکان تھا برکت اللہ وکیل کے مکان سے متصل محمد علی جج کا مکان تھا۔ اس کے برابر ہی سرسید کا مکان تھا۔ اور اس سے آگے پھاٹک مفتی والان ہے، جس میں فیض الٰہی باورچی کا مکان تھا۔ اب وہاں اس کے بیٹے اور پوتے رہتے ہیں۔ فیض الٰہی صرف شرفا کے گھر پر جا کر کھانا پکاتا تھا۔ جب کسی کے گھر موت ہو جاتی تو وہ کھانا پکانے کی اجرت نہیں لیتا تھا البتہ شادی بیاہ کے موقع پر وہ منہ مانگی مزدوری لیا کرتا تھا۔

حضرات یہ باقاعدہ مضمون نہیں بلکہ چند یادداشتیں تھیں جو آپ کے سامنے پیش کر دی گئیں شاید کسی کے کبھی کام آئیں۔

Marfat.com